از

میکسم گورکی

مترجمہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ڈی لٹ (پیرس)

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۰ء

حکیم ذکی احمد خاں نے "جیّد پریس" دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

# مقدّمہ

انیسویں صدی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا جب میکسم گورکی کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

"یہ وہ دن تھے جب انقلاب فرانس کے پیدا کیے ہوئے تمدنی اقتدار کا اثر مٹ رہا تھا اور ایک نیا دور نئے مطالبات کے ساتھ وجود میں آرہا تھا۔ انسانیت پروری اور لبرلزم پر کائی جم رہی تھی۔ مشینوں کی ہماہمی، فوجوں کی گہما گہمی، سامراجیوں کی کٹا چھنی ——— دنیا کا یہ منظر تھا۔ سماجی نظام تو بدل ہی رہا تھا، اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رہنے سہنے اور سوچ بچار کی نہج بھی کچھ سے کچھ ہو رہی تھی۔

مگر روس ابھی اس منزل پر تھا جہاں فرانس اپنے انقلاب سے پہلے تھا۔ زار اور اس کے حالی موالی اتنے عرصے سے ملک کی رگِ جان پر جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے کہ بظاہر لہو کی بوند بھی اس میں باقی نہ تھی۔ یورپ ——— خصوصاً فرانس ——— کی ترقی پسند تحریکوں نے روس میں بیداری کا جو صور پھونکا تھا اب اس کی صدائے بازگشت مدھم پڑ گئی تھی۔ کہاں روسی ادب کے مسیحا "پشکن" کا "ترانۂ آزادی" اور کہاں چیخوف کی دُنیا۔

اُنیسویں صدی کے آخری دَور میں یورپ اور روس کی

ادبی محفل پر بیزاری اور اُداسی کی سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی۔
ادیب نئی طاقتوں اور نئی تبدیلیوں کو دیکھ تو رہا تھا مگر انھیں
سمجھنے سے قاصر تھا۔ فرانس کے ادیب تُلے ہوئے تھے کہ
سماج کی تلچھٹ کو کھنگالا جائے، پیا جائے اور پلایا جائے۔
ان میں سے بہتیرے تنزّل پسندی کا بے سُرا راگ الاپ
رہے تھے۔ اِدھر انگریزی ادب کا وکٹورین عہد ختم ہو رہا تھا۔
ٹامس ہارڈی کے ناولوں کی مغمومیت ——— ساتھ ہی ساتھ
اخلاقی جرأت ایک نئے راستے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اُدھر
اوسکر وائیلڈ جمال پرستی کا جادو جگاتے نکل رہا تھا۔ یہ دو
رُجحان ——— یعنی زمانۂ تغیر کی پیچیدگیوں کی وجہ سے مایوس
ہو جانا یا ان سے منہ چرانا ——— ہر طرف عام ہو گئے تھے۔
یہی حال رُوس کا تھا۔ مشینوں اور کارخانوں کا لگّا
یہاں بھی لگ چکا تھا اور ان کی وجہ سے پہلے لوگوں کی
معاشی اور پھر معاشرتی زندگی تیزی سے بدلنے لگی تھی۔
مگر زار شاہی اپنی ساری لعنتوں کے ساتھ اب بھی مسلّط تھی۔
بڑھتے ہوئے اقتصادی نظام اور رجعت پرور سیاسی نظام میں
بنیادی تضاد تھا۔ اس کی وجہ سے ملک کی زندگی کی رَوِیں
کوئی یک جہتی نہ تھی۔ اس انتشار کا اثر ادیبوں نے بھی مختلف
طریقوں سے قبول کیا۔ اس دَور کے سب سے بڑے ادیب
چیخوف کو دیکھو تو وہ انسانوں کی بے حسی، بے دردی اور بے عقلی پر
نالاں ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ماحول بے رنگ ہے جس میں

ایک سے لوگ ایک سی زندگی بسر کرتے مرجاتے ہیں۔ نہ ان میں تصوّر ہی نہ تخیّل، نہ ان کی حیات کا کوئی مقصد ہی۔ نطق انسانی کا سب سے با معنی لفظ 'کیوں؟' ان کی زبان پر کبھی آتا بھی ہی تو اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ چیخوف کا دردمند دل ان دو ٹنگے جانوروں کو سمجھنے سے قاصر ہی۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی دوُر رس نگاہ اس طوفان تک جا پہنچتی ہی جو اُفق پر سمٹ رہا ہی اور آن کی آن میں ظلم و جہل کے اس خراب آباد کو مٹا دے گا۔ اپنے ڈراموں میں کہیں کہیں وہ یہ توقع ظاہر بھی کرتا ہی: "وہ زمانہ آرہا ہی، ہم سب میں کوئی عظیم الشان قوت کروٹ بدل رہی ہی۔ ایک زبردست طوفان اُٹھ رہا ہی اور تیزی سے ہمارے قریب آرہا ہی۔ دم کے دم میں وہ ہمارے سماج سے کاہلی، بے پروائی، بے کاری اور بے لُطفی کو اُڑا لے جائے گا۔"

(Three Sisters)

مختصراً روس کی یہ سماجی اور ادبی کیفیت تھی جب میکسم گورکی نے ۱۸۹۲ء میں اپنا پہلا افسانہ شائع کیا۔ اس کا اصل نام 'الکسی پیشکوف' تھا اور وہ ۳۰ر مارچ ۱۸۶۸ء کو 'نزنی نووا گورد' میں پیدا ہوا تھا۔

---

گورکی نے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کی داستان خود ہی لکھی ہی اور حق یہ ہی کہ خوب لکھی ہی۔

آپ بیتی کی یہ تینوں جلدیں، روزنامچے کے چند اوراق اور
طالسطائی کی یاد داشت ـــــــــ یہ گورکی کے شاہکار ہیں۔
پیش نظر کتاب ننھے گورکی کو زندگی کی چوکھٹ پر لاکر کھڑی
کردیتی ہے۔ اس کا باپ ایامِ طفلی میں ہی مرچکا تھا، ماں
دوسری شادی کرلیتی ہے اور گورکی کی پرورش نانا نانی کے
سپرد ہوتی ہے۔ ابھی وہ نو دس سال کا ہوگا کہ ماں گھر لوٹ کر
مرجاتی ہے، نانا کنگال ہوجاتا ہے اور گورکی سے کہتا ہے:
"اب تمھارے لیے میرے گھر میں جگہ نہیں ہے، جاؤ دنیا میں
اپنا راستہ آپ بناؤ"۔ یہاں گورکی کی کتاب زندگی کا پہلا باب
ختم ہوجاتا ہے۔

یہ ایک نگھرے یتیم کی رام کہانی ہے اور ادب عالم میں
ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یہاں آپ مبلّغ گورکی نہیں،
آرٹسٹ گورکی کو اپنے اوج کمال پر دیکھیں گے۔ یہ اس کے
مشاہدے کا کمال ہے۔ من کے سنسار میں جو کچھ ہوتا ہے
گورکی اسے سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ نہ تو اسے دور کی
چیزوں کو دیکھنے کا ڈھب آتا تھا، نہ اپنے کردار کے
دل و دماغ کو سمجھنے کا وتیرہ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی
زندگی گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزری اور اسی لیے وہ باہر کی
دنیا سے باخبر مگر اندر کی ہونی انہونی سے بے خبر ہو۔ جو بھی ہو
آس پاس کی چیزوں اور آدمیوں کو وہ جتنا جانتا پہچانتا ہے
اور کوئی نہیں۔ وہ جس آدمی سے ملتا تھا ـــــــــ اور یاد رہے

کہ اس کے واقف کار ہزاروں کی تعداد میں سارے روس میں پھیلے ہوئے تھے ـــــــ اس کے ہر اشارے ہر کنائے اور ہر جملے کو ذہن نشین کرلیتا تھا۔ مشاہدہ اور حافظہ ـــــ یہاں گورکی کا کوئی ہم پلّہ نہیں۔ اس کی مثال آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔ کہتا ہے: "میرا بچپن گویا شہد کا چھتا تھا۔ جس طرح شہد کی مکھیاں وہاں شہد لے لے کر آتی ہیں، سیدھے سادے اور گمنام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لے لے کر میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کر گئے۔" حیرت اس امر پر ہے کہ تیس پینتیس سال بعد زارشاہی کے دست بُرد سے نکل کر اپنے وطن سے کالے کوسوں دور جب وہ اطالیہ کے جزیرۂ کاپری میں یہ آپ بیتی لکھنے بیٹھا تو اسے بچپن کی سب باتیں جوں کی توں یاد رہیں۔ اوائل عمر کے ہر ساتھی کی جیتی جاگتی مورت اس کے سامنے آگئی۔ اس کی کہانیاں اور گیت کانوں میں گونجنے لگے۔ اس کی چال ڈھال تک اسے نہ بھولی۔

گورکی کی اس تصنیف کو پڑھ چکنے کے بعد اگر آپ اس کا مقابلہ اس کے ناولوں سے کریں گے تو میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ اس کا اصل میدان سوانح نگاری ہے۔ اس فن کو اس نے ایک نئے سانچے میں ڈھالا اور آندرے موروا یا ایمل لُڈوِگ کا سلسلہ اس سے آکر ملتا ہے۔ فرد کو وہ پس منظر میں رکھتا ہے۔ اس کی زیادہ توجہ ماحول کی

تصویر کشی پر صرف ہوتی ہے۔ تخیل نفسی سے اسے رغبت نہیں، وہ تو یہی دیکھتا ہے کہ انسان کا باطن کس روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ داخلی زندگی سے اس دامن کشی کی وجہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ علاوہ بریں اس کا فلسفۂ زندگی بھی اسی کی تلقین کرتا تھا۔ انسان کو وہ آئے دن کی زندگی سے پہچانتا ہے، بڑے بڑے واقعات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے تجسس کی کوئی انتہا نہیں۔ اپنی دوُربین نگاہوں سے وہ ہر باریک سے باریک نکتے کو گھوُرا کرتا ہے اور طالسطائی جیسے استاد کو بھی گورکی کی یہ چھان بین سخت ناگوار ہے۔ اسے وہ گورکی کی شک پرست طبیعت پر محمول کرتا ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ گورکی کو کسی شے پر ایمان مطلق نہیں۔ اس کی واحد کسوٹی انسان کی زندگی ہے اور اسی پر وہ سب کے قول و فعل کو پرکھتا ہے۔

لیکن گورکی اپنے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے مشہور ہوُا، اس کی تحریروں کے مذکورۂ بالا حصّے کو قبول عام میسّر نہ ہوُا۔

زندگی کے اس دوُر کو گزار چکنے کے بعد جس کے حالات آپ بیتی کی تینوں جلدوں میں قلم بند کیے ہیں، گورکی نے مصنّف کا پیشہ اختیار کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۶ - ۲۷ سال ہوگی۔ اپنی ادبی زندگی اس نے چھوٹے افسانوں سے شروع کی۔ ان کا مجموعہ شائع ہوُا ہی تھا کہ

سارے ملک میں گورکی کی دھوم مچ گئی۔ ملک ادیب سے جو پیغام سننا چاہتا تھا وہ بڑی دیر کے بعد یہاں سنائی دیا۔ یہ سچ ہے کہ پشکن اور گورکی کا درمیانی دوَر روسی ادب کا زرّین عہد تھا۔ اس میں باہر کی دُنیا کو روسی روح کا اصل جوہر تو ملتا ہے لیکن روس والے اس دُکھ بیتی سے تھک گئے تھے۔ وہ اپنے بندِ غم کو توڑنے کے لیے بیکل تھے اور ادب میں روشنی اور امید کی وہ جھلک دیکھنا چاہتے تھے جن کی پہلی کرنیں سیاسی فضا کو اُجال رہی تھیں۔ یہ سندلیسہ سب سے پہلے گورکی نے سُنایا اور ایسے نرالے انداز سے کہ سب چونک پڑے۔ دوسروں کا مطالعہ اب تک روسا، متوسط طبقہ یا کسانوں کی زندگی تک محدود تھا اور سماج کے یہ طبقے بیمار تھے۔ گورکی نے اپنے رہنے کے لیے نئی دنیا تلاش کی۔ اس کی ادبی کاوشیں آوارہ گردوں کی کردار نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں۔ روسی کی فطرت میں ایک خاص قسم کی فلسفیانہ آوارگی پسندی ہوتی ہے جس کا مقابلہ ہندستان کے کن پھٹے جوگیوں اور ان کے منتر جنتر سے نہیں ہو سکتا۔

موچی، خلاصی، نان بائی، دربان، قُلی — غرض کہ آٹھ دس سال کی مدت میں بیسیوں دھندوں کی ناکام مشق کے بعد گورکی نے آوارہ گردی کا پیشہ اختیار کیا

اور برسوں ایک سرے سے دوسرے تک روس کی خاک چھانتا پھرا - آوارہ گردوں کے فلسفۂ حیات کا اس پر گہرا اثر ہوا اور دیر تک باقی رہا - اپنے ناولوں، اسکیچوں اور افسانوں میں اس کا اظہار اس نے بڑی خوبی سے کیا ہے - آوارہ گرد کو کسی خاص مقام سے محبت نہیں ہوتی - وہ ہر قسم کی اخلاقی اور قانونی پابندی کا مخالف ہوتا ہے - مکمل آزادی اور نراجی اس کا مشرب ہے -

اسی آزاد مشرب کو گورکی نے اپنا ہیرو بنایا - جیسے جیسے اس کی سوجھ بوجھ میں وسعت آتی گئی اور سماجی مسائل کی تہ تک اس کی نگاہ پہنچتی گئی، اس کے آوارہ ہیرو کی بے راہ روی بھی کم ہوتی گئی - وہ پہلے باغی اور پھر انقلابی واشتراکی بن بیٹھا - اس کے آئینے میں گورکی کے ارتقائی شکل صاف نظر آتی ہے -

ان افسانوں کی اشاعت کے وقت گورکی کی عمر صرف تیس سال تھی - دیکھتے ہی دیکھتے اسے جو مقبولیت ملی اس کی مثال ادبی دنیا میں کہیں نہیں ملتی - یہ بڑی بات تھی کیونکہ طالسطائی ابھی زندہ تھا اور چیخوف اپنے کمال کے عروج پر تھا - گورکی مارکہ سگریٹ اور گورکی چھاپ کی دیا سلائی ہر ہاتھ میں نظر آنے لگی - اٹھائی گیرے بھلے مانسوں کو سڑک پر روک کر گورکی کا جامِ صحت پینے کے لیے دام طلب کرنے لگے! کچھ من چلے تو سرکاری افسروں کے

قتل کے لیے ریوالور خریدنے کی غرض سے گورکی کے نام پر چندہ بھی مانگنے لگے !! ۔ گورکی کا والہانہ لباس فیشن میں آگیا اور دیوان خانوں میں انقلاب پسند معشوق گلی کوچوں کی بولی ٹھولی فخریہ زبان پر لانے لگے ۔

اس شہرت کی اصل وجہ افسانوں کی ادبی خوبی سے زیادہ ان کے موضوع کی نوعیت اور مصنّف کی شخصیت تھی۔ لوگ جن بے گھروں کو در در کی خاک چھانتے دیکھتے تھے اب وہ سماجی احتجاج کے علم بردار بن کر نکلے تھے۔ اور ان کا سالار ایک عامی تھا جو للکار رہا تھا: "میں زندگی کی صدائے حق ہوں ، میں ان ٹھکرائے اور روندے ہوئے مظلوموں کی آواز ہوں جو سماج کے سب سے نچلے زینے پر پڑے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے مجھے اپنا فسانۂ غم سنانے بھیجا ہے۔"

اس طرح ادب میں تہی دست طبقہ کی ترجمانی شروع ہوئی ۔ اس کی گونج دور دور تک پہنچی اور اس ادبی انقلاب کی بنا پڑی جس کے اثرات ہم گھر باہر ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گورکی کسی 'حظ' کے لیے نہیں بلکہ ایک واضح مقصد کے لیے لکھ رہا ہے - اس اعتبار سے اس کی تحریروں میں نصیحت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ موقع بے موقع اس کے کردار اس کے خیالات کا اظہار لنبی لنبی تقریروں میں کرنے لگتے ہیں اور یہ گورکی کے

آرٹ کا بڑا عیب ہی - مگر یہی عیب عوام کے نزدیک اس کا سب سے بڑا امتیاز ہی۔انھیں نصیحتوں اورتقریروں میں اس کا فلسفۂ حیات سمویا ہوُا ہی -

مَیں اس دنیا سے اختلاف کرنے کے لیے پیدا ہوُا ہوُں ـــــــ یہ گورکی کی حیات کا جیکار (Slogan) ہی۔ تیس سال لگاتار وہ زار شاہی کے خلاف لڑتا رہا ، بارہا جیل گیا ، نظر بند ہوُا ، دیس نکالا بُھگتا۔ اس دوران میں وہ بولشیوک پارٹی کا حامی بن گیا اور بعض اختلافات کے باوجود قلمے درمے اس کی مدد کرتا رہا۔ انھیں کی صحبت اور خصوصاً لینن کی دوستی کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی باغیانہ خو ایک ڈھرّے پر لگ گئی اور اس کا قلم احتجاج سے بڑھ کر انقلاب کی تلقین کرنے لگا۔اس قسم کی تحریروں میں اس کا ناول (Mother) سب سے زیادہ ممتاز ہی

گورکی کی ادبی زندگی تین حصّوں میں بانٹی جا سکتی ہی۔ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد اور ان دونوں عہدوں میں رؤس سے باہر۔ انقلاب کے پہلے کا دؤر سیاسی سرگرمیوں اورخصوصاً ناول نگاری کا ہی۔ بعد ازاں جب کبھی وہ رؤس میں رہا اپنا زیادہ وقت انقلاب کی تہذیب پر صرف کرتا رہا - مگر اس کے ادبی شاہکاروں کا بیشتر حصہ دیس سے

باہر لکھا گیا۔ اٹلی کے جنّت نظیر جزیرہ کاپری کو انھیں جنم دینے کا فخر حاصل ہی۔ مجھے قیام یورپ کے زمانے میں یہاں جانے کا موقع ملا۔ نیپلس کی بندرگاہ سے اسٹیمر گھنٹے بھر میں یہاں پہنچا دیتا ہی۔ نیلے سمندر کے بیچوں بیچ پہاڑیوں کے دامن میں یہ ہرا بھرا ٹاپو ابدی بہار کی رنگینیوں سے بھرپور ہی۔ سیّاح اب بھی وہ مکان دیکھنے جاتا ہی جہاں ادب جدید کے پیغمبر نے اپنی امر کہانی لکھی تھی۔ دور بیٹھ کر گورکی زیادہ وسیع النظری اور توازن سے اپنے خیالات و مشاہدات کو سمیٹ سکتا تھا۔ روس کے اندر وقتی ہنگاموں کا اثر اس کی پُرجوش طبیعت فوراً قبول کرلیتی تھی اور وہ زندگی کی بے کرانی کو فراموش کرجاتا تھا۔

انقلاب روس سے پہلے جلا وطنی کی حالت میں کاپری میں دن گزارتے ہوئے، وہ اپنے ماضی کی ورق گردانی کرنے بیٹھا۔ پہلے تو وہ حیص و بیص میں رہا کہ اوائل عمر کے جلتے ہوئے پھپھولوں کو چھیڑے یا نہیں، مگر ضمیر نے دلاسا دیا: "جب روس کی اُس وحشیانہ زندگی کا خیال آتا ہی تو میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اس کا ذکر کیوں کیا جائے۔ جواب ملتا ہی کہ یہ ذکر جائز ہی کیونکہ حقیقت پر مبنی ہی۔

یہ وہ بِس کا پیڑ ہی جس کی جڑ تک ہمیں پہنچنا ہی۔ اسے لوگوں کی رُوحوں اور ذہنوں سے نکالنا اور اپنی مکروہ وتاریک دنیا سے مٹانا ہی۔"

اس کتاب میں گورکی ناظر کو بتلاتا ہی کہ ہر معمولی سے معمولی آدمی اپنی شخصیت رکھتا ہی۔ اس کے ثواب و عذاب الگ ہیں، خواب وارمان جُدا ہیں۔ ہر زندگی ایک افسانہ ہی۔ ہر آدمی ایک کیرکٹر ہی۔ آنکھوں والا چاہیے۔ یوں اس نگارخانے میں تماشوں کی کمی نہیں۔

مگر انسانوں کے اِردگرد گویا کوئی مکڑی جالا بن رہی ہی۔ وہ نہیں جانتے کہ زنجیروں میں کسے ہوئے ہیں، کن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے سپنے بھیانک، ان کے ارمان گھنونے۔ وہ سب اسیر ہیں، زندگی کے اسیر۔

ان میں سے کسی کسی کو آزادی کی راگنی یاد ہی اور اس کی تان اس ہیبت ناک ماحول کو منور کردیتی ہی۔ گورکی کی نانی بھی انھیں میں سے ہی اور اس اندھیری دُنیا میں جگنو کی طرح چمک رہی ہی۔

گورکی نے یہ تذکرہ بڑی بے تکلفی سے لکھا ہی۔ اس کے اندازِ بیان میں صداقت اور خلوص کی ایسی

گھلاوٹ ہے، سادگی کے ساتھ ہلکی سی رنگینی کی ایسی ملاوٹ ہے، جو من موہ لیتی ہے ۔ وہ اپنے میں اور ناظر میں کوئی فصل نہیں رکھتا ۔ طالسطائی میں ایک قسم کا رئیسانہ تپاک ہے، دستوویکی میں بیماروں کا چڑچڑا پن ہے، چیخوف میں مفکّرانہ تنہا پسندی ہے جو ناظر کو اُن کے قریب جانے سے روکتی ہے ۔ مگر گورکی میں ایسی اپنایت ہے جو اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتی ۔ اس کتاب کے سب کردار نام بدل دیں تو زندۂ جاوید ہر گلی کوچہ میں چلتے پھرتے ملیں گے ۔ وہ دیکھیے، نانا جان ماتھے پر بل ڈالے مخدوش انداز سے ڈنڈا ہلاتے چلے آرہے ہیں ۔ اِدھر نانی امّاں آنگن میں بیٹھی کہانیاں کہہ رہی ہیں، پہیلیاں بجھا رہی ہیں، بوڑھا جاکوف دیوار کی اوٹ سے بچّوں کی شرارت دیکھ رہا ہے اور انھیں سزا دلانے کے منصوبے باندھ رہا ہے ۔

---

گورکی کی ترجمانی کے لیے اس کی آپ بیتی کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ اس کی بہترین تصنیف ہونے کے علاوہ وہ انگریزی زبان میں کم یاب ہے ۔ ہماری بدنصیبی کہ یورپین ادب انگریزی چھلنی سے چھن کر ہم تک پہنچتا ہے اور انگریزی مزاج جس چیز کو قبول کرنے کا

اہل نہیں وہ دیر کے بعد ہمیں ملتی ہے۔ اس آپ بیتی کی باقی دونوں جلدوں کے ترجمے زیرِ ترتیب ہیں اور انجمن انھیں بھی عنقریب ہدیۂ ناظرین کرے گی ۔

اختر حسین

# میرا بچپن

# باب ۱

ایک تنگ و تاریک کمرے میں کھڑکی کے پاس میرا باپ زمین پر پڑا ہؤا تھا۔ وہ ایک بہت لمبی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے ننگے پانو کی انگلیاں عجیب طریقے سے پھیل گئی تھیں۔ ہاتھ سینے پر بے حرکت پڑے تھے اور ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں تانبے کے دو سیاہ ٹکڑوں کے بار سے بند تھیں۔ چہرے کا نور اڑ چکا تھا اور وہ جس بھیانک ڈھنگ سے اپنے دانت دکھا رہا تھا، اس سے مجھے وحشت ہونے لگی۔

ایک سرخ سائے سے اپنا نیم جسم ڈھانکے ہوئے میری ماں دو زانو بیٹھ گئی اور بابا کے نرم و دراز بالوں کو اسی کالی کنگھی سے سلجھانے لگی جس سے میں تربوز کے چھلکے اتارنے کا کام لیتا تھا۔ وہ اپنی بھرّائی ہوئی دھیمی آواز میں لگاتار بڑبڑاتی جاتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی موسلا دھار جھڑی اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو بہالے جائے گی۔

میری نانی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس کا سر بڑا اور گول تھا۔ آنکھیں پھیلی پھیلی اور ناک پھولی پھولی سی۔ اس بڑھیا کی شخصیت بہت دلچسپ تھی۔ وہ بھی رو رہی تھی اور اس کا دکھ

میری ماں کے غم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک بار اس نے مجھے بابا کی طرف دھکیل دیا۔ لیکن خوف و ہراس کے مارے میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اس سے پہلے میں نے عمر رسیدہ لوگوں کو کبھی روتے نہ دیکھا تھا۔ نہ وہ الفاظ میری سمجھ میں آئے جنھیں میری نانی بار بار دُہراتی جاتی تھی :

" بابا کو خدا حافظ کہہ لے! اب تو اسے کبھی نہ دیکھے گا.... وہ مر گیا۔ ہائے کیسا نامُراد چلا!"

میں ابھی ابھی سخت بیماری سے اُٹھا تھا۔ خوب یاد ہے کہ مجھے روگ لگنے کے بعد بابا مجھے کس طرح ہنسایا کھلایا کرتے تھے۔ لیکن وہ دفعتاً غایب ہو گئے اور ان کی جگہ میری نانی آگئی جس سے میں قطعاً نا مانوس تھا۔

میں نے پوچھا: " تم کہاں سے چل کر آئی ہو؟"

" نجنی سے اور کہاں سے! میں کوئی پانْو پیدل آئی ہوں۔ اگن بوٹ مجھے یہاں لایا ہے۔ ارے بُھتنے پانی پر بھی کوئی چلتا ہے۔"

یہ بات میرے لیے سراسر انہونی تھی۔ اوپر کی منزل میں ایک ڈڑھیل مگر بانکا ترچھا ایرانی رہتا تھا اور نچلی کوٹھری میں ایک زرد رُو کلرک آباد تھا جو بھیڑ کی کھال بیچا کرتا تھا۔ جس کا جی چاہے سیڑھی سے اوپر چڑھ سکتا تھا اور گر گیا تو نیچے لڑھک سکتا تھا۔ یہ تو میرا ذاتی تجربہ تھا لیکن یہاں پانی کی گنجایش کہاں تھی؟ نانی کی کہانی تھی تو بے پر کی لیکن اس کے بے تُکے پن میں بھی بڑا لُطف تھا۔

" اچھا، تو میں بُھتنا کیوں ہوں؟"

"کیوں؟ اس لیے کہ تو اتنا چیختا چلاتا ہے" اس نے ہنس کر کہا۔
اس کی آواز میں مہر و محبت تھی اور پہلے ہی دن ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ جلدی سے مجھے اس کمرے سے نکال لے جائے۔

امّاں نے مجھے اپنے سے چمٹا لیا۔ اس کی ہچکیاں اور آنسو مجھے بے چین کرنے لگے۔ پہلی مرتبہ میں نے اُسے اس حال میں دیکھا تھا۔ ہمیشہ سے وہ کم سخن اور سخت گیر تھی۔ چکنی چپڑی، ہٹی کٹی۔ اس میں بلا کی سکت تھی اور اس کے بازو آہنی سلاخوں کی طرح مضبوط تھے۔ لیکن اس وقت وہ کانپتی بسورتی ہوئی بالکل بے دم ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے بال، جن کا جُوڑا بڑی صفائی سے گُندھا ہوا ایک چوڑی سی خوبصورت ٹوپی کے نیچے چھپا رہتا تھا، اب بکھر کر اس کے شانے اور چہرے پر پھیل گئے تھے۔ کچھ گندھی لٹیں بابا کے بےحس چہرے پر جھولنے لگیں۔ گو میں دیر سے کمرے میں بہوت کھڑا تھا، لیکن اس نے آنکھ اُٹھا کر بھی مجھے نہ دیکھا۔ بابا کی زلفوں کو سُلجھانے اور فغاں و فریاد کے سوا اور کچھ کرنے سے وہ معذور سی ہو چکی تھی۔

اتنے میں کچھ سیاہ فام گورکن ایک سپاہی کے ساتھ اندر جھانکنے لگے سپاہی بگڑ کر چلانے لگا: "چلو، نکلو یہاں سے! دیر نہ کرو!"

کھڑکی پر ایک سیاہ چادر ڈال دی گئی تھی اور وہ ہوا کے مارے بادبان کی طرح پھول گئی تھی۔ مجھے یہ بات یوں معلوم ہوئی کہ ایک روز بابا مجھے پال والی ڈونگی پر لے گئے تھے۔ اتنے میں بجلی زور سے کڑکنے لگی اور بابا نے مجھے گھٹنوں پر بٹھا کر ہنستے ہوئے کہا: "ڈرنے کی کوئی بات

نہیں ہے۔

یک بیک میری ماں فرش پر لوٹنے لگی اور اس کے بال خاک آلودہ ہو گئے۔ اس کا زرد چہرا بالکل بے رنگ ہو گیا۔ بابا کی طرح دانت نکال کر اس نے ڈراؤنی آواز میں کہا: "دروازہ بند کر دو! ـــ الکسی یہاں سے ہٹ جائے"

مجھے ایک طرف ہٹا کر نانی دروازے کی طرف یہ کہتی ہوئی جھپٹی: "دوستو ڈرو نہیں۔ ہمیں دق نہ کرو۔ للہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو اسے ہیضہ نہیں۔ وہ دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ ....... خدا کا واسطہ ہٹ جاؤ"

کونے میں ایک صندوق کے پیچھے میں دُبک گیا۔ وہاں سے کیا دیکھا کہ ماں ہانپتی ہوئی زمین پر تڑپ رہی ہے۔ نانی اس کے پاس بیٹھی ہوئی بڑے نرم انداز میں کہہ رہی تھی: "تجھے خدا اور عیسیٰ کا واسطہ! ورشکا ذرا ضبط سے کام لے۔ مریم! تو ہماری مدد کر!"

میں دم بخود تھا۔ وہ دونوں بابا کے پاس بیٹھی کراہ رہی تھیں اور اسے چھو چھو کر آہ و بکا کرنے لگتی تھیں۔ لیکن وہ تھا کہ کچھ کہنے کے بدلے سرد مہری سے مسکرا رہا تھا۔ دیر تک وہ اسی طرح رینگتی گھسٹتی رہیں۔ بار بار ماں کھڑی ہو ہو کر گر پڑی اور نانی ایک بڑے سے گیند کی طرح یہاں وہاں پھدکتی رہی۔ یکایک ایک بچّے کے رونے کی آواز آئی اور نانی بول اُٹھی: "شکر اللہ! یہ تو لڑکا ہے!" اور اس نے فوراً ایک موم بتّی جلا دی۔

اس دوران میں مجھے نیند آگئی ہوگی کیوں کہ بعد کی تفصیل

مجھے یاد نہیں۔

دوسرا واقعہ جو میری یادداشت میں ہنوز محفوظ ہے، میں برسات سے بھیگے ہوئے ایک دن کسی قبرستان کے ایک سنسان کونے میں ہوں۔ میں گیلی مٹّی کے تودے کے پاس کھڑا ہوا اُس خندق میں جھانک رہا ہوں جس میں بابا کا تابوت ڈال دیا گیا تھا۔ خندق کی تہ میں پانی ہے اور پانی میں مینڈک تیر رہے ہیں۔ ان میں سے دو اُچھل کر تابوت کے پیلے ڈھکن پر بیٹھ گئے ہیں۔

قبر کے کنارے میرے اور نانی کے سوا ایک پادری اور دو گورکن کھڑے تھے۔ بادلوں کا پانی کانچ کی اُجلی اُجلی بوندوں کی طرح برس رہا تھا اور ہم سب اس میں شرابور ہو گئے تھے۔

پادری نے چلتے چلتے کہا: "قبر بھر دو۔"

نانی رونے لگی اور اس نے سر پر پڑے ہوئے شال کے کونے سے اپنا سر چھپا لیا۔ گورکن اُکڑوں بیٹھ گئے اور جلدی جلدی مٹّی کے ڈھیلے قبر پر ڈالنے لگے اور ان مینڈکوں کو جو تابوت پر چڑھ بیٹھے تھے، مار مار کر نیچے گرانے لگے۔

نانی نے میرا شانہ ہلا کر کہا: "بیٹا، اب چلا آ۔" لیکن میں وہاں سے جانا نہ چاہتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

نانی مجھ پر اور اللہ میاں پر بڑبڑانے لگی۔ "یارب اب کیا ہوگا" کچھ دیر وہ مایوسی سے سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

قبر بھر جانے کے بعد بھی وہ کھڑی رہی، تاوقتیکہ گورکنوں نے اپنے پھاوڑے زور سے پٹک نہ دیے اور ہوا کا ایک تیز جھکڑ

بادلوں کو اڑا نہ لے گیا۔ تب وہ مجھے لیے ہوئے ایک کلیسا کی طرف چلی جس کا رستہ سیاہ صلیبوں کے جھرمٹ سے ہو کر گزرتا تھا۔

جب ہم اس گورِ غریباں سے باہر نکل آئے تو نانی نے پوچھا: "تو روتا کیوں نہیں؟۔ تجھے رونا چاہیے۔"

میں نے جواب دیا: "میں رونا نہیں چاہتا۔"

اس پر نانی نے نرمی سے کہا: "تیری مرضی نہیں، تو نہ رو۔"

مجھے تعجب ہوا، کیونکہ میں بہت کم روتا تھا اور روتا بھی تھا تو غصے میں، دکھ درد میں نہیں۔ بابا مجھے روتا دیکھ کر ہنس پڑتے تھے اور امّاں ڈانٹ کر کہتی تھی: "خبردار جو رویا۔"

اب ہم گاڑی پر سوار ہو کر ایک چوڑی مگر گندی سڑک سے گزرے جس کے دائیں بائیں سرخ مکانوں کا ہجوم تھا۔

رستے میں میں نے نانی سے پوچھا: "وہ مینڈک کبھی باہر بھی نکلیں گے؟"

جواب ملا: "کبھی نہیں!۔ اللہ انھیں بخشے۔"

میں سوچنے لگا کہ امّاں اور نانی اس موقع پر اللہ میاں کا ذکر اس کثرت اور اس محبت سے کیوں کر رہی ہیں۔

. . . . . . . . . . . . . . . . . .

کئی روز بعد وہ دونوں مجھے لے کر ایک اسٹیمر پر سوار ہوئیں جس میں ہمارے پاس ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔

میرا چھوٹا بھائی میکسم مر گیا تھا اور اس کی لاش سرخ و سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک میز پر رکھی تھی۔ گٹھریوں اور صندوقوں کے انبار پر کھڑے ہو کر میں روشن دان سے باہر جھانکنے لگا اور نہ

جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ یہ گھوڑے کی آنکھ ہے۔ نیچے مٹیالا پانی اِٹھلاتا بل کھاتا دھنواں دھار بہہ رہا تھا۔ ایک موج اس زور سے روشن دان سے ٹکرائی کہ میں بھیگ کر فرش پر گر پڑا۔

"درست،" یہ کہہ کر نانی نے ہولے سے مجھے گود میں اُٹھایا اور پھر اسی جگہ کھڑا کر دیا۔

نمناک اور دُھندلی کہر کی چادر پانی پر پڑی ہوئی تھی۔ گاہ گاہے دُور تاریک زمین کا کوئی ٹکڑا پل بھر کے لیے نظر آتا۔ پھر جھاگ اور کُہر میں چھُپ جاتا تھا۔ اردگرد کی ہر چیز متحرک تھی، میری ماں کے سوا جو دیوار سے سر ٹکائے ہاتھ باندھے بےحس و خاموش کھڑی تھی۔ اس کا چہرا لوہے میں ڈھلا ہُوا سا لگتا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور ساکت جسم کو دیکھ کر مجھے محسوس ہُوا کہ یہ کوئی اجنبی ہے جسے میں نہیں پہچانتا۔ اس کے کپڑے تک مجھے غیر مانوس معلوم ہونے لگے۔

آہستگی سے نانی اس سے کہتی جاتی تھی: "ورینکا، کچھ کھاؤگی نہیں؟" لیکن امّاں بُت بنی کھڑی تھی، نہ کچھ بولتی تھی، نہ ہلتی تھی۔ نانی مجھ سے تو زیرِلب باتیں کرتی تھی، لیکن امّاں سے وہ زور سے بولتی تھی —— سنبھل سنبھل کر جھجک جھجک کر۔ میں سمجھ گیا کہ نانی اس سے ڈرتی ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ اس سے ہم دونوں اور بھی قریب ہو گئے۔

اچانک ہم سب کو چونکا کر امّاں نے ڈپٹ کر کہا: "ساراتوف! ...... وہ جہازی کہاں گیا؟"

میرے لیے یہ الفاظ بے معنے تھے۔ سارا توف ؟ جہازی ؟۔
ایک سینہ دراز، سفید ریش شخص جو نیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔
ایک چھوٹا سا صندوق لیے ہوئے داخل ہوا۔ نانی نے صندوق لے لیا
اور اس میں میرے چھوٹے بھائی کی لاش رکھنے لگی۔ پھر وہ صندوق
باہر لے جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر کیبن کا دروازہ اتنا
تنگ تھا کہ موٹی تازی نانی جان بہ مشکل اس سے نکل سکتی تھیں۔
اس لیے وہ اس کے آگے ایسے حیص بیص میں پڑ گئیں کہ دیکھ کر ہنسی
آتی تھی۔

"صدقے جاؤں امی آپ کے" یہ کہ کر میری ماں نے بے صبری
سے وہ چھوٹا سا تابوت اس سے چھین لیا۔ وہ دونوں چلی گئیں اور
میں اس نیل پوش آدمی کو سرتا پا گھورنے لگا۔

اس نے جھک کر پوچھا: "کیوں یار تمھارا چھوٹا سا بھیّا چل بسا؟"

"تم ہو کون ؟"

"میں جہازی ہوں"

"اور سارا توف"

"سارا توف ایک شہر ہے۔ کھڑکی سے سر نکال کر دیکھ، باہر نظر
آئے گا۔" جھانک کر دیکھا تو زمین تلے اوپر ہو رہی تھی۔ اس کہر آلود زمین
کے دھندلے دھندلے خدوخال ایسے لگتے تھے گویا کسی گرم گرم روٹی
کا ایک ٹکڑا نوچ لیا گیا ہو۔

"نانی جان کہاں گئیں ؟"

"اپنے ننھے نواسے کو دفنانے کے لیے۔"

"کیا وہ زمین میں دفن کیا جائے گا؟"

"ہاں ہاں، زمین میں۔"

اب میں نے جہازی کو اُن مینڈکوں کا قصّہ سُنایا جو حینِ حیات بابا کے ساتھ دفن ہوگئے تھے۔

جہازی نے مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کیا اور کہا: "ارے ننھے نادان تو کیا سمجھے۔ قابلِ رحم وہ مینڈک نہیں بلکہ تیری ماں ہے۔ سوچ تو سہی کہ غم سے وہ کیسی نڈھال ہوگئی ہے۔"

اتنے میں اوپر سے ایک سامعہ خراش آواز آئی۔ مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اس قسم کی آواز اسٹیمر نکالا کرتا ہے اس لیے میں سہما بھی نہیں البتہ مجھے فرش پر ڈال کر وہ جہازی یہ کہتا ہوا جھپٹا کہ مجھے بھاگنا چاہیے۔

باہر نکلنے کو میں اتاؤلا ہو اٹھا۔ ہمّت باندھ کر باہر نکل آیا۔ تنگ و تاریک صحن سونا پڑا ہوا تھا اور تھوڑی دوری پر پیتل کی سیڑھی جگمگا رہی تھی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو اوپر مسافروں کا غول تھیلیاں اور بقچے دبائے ساحل پر اُترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بھی یہاں سے کوچ کردوں۔

لیکن جب میں زینۂ ساحل کے قریب کسانوں کی بھیڑ میں پہنچا تو وہ سب بیک آواز مجھ پر چیخنے لگے۔

"یہ کس کا بچّہ ہے؟ ارے تو کس کے ساتھ ہے؟"

کوئی کچھ نہ بتلا سکا۔

دیر تک وہ مجھے ادھر اُدھر نچاتے رہے، حتیٰ کہ وہی جہازی لپکا اور یہ کہتے ہوئے مجھے پکڑ لیا: "یہ تو کیبن والا استراخانی لڑکا ہے۔"

وہ مجھے کھینچ کر کیبن میں لے گیا اور گٹھریوں کی ڈھیری پر پٹک کر گھونسا دکھاتے ہوئے جاتے ہوئے کہہ گیا: "ایسی کندی کروں گا کہ یاد رکھے گا۔"

اوپر کا شور وغوغا رفتہ رفتہ کم ہوگیا۔ بوٹ کی تھرتھراہٹ بھی رفتہ رفتہ بند ہوگئی تھی اور نہ اب وہ لہروں کے ساتھ جھولا جھول رہا تھا کیبن کا جھروکا پانی کی دیواروں سے بند تھا۔ اندر اندھیرا تھا اور ہوا ایسی تھی کہ دم گھٹ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گٹھریاں بڑی ہوگئی ہیں اور میں ان کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔ اس خیال سے ڈر سا لگنے لگا کہ میں ہمیشہ کے لیے اس اُجاڑ کوٹھری میں تو قید نہیں کر دیا گیا ہوں۔

ساری کوشش کے باوجود دروازہ نہ کھُلا۔ جب ہینڈل کا ہتھا ٹس سے مس نہ ہُوا تو میں نے دُودھ کی بوتل اُٹھاکر پوری طاقت سے اس پر دے ماری۔ نیتجہ یہ ہُوا کہ بوتل ٹوٹ گئی اور سارا دودھ میرے پانْو پر گر پڑا اور میرے جوتوں کے اندر گھس گیا۔ اس ناکامی سے بیزار ہوکر میں روتا ہُوا گٹھریوں پر گر پڑا اور فوراً سو گیا۔

جب آنکھ کھُلی تو اسٹیمر چل رہا تھا اور کیبن کی کھڑکی سورج کی طرح دمک رہی تھی۔

نانی میرے پاس بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ناک بھوں چڑھائے کچھ بڑبڑاتی جاتی تھی۔ اس کے بے حساب بال شانے سے گھٹنے اور گھٹنے سے فرش تک بکھرے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ نیلا کالا تھا۔ بالوں کو ایک ہاتھ سے بہ مشکل زمین سے اُٹھائے ان کی

لٹوں کو وہ ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی سے سُلجھا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اینٹھے ہوئے تھے، کالی آنکھیں تاؤ کے مارے جل رہی تھیں اور بالوں کے ہالے میں چھپا ہؤا چہرا کیسا ننھا منا لگتا تھا۔

اس وقت اس کے تیور بدلے ہوتے تھے۔ مگر جب میں نے پوچھا کہ تمھارے بال اتنے لمبے کیوں ہیں تو اس نے حسب معمول اپنے شیریں انداز میں کہا: "یہ میرے گناہوں کی سزا ہے! کنگھی چوٹی کے باوجود نگوڑوں کو دیکھو! ...... جب جوان تھی تو ان پہ ناز کرتی تھی لیکن بڑھاپے میں انھیں کوسوں نہیں تو کیا کروں؟ ...... لیکن تو سوتا کیوں نہیں۔ ابھی پو پھٹی ہے بڑا سویرا ہے۔"

"لیکن میں دوبارہ نہیں سونا چاہتا۔"

"اچھا تو نہ سو" اس نے فوراً کہا اور کنگھی کرتے ہوئے اس بینچ کی طرف دیکھنے لگی جس پہ اماں غافل سو رہی تھی۔

"پچھلی رات تو نے دودھ کی بوتل کیسے توڑی۔ میرے کان میں سچ سچ کہہ دے۔"

اس کی گفتگو کا یہی انداز تھا اور وہ ایسے میٹھے بول استعمال کرتی تھی جو خوش رنگ اور سدا بہار پھولوں کی طرح میری یادداشت میں لہلہانے لگتے تھے۔ جب وہ مسکراتی تھی تو اس کی کالی کالی رس بھری آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی تھیں اور ایک عجیب دلکشی سے منور ہو اٹھتی تھیں۔ اس کے مضبوط سفید دانت خوشی سے کھل اٹھتے تھے۔ اس کے جلے ہوئے رنگ اور لاتعداد شکنوں کو نظر انداز کر دو تو اس کی چھب میں اب بھی جوانی کا نور بسا ہؤا تھا۔ اس کی صورت

کو بگاڑنے میں اس کی ناک اور لال ہونٹوں کا خاص حصہ تھا۔ چاندی سے منڈھی ہوئی سیاہ ناس دانی کا ہُلاس سونگھتے سونگھتے اس کے نتھنے چوڑے پڑ گئے تھے اور شراب کی بہتات نے ہونٹوں کو لال گلال کر دیا تھا۔ اس کا ظاہر بے رنگ تھا، لیکن باطن میں ایک تیز و تند اور کبھی نہ بجھنے والی چنگاری روشن تھی جس کا پرتو اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ اس کی کمر جُھک چلی تھی لیکن اس کی چال میں بلّی کی سی نزاکت تھی اور وہ بلّی کی ہی طرح حلیم تھی۔

اس سے ملنے سے پہلے میں گویا سویا ہوا سا اور تاریکی کے لحاف میں چھپا ہوا سا تھا۔ لیکن جب وہ آئی تو اس نے مجھے جگایا اور دن کے اُجالے میں لا کھڑا کیا۔ میرے تاثرات کو اس نے ایک ہار میں پرویا اور انھیں رنگا رنگ کی لڑیوں میں گوندھا۔ اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے میری غم خوار بن گئی۔ وہ میری رگِ جان سے قریب ہے اور اس کی یاد مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کائنات کے لیے اس کی بے غرض محبت نے میری شخصیت کو مالا مال کیا اور مجھے وہ قوت بخشی جو ایک پُرخار زندگی کے لیے ازبس ضروری ہے

. . . . . . . . . . . . . .

چالیس سال پہلے کشتیوں کی رفتار سست ہوتی تھی۔ ہم عرصے سے نجنی کا سفر طے کر رہے تھے اور میں اُن دنوں کو کبھی نہ بھولوں گا جو حُسن کے بار سے دبے ہوئے تھے۔

موسمِ گرما کا چل چلاؤ تھا، خزاں کی آمد آمد تھی۔ صبح سے شام تک میں نانی کے ساتھ ڈیک پر رہتا تھا۔ اوپر صاف و سادہ آسمان کا

شامیانہ تنا رہتا تھا اور ہم لوگ دریائے وولگا، کے آب کشیدہ کناروں کے درمیان کشاں کشاں گزر رہے تھے۔ ایک بجرا لمبی سی رسّی سے ہمارے سُرخ اسٹیمر سے بندھا ہُوا تھا اور نیلے پانی پر ہچکولے کھاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہم سفر تھا۔ بجرا بھورا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے دیمک کا خیال آتا تھا۔

آنکھ اوجھل سورج، وولگا پر تیرتا پھرتا تھا۔ ہر ساعت ہمارے آگے ایک نیا نظارہ پیش کرتی تھی۔ زمین پر اُبھری ہوئی سبز پہاڑیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ایک بڑے سے لہنگے پر چُنّت پڑی ہوئی ہے۔ کنارے شہر اور گانو سے بسے ہوئے تھے۔ سنہری پتّیاں پانی پر تیر رہی تھیں۔

"دیکھو، دنیا کیسی سُہانی ہے!" نانی ہر آن یہ کہتی ہوئی بوٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے کا چکّر لگاتی جاتی تھی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اکثر ساحل کو تکتے تکتے وہ مجھے بھول جاتی تھی۔ سینے پر ہاتھ باندھ کر وہ ڈیک پر خاموش کھڑی ہو جاتی اور مسکراہٹ کے باوجود اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ میں اس کے سیاہ سائے کو کھینچ لیا کرتا تھا اور وہ چونک کر کہہ اُٹھتی تھی: "اوہ! مجھے نیند آگئی ہو گی اور میں سپنا دیکھ رہی ہوں گی۔"

"لیکن تم رو کیوں رہی تھیں؟"

ہنستے ہوئے وہ جواب دیتی تھی: "خوشی اور ضعیفی کے مارے! تم جانتے ہو کہ میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔ اب میں ساٹھ سال کی ہو چکی۔"

پھر ناس سونگھتے ہوئے وہ مجھے رحم دل ڈاکوؤں، پہنچے ہوئے درویشوں، بھانت بھانت کے جانوروں اور بھوت پریتوں کے عجیب وغریب قصّے سنانے لگتی تھی۔

قصّے سُناتے وقت اس کی آواز پُر اسرار ہوجاتی تھی۔ سر سے سر بھڑا کر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی تھی اور واقعتًا مجھے اُس طاقت کا احساس دلانے لگتی جو اندر ہی اندر مجھ میں پیدا ہورہی تھی۔ میں اُس خوشی کو بیان نہیں کرسکتا جو اُن کے قصّے سُن کر ہوتی تھی۔

ایک کے بعد میں دوسری کہانی کی فرمایش کرتا تھا اور وہ کہتی جاتی تھی: "تندور میں ایک بُڈھا بھوت رہتا تھا۔ ایک بار اس کے پہنچے میں کانٹا چبھ گیا اور وہ روتا ہوا یہاں وہاں بھاگنے لگا۔" چوہے رے چوہے، بڑا درد ہورہا ہے، میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔"

اپنا پیر ہاتھ میں لے کر وہ اُچھلنے لگتی تھی اور یوں منہ بناتی تھی جیسے کانٹا اسی کے لگا ہے۔

نیک دل ڈرڈھیل جہازی یہ قصّے سُنتے اور ہنستے ہوئے اُن کی تعریف کرتے اور باصرار کہتے :" بڑی بی ایک اور، ایک اور!"

آخرش وہ کہتے:" بڑی بی، آؤ، کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔"

کھانے کے ساتھ وہ اُسے خوب ووڈکا (روسی شراب) پلاتے اور میری خاطر تربوزوں سے کرتے تھے۔ تربوز کی دعوت پردۂ راز میں ہوتی تھی کیونکہ بوٹ پر ایک سارنگ گھوم پھر کر پھل کھانے کی ممانعت

کرتا تھا اور نگاہ پڑتے ہی پھلوں کو ندی میں پھینک دیتا تھا۔ وہ خلاصیوں کی وردی پہنے رہتا تھا اور ہمیشہ نشے میں چور رہتا تھا سب لوگ اُس سے کتراتے تھے۔

کبھی کبھی میری ماں ڈیک پر آتی تھی اور ہم سے الگ ہٹ کر ایک کونے میں کھڑی ہوجاتی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتی تھی۔ اس کا سڈول جسم، فکرمند چہرا، چمکتے ہوئے گھنے بالوں کا جوڑا — غرض کہ بند بند سے چستی اور توانائی ٹپکتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی جھلملے بادل یا جھینے جھینے پردۂ کہر میں لپٹی ہوئی ہے، جس میں سے وہ بڑی بڑی بھوری آنکھوں سے بے مہر انداز میں تاکا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ اس نے ڈانٹ کر کہا: "اماں، لوگ تم پر ہنس رہے ہیں" مگر نانی نے لاپرواہی سے جواب دیا: "خدا ان کا بھلا کرے! ہنستے ہیں تو ہنسنے دو! ان کے منہ میں گھی شکر!"

مجھے نانی کی وہ طفلانہ مسرت ہنوز یاد ہے جو نجنی کو دیکھ کر اسے ہوئی تھی۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے اپنے آغوش میں کھینچ لیا اور چیخ کر کہا: "دیکھ وہ کس قدر خوب صورت ہے! یہی نجنی ہے۔ جنت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اور گرجا گھر کو دیکھ! یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے پر نکل آئے ہیں؟" پھر میری ماں کی طرف مڑ کر روہانسی آواز میں بولی: "ورنکا، کیا تو نہیں دیکھنا چاہتی؟ یہاں آ۔ تو تو سب کچھ بھول گئی۔ اری، تجھے تو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی؟"

میری ماں ماتھے پر بل ڈال کر، نہایت تلخ انداز میں مُسکرانے لگی

جب اسٹیمر اس خوب صورت شہر کے باہر اُن کشتیوں کی بھیڑ میں پہنچا جو دونوں ندیوں کے دھارے کو روکے ہوئے اپنے سُبک مستولوں کو ہوا میں نچا رہی تھیں، تو ایک بڑی سی ڈونگی کئی آدمیوں کو لیے ہوئے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ یکے بعد دیگرے اس کے سب مسافر ہمارے بوٹ پر اُتر آتے۔ ایک پستہ قد سیاہ پوش بوڑھا، جس کی ناک طوطے کی سی، آنکھیں ہری ہری اور داڑھی کچھ گلابی کچھ سنہری تھی، دوسروں کو دھکیلتے ہوئے ہماری طرف بڑھا۔ "ابّا جان" رُندھی ہوئی آواز میں یہ کہتی ہوئی میری ماں اس کے گلے سے چمٹ گئی۔ لیکن اس کے چہرے کو اپنے لال لال ہاتھوں میں لے کر نانا نے جلدی سے اس کے گالوں کو تھپکا اور کہا:

"بیوقوف کہیں کی، تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

نانی نے پھرکی کی طرح گھوم کر چٹاچٹ ان سب کو چوما اور گلے لگایا۔ پھر مجھے ان کی طرف بڑھا کر جلدی جلدی کہا: "دیر نہ کرو یہ ہیں ماموں مائیکل، یہ ہیں ماموں جاکوف، یہ ہے ممانی نتالیا، یہ دونوں تمہارے ماموں زاد بھائی ہیں، دونوں کا نام ساشا ہے اور یہ ان کی بہن کترینا ہے۔ یہ ہمارا خاندان ہے۔ کیا یہ کافی بڑا نہیں ہے؟"

نانا نے پوچھا: "کیوں جی، تم اچھی ہو؟" پھر دونوں نے تین مرتبہ ایک دوسرے کو چوما۔

اب نانا نے اس بھیڑ میں سے مجھے نکالا اور سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: "کیوں بھئی تم کون ہو؟"

"میں کیبن والا استراخانی لڑکا ہوں"

نانا نے میری ماں کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ کیا بکتا ہے؟" پھر مجھے ہلاتے ہوئے بولے: "تو ہماری ہی ٹھُنی کا پتّا ہے۔ چل، ڈونگی پہ بیٹھ۔"

ساحل پہ اُتر کر ہمارا جلوس گٹّیوں سے پٹی ہوئی ایک سڑک سے ہوکر پہاڑی پر چڑھنے لگا جس کے دونوں نشیب گھاس سے ڈھنکے ہوئے تھے۔

امّاں اور نانا آگے آگے جا رہے تھے۔ نانا امّاں سے ایک بالشت چھوٹے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ رینگ رہے ہیں اور امّاں انھیں ایک بلندی سے دیکھتی ہوئی ہوا میں اُڑی چلی جا رہی ہیں۔ ان کے بعد چکنے چپڑے بالوں والے ماموں مائیکل نانا کی سی جھرّیاں مُنہ پر ڈالے گھنگھرالے اور چمکیلے بالوں والے جاکوف کے ساتھ تھے۔ پھر کچھ موٹی عورتیں رنگ برنگے کپڑے پہنے چھ عدد بچّوں کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ یہ چھ کے چھ عمر میں مجھ سے بڑے تھے مگر سب کے سب منہ میں گھنگھنیاں بھرے ہوئے تھے۔

میں اپنی نانی اور مُمانی نتالیا کے ساتھ تھا۔ ممانی کا رنگ پیلا، آنکھیں نیلی اور بدن بھاری تھا۔ رُک رُک کر وہ ہانپنے لگتیں اور تھکی ہوئی آواز میں کہتی جاتیں: "اخاہ! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" نانی بگڑ کر کہتیں: "وہ ناحق تمھیں ساتھ لائے۔ سب اُلّو ہیں!"

مجھے نہ تو بوڑھے پسند آئے اور نہ بچّے۔ ان میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں، نانی بھی مجھے کچھ بیگانہ سی لگنے لگیں۔

سب سے زیادہ نفرت مجھے نانا سے ہوئی۔ پہلی ہی نظر میں

بھانپ گیا کہ وہ میرا دشمن ہے اور میں اس کی طرف سے محتاط بھی ہو گیا اور متجسس بھی۔

اب ہم اپنی منزل کو پہنچ گئے تھے۔

پہاڑی کی چوٹی پر داہنے بازو، سڑک کی پہلی عمارت کھڑی تھی۔ اس یک منزلہ مکان کی گلابی قلعی اب دھندلی پڑ گئی تھی۔ کھڑکیاں باہر نکلی پڑتی تھیں اور چھت نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ باہر سے دیکھنے میں وہ مکان خاصا بڑا لگتا تھا، لیکن چھوٹی چھوٹی اندھیری کوٹھریوں کے مارے وہ گھٹ سا گیا تھا۔ جدھر دیکھو، بگڑے دلوں کا ہجوم باہم دست و گریباں تھا اور ایک مکروہ بدبو ساری فضا کو مکدّر کر رہی تھی۔

میں آنگن میں نکل آیا، لیکن وہ بھی نِرا ویران پڑا تھا۔ ہر طرف گیلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے اور یک رنگ گندے پانی کی ناندوں میں کپڑے بھیگنے کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے چھپّر کے نیچے تندور میں تیز آگ جل رہی تھی جس میں کوئی چیز پک رہی تھی اور کوئی آواز یہ الفاظ منتر کی طرح جپ رہی تھی: "گندھک! تیزاب! توتیا!"

# باب ۲

اب حیرت ناک سرعت سے ایک ہنگامہ خیز اور رنگا رنگ زندگی کا دھارا رواں ہوتا ہے۔ مدت دراز کے بعد آج جو میں ماضی کی ورق گردانی کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ حقیقت یہی ہے اور بار ہا جی چاہتا ہے کہ میں اس کی تردید یا تاویل کروں۔ ایک بے بُلائے رشتہ دار کی زندگی وہ سوہانِ روح ہے جس کا خیال تک تکلیف دہ ہے لیکن حقیقت رحم سے زیادہ قوی ہے۔ اور پھر میں آپ بیتی نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اُس تنگ و تاریک ماحول کا مرقع پیش کر رہا ہوں جس میں اس طبقے کا ایک عام روسی رہتا تھا ــــــ اور اب بھی رہتا ہے۔

میرے نانا کے گھر میں باہمی رقابت اور کدورت کا بازار گرم رہتا تھا۔ بڑے سیانے ہی نہیں بلکہ بچّے بھی اس مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ اتفاق سے نانی کی زبانی یہ بھنک میرے کان تک پہنچی کہ میری ماں جس دن آئی اُسی روز اُس کے بھائیوں نے نانا سے جائداد کے بٹوارے کا مطالبہ کیا۔ امّاں کی اچانک آمد سے انھیں ایک نیا بہانہ ہاتھ آیا کیوں کہ وہ ڈرے کہ کہیں امّاں اپنا جہیز نہ مانگے جو نانا نے اس لیے نہیں دیا تھا کہ اس نے ان کی مرضی کے خلاف خفیہ شادی کر لی تھی۔ میرے ماموں مُصر تھے کہ یہ

جہیز اُن سب میں بانٹ دیا جائے۔ علاوہ بریں وہ آپس میں اس بات پر عرصے سے لڑ رہے تھے کہ شہر یا فلانے گاؤں میں اُن میں سے کون نیا کارخانہ قایم کرے۔

ہمیں آئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ کھانے کے وقت یکایک جنگ چھڑ گئی۔ میرے ماموں اُٹھ کھڑے ہوئے اور میز پر جُھک کر نانا پر بکنے جھکنے لگے اور کُتوّں کی طرح غرّانے لگے۔ نانا کا چہرہ سُرخ پڑ گیا اور اس نے چمچہ زور سے پٹک کر ایسی گھُڑکی دی گویا مرغا بانگ دے رہا ہو: "میں تم سب کو نکال باہر کروں گا"

نانی کا چہرہ گویا شدّتِ کرب سے مسوس گیا تھا۔ اس نے کہا: "وہ جو مانگتے ہیں دے دو! پھر تو چین کا ایک پل نصیب ہوگا"

نانا نے آنکھیں نکال کر کہا: "چُپ رہ بُڑھیا ڈھڈّو!"

تعجّب ہوتا تھا کہ بالشت بھر کا آدمی اس زور سے کیسے چیخ لیتا ہے۔

امّاں میز سے اُٹھ کر چُپ چاپ کھڑکی کے پاس گئیں اور سب کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑی ہوگئیں۔

اتنے میں مائیکل ماموں نے اپنے بھائی کے ایک لپّڑ رسید کر دیا۔ یہ حضرت غصّے سے بوکھلا کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں فرش پر ٹھنیاں کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو گالی دینے لگے بچّے رونے لگے اور مُمانی نتالیا، جو حمل سے تھیں، سُبکیاں بھرنے لگیں۔ میری ماں انھیں پکڑ کر کہیں باہر لے گئیں۔ کم عمر نوکرانی یوجینیا نے بچّوں کو باورچی خانے سے نکال دیا۔ کُرسیاں تِتّر بِتّر ہوگئیں اور ان کے نیچے نوجوان کاریگر سگنوک ماموں مائیکل کی پیٹھ پر

سوار نظر آیا۔ اور کارخانے کا منتظم گری گوری اپنی رنگین عینک گنجی کھوپری اور لمبی داڑھی ہلاتا ہوا بڑے اطمینان سے ماموں کے ہاتھ باندھنے لگا۔

اِدھر اُدھر سر مارتے ہوئے اور اپنی چھدری کالی داڑھی سے فرش جھاڑتے ہوئے ماموں مائیکل بُری طرح گالیاں بک رہے تھے۔ اور نانا منبر کے اِرد گِرد اُچھلتے ہوئے بے لبسی سے کہتے جاتے تھے: "یہ بھائی ہیں — یہ سگے بھائی ہیں! ....... ارے لعنت ہو تم پر!"

جنگ چھڑتے ہی میں ڈر کے مارے تندور کے اوپر دبک کر جا چھپا تھا۔ وہاں سے حیرت و ہراس کے عالم میں میں نے دیکھا کہ نانی جاکوف کا کٹا ہوا منہ پانی سے دھو رہی ہے اور وہ مچل مچل کر رو رہا ہے۔ نانی دردناک لہجے میں کہتی جاتی تھی: "یہ بھیڑیے ہیں! یہ جنگلی جانور ہیں! ...... معلوم نہیں، خدا انھیں کب سمجھ دے گا!"

نانا اپنے پھٹے ہوئے کُرتے کو سنبھالتے ہوئے اُس پر برس پڑے: "اری بُڑھیا، کیا تجھے کُتّے کے پلّے ہی جننے تھے؟"

جب جاکوف چلا گیا تو نانی ایک کونے میں جا کر غم سے ڈوبی ہوئی آواز میں دعا مانگنے لگی: "مریم، اے خدا کی ماں، میرے بچّوں کو عقل دے!"

نانا اس کے پاس کھڑے ہوئے منبر کو دیکھ رہے تھے جس پر ہر چیز اُلٹ گئی تھی۔ پھر آہستہ سے بولے: "کیوں جی، یہ اچھے ہیں

یا جسے پیدا کرنے کا طعنہ ورشکا کو سب لوگ دیا کرتے ہیں؟"
"بلّٰہ فضول نہ بکو۔ کرتا اُتار دو تو میں اسے ٹھیک کردوں"
ان کی پیشانی نانی نے چومی اور بڑے میاں —— جو اس کے مقابلے میں ذرا سے لگتے تھے۔ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر کہنے لگے: "اجی ان کمبختوں کو ان کا حصّہ دینا ہی ہوگا"
"ہاں جی، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے"
کچھ دیر تو وہ دونوں گھُل مِل کر باتیں کرتے رہے۔ لیکن یک بارگی نانا نے اُس مرغے کی طرح جو لڑائی سے پہلے اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے، نانی کو اُنگلی دکھا کر غضب ناک انداز میں کہا: "میں تجھے خوب پہچانتا ہوں! تو انھیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہے۔۔۔ ارے تیرا مائیکل کیا ہے؟ یہودی ہے یہودی! اور تیرا جاسوف؟ کافر ہے کافر!۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب میرے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔۔۔۔ طفیلیے کہیں کے!"
تندور پر بے چینی کے مارے کروٹ بدلتے بدلتے میری ٹانگ ایک لوہے کی چھڑ سے ٹکرائی اور وہ دندناتے ہوئے نیچے گر گئی، نانا سے کھٹ سے اوپر چڑھے اور مجھے نیچے کھینچ کر یوں گھورنے لگے گویا پہلی بار دیکھا ہو۔
"ابے تجھے تندور پر کس نے چڑھایا؟ تیری ماں نے؟"
"میں خود ہی چڑھ گیا تھا"
"جھوٹا کہیں کا"
"جھوٹ کی کیا بات ہے۔ میں ڈر کر اوپر دبک گیا تھا"

اس نے مجھے ہلکی سی چپت لگا کر یہ کہتے ہوئے ڈھکیل دیا:
"ہو نا اپنے باپ کا بیٹا! نکل یہاں سے!"
باورچی خانے سے نکل کر میری جان میں جان آئی۔

. . . . . . . . . . . .

میں خوب جانتا تھا کہ نانا کی تیز آنکھیں ہر جگہ میری ٹوہ میں رہتی ہیں اور میں ان سے ڈرنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ میں کس طرح اس کی آتشیں نگاہوں سے پناہ ڈھونڈا کرتا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ بڈھے کی طبیعت میں بدی بھری ہوئی ہے۔ وہ ہر آدمی پر درشت لہجے میں طعنہ زنی کیا کرتا تھا اور خود چڑچڑا ہونے کے سبب سے ساری دنیا کو اُکسانے کی جستجو میں رہتا تھا۔

"ہشت! دھت!" یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔

"ہشت" کی لمبی سسکاری اب بھی میرے جسم میں لرزہ پیدا کردیتی ہے۔ شام کی چائے کے وقت جب نانا، ماموں اور تمام کاریگر تھکے ہارے باورچی خانے میں داخل ہوتے تھے، تو ان کے تارکول میں لتھڑے ہوئے اور تیزاب سے جلے ہوئے ہاتھوں، نیز رومال میں لپٹے ہوئے بالوں کو دیکھ کر خدا کے اُس سیاہ مجسّمہ کا خیال آتا تھا جو کونے میں پڑا ہوا تھا۔ اس خوفناک ساعت میں نانا میرے پاس بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے اور میں دوسرے بچّوں کی رشک آگیں نگاہوں کو تاڑ جاتا تھا جو اِس قربت کی وجہ سے مجھے کھائے جاتی تھیں۔ نانا کی ہر بات جچی تلی ہوتی تھی۔ وہ جو ریشم کی کناری والی صدری پہنے رہتے تھے وہ پُرانی ہوگئی تھی۔ رنگین روئی کا کُرتا

ڈھلتے ڈھلتے خستہ ہوگیا تھا۔ پتلون کے گھٹنے چپنیوں سے نکل آئے تھے، ان سب باتوں کے باوجود ان کی سج دھج میں اپنے بیٹوں سے زیادہ بانکپن تھا اور نکھار تھا، جو نقلی ریشم کی قمیصیں اور جھل جھلی ٹائیاں باندھے رہتے تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ہی نانا نے مجھے دُعائیں رٹنے کا حکم دیا۔ دوسرے سب بچّے عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور گرجا کے محرّر سے لکھنا پڑھنا سیکھ رہے تھے۔ شرمیلی مُمانی نتالیا دھیمی آواز میں مجھے پڑھایا کرتی تھی۔ اس عورت کے چہرے پر بچپن کی سی معصومیت تھی اور اس کی آنکھیں اتنی شفاف تھیں کہ ان میں اس کے دل کا حال جھلکتا تھا مجھے اس کی آنکھوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ جب وہ اپنا سر موڑتی تھی تو آنکھیں تاروں کی طرح جھلملاتی تھیں۔ وہ بڑی نرمی سے کہتی تھی: "بہت ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کہو آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس باقی رہے" اور اگر میں پوچھتا تھا کہ نام کی تقدیس کیا چیز ہے؟ تو وہ سہم کر آزو بازو دیکھتی اور مجھے ڈانٹتی کہ حُجّت نہیں کیا کرتے، یہ گناہ ہے۔ کہتے جاؤ "آسمانی باپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اس بات سے مجھے حیرت ہوتی تھی۔ سوال پوچھنا گناہ کیوں ہے؟ نام کی تقدیس —— یہ الفاظ میرے ذہن میں کسی پُر اسرار منتر کی طرح جم گئے اور میں موقع بے موقع ان کا غلط سلط استعمال کرنے لگا۔

لیکن میری مُمانی اپنی تھکان کے باوجود صبر نہ ہاری اور گلا

صاف کرکے جو ہمیشہ سوکھا رہتا تھا، کہنے لگی: "یہ ٹھیک نہیں ہے، صرف یہی کہو، تیرے نام کی تقدیس باقی رہے۔ آخر اس میں دقّت کیا ہے؟" لیکن میرے لیے یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ میں کبیدہ خاطر ہوگیا اور دعا کو کسی طرح یاد نہ رکھ سکا۔

ایک روز نانا نے پوچھا: "اولیشا" آج تو کیا کرتا رہا ہے؟ کھیل؟ تیرے ماتھے کی چوٹ تو یہی ظاہر کرتی ہے۔ چوٹ لگانا مشکل نہیں ہے اور آسمانی باپ کا کیا ہوا؟ تونے اسے یاد کیا؟"

مُمانی نے آہستہ سے کہا: "اس کی یاد داشت بہت خراب ہے۔"

یہ سُن کر نانا کی باچھیں کھل گئیں اور ناک بھوں چڑھا کر بولے:

"اس سے کیا۔ اس کا واحد علاج بید ہے۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھا: "کبھی تیرے باپ نے تجھے ٹھونکا تھا؟" میری سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے، اس لیے میں خاموش رہا۔ لیکن میری ماں نے جواب دیا: "نہیں میکسم نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا اور نہ مجھے اس کی اجازت دی!"

"آخر اس کی وجہ؟"

"وہ کہتے تھے کہ مارپیٹ سے علم نہیں آتا۔"

"میکسم ـــــ وہ ہر معاملے میں احمق تھا..... خدا مجھے معاف کرے کہ مرحوم کے لیے ایسی بات زبان سے نکل گئی۔" نانا نے جھلّا کر یہ عذر خواہی کی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اس کی باتوں سے غصّے میں آگیا ہوں۔ "منہ کیوں بنا رہا ہے؟....... ہیں!!...... ہشت! دھت!" پھر اپنے پکّے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

بولا: "اس سنیچر کو میں ساشا کی مرمّت کرنے والا ہوں"
میں نے پوچھا: "مرمّت کیسی ہوتی ہے؟"
سب لوگ ہنس پڑے اور نانا نے کہا: "ذرا ٹھہرو، پھر پتا چلے گا"

تنہائی میں میں لفظ "مرمّت" کے مطالب پر غور کرنے لگا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ بید اور ٹھکائی سے اس کا خاص تعلق تھا۔ میں نے لوگوں کو گھوڑوں، کتّوں اور بلّیوں کو پیٹتے دیکھا تھا اور استراخان میں سپاہی ایرانیوں کو مارا کرتے تھے۔ لیکن اب تک میں نے چھوٹے بچّوں کو پٹتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس گھر میں میرے ماموں اپنے بچّوں کو مارنے سے نہ چوکتے تھے۔ وہ بھی بے چون و چرا اسے برداشت کرلیتے تھے اور اپنی چوٹوں کو سہلا کر رہ جاتے تھے۔ اگر میں پوچھتا کہ چوٹ تو نہیں لگی تو وہ بڑی دیدہ دلیری سے جواب دیتے تھے: "نام کو بھی نہیں"

انھیں دنوں انگشتانے کے سلسلے میں ایک پُر لطف واقعہ ہوا۔ شام کی چائے اور رات کے کھانے کے درمیان، میرے ماموں اور کارخندار مل کر رنگی ہوئی تھگلیوں کی بخیہ گری کرتے اور ان پر ٹکٹ چسپاں کیا کرتے تھے۔ ایک روز مائیکل ماموں نے کوتاہ بیں گریگوری پر فاختہ اُڑانے کا تہیّہ کیا اور اپنے نو سالہ بھتیجے کو ہدایت کی کہ گریگوری کے انگشتانے کو آگ میں تپا دے۔ ساشا نے گرما گرم کرکے اُسے چُپ چاپ گریگوری کے پاس رکھ دیا اور خود تندور میں چھپ گیا۔ سوئے اتفاق کہ اسی آن نانا جان کا گزر اُدھر ہوا اور کام کرنے کی نیت سے

انھوں نے جھٹ سے وہ انگشتانہ اپنی اُنگلی میں چڑھالیا۔

شور سُن کر میں بھی باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ نانا کی اُس مضحکہ خیز ہیئت کو میں کبھی نہ بھولوں گا جب جلی ہوئی اُنگلی ہلاتے ہوئے وہ یہاں وہاں کود رہے تھے اور چلّاتے جاتے تھے: "وہ سوُر کہاں ہے جس نے یہ شرارت کی ہے"

مائیکل ماموں جھک کر انگشتانے پر پھونک مارنے لگے۔ گریگوری لاپرواہی سے اپنے کام میں مصروف تھا اور اس کی چوڑی چکلی گنجی کھوپڑی پر چیزوں کی پرچھائیں ہل رہی تھی۔ اتنے میں جاکوف ماموں دوڑے آئے اور کونے میں چھُپ کر ہنسنے لگے۔ نانی آلو کے چھلکے اُتارتی ہوئی بیٹھی رہی۔

اچانک مائیکل ماموں بول اُٹھے: "یہ جاکوف کی کرتوت ہے"

"جھوٹے کہیں کے!" یہ کہہ کر جاکوف اپنی جائے پناہ سے نکل آیا۔ لیکن اس کا بیٹا روتے ہوئے بولا: "ابّا جان! انھیں نے تو مجھ سے کہا تھا"

دونوں ماموں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن نانا کا غصّہ کافور ہوگیا اور وہ اُنگلی پر آلو کی پلٹس رکھ کر مجھے لیے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب کی متّفقہ رائے تھی کہ یہ شرارت مائیکل کی ہے۔ میں نے سادہ لوحی سے رائے دی کہ ان کی مرمّت ہونی چاہیے۔

نانا نے چور آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہا: "ضرور، ضرور"

لیکن مائیکل ماموں میز پر مُکّا مار کر میری ماں پر گرج پڑے: "ورشکار، اپنے پلّے کا مُنہ بند کر، ورنہ میں اس کا سر قلم کردوں گا!"

میری ماں نے کہا: "ہی ہمّت؟ ذرا اسے چھو کر تو دیکھنا۔" پھر کسی کو مُنہ کھولنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔

میری ماں میں یہ بڑا کمال تھا کہ وہ لوگوں کو گھاس پھوس کی طرح اپنی راہ سے ہٹادیتی تھی اور اس کے دو چار جُملے انھیں ہوش میں لانے کو کافی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ سب اُس سے خوف کھاتے ہیں یہاں تک کہ نانا بھی اس سے گفتگو کرتے وقت اپنا لہجہ بدل دیتے تھے یہ دیکھ کر مجھے بڑی مسرّت ہوتی تھی اور میں اپنے بھائیوں سے فخریہ کہا کرتا تھا: "اکیلی میری ماں ان سب پر بھاری ہے۔" اور وہ بھی اس امر سے انکار نہ کرسکتے تھے۔

لیکن سنیچر کے واقعات نے امّاں کا رُتبہ میرے دل سے کم کردیا۔

. . . . . . . . . . .

اس دن گویا مجھ پر بھی سنیچر سوار ہوا۔ میں بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ کارخندار کس آسانی سے مختلف چیزوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ کسی پیلی چیز کو اُٹھا کر وہ کالے رنگ میں ڈبوتے اور وہ نیلی ہو کر نکلتی۔ کسی بھوری چیز کو سُرخ پانی میں ڈالتے تو وہ ارغوانی ہوجاتی۔ بات تھی تو آسان لیکن میرے لیے یہ جادو کا کھیل تھا۔ میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کوئی چیز اپنے ہاتھوں سے رنگوں اور میں نے یہ خواہش ساشا سے ظاہر کی۔ وہ بڑا سمجھ دار تھا اور سب سیانے اُسے پسند کرتے تھے کیوں کہ وہ نیک دل ہونے کے علاوہ دوسروں کی خدمت کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس کی کارپردازی اور حکم برداری کو اور سب تو سراہتے تھے لیکن نانا جان کی آنکھوں میں وہ کھٹکتا تھا

اور وہ کہا کرتے تھے: "بڑا کائیاں ہے یہ لونڈا"

ساشا سانولا اور دُبلا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سدا چوکس رہتی تھیں اور وہ اتنی تیزی سے بولتا تھا گویا الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے ہیں بولتے وقت وہ سہمی ہوئی چتونوں سے دائیں بائیں دیکھتا جاتا تھا گویا پتّا کھڑکتے ہی بھاگ کھڑا ہوگا۔ اس کی نیلی آنکھوں کی پُتلیاں بے حرکت رہتی تھیں، لیکن جب وہ وحشت زدہ ہوتا تو یہ آنکھ کی سفیدی میں غایب ہوجاتی تھیں۔ مجھے یہ ساشا پسند نہ تھا۔

ساشا نمبر دو مجھے زیادہ پسند تھا۔ اس بیچارے کو سب لوگ حقارت سے پوستی اور آلکسی کہا کرتے تھے۔ وہ کم سخن تھا اور اپنی دردمند آنکھوں اور دل کش تبسّم کی وجہ سے اپنی ماں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ اس کے دانت بدنُما تھے اور اوپر کی ڈاڑھ میں ان کی دو قطاریں جلوہ نُما تھیں۔ اس عیب کا خیال اُسے چوبیس گھڑی رہتا تھا اور پچھلی صف کو گرانے کے لیے وہ اپنی اُنگلی سدا منہ کے اندر رکھتا تھا۔ جب کبھی کوئی اسے دانت گِنانے کو کہتا تو وہ بڑی خوشی سے مُنہ کھول دیا کرتا تھا۔ یوں وہ اس بھرے پُرے گھر میں بھی تنہائی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ دن کو وہ اندھیرے کونوں میں چھپا رہتا اور شام کو کھڑکی کی سل پر بیٹھ جایا کرتا۔ شیشے پر اپنا گال رکھ کر وہ گھنٹوں اُن کوّوں کو تاکا کرتا جو کبھی زمین پر اور کبھی درختوں پر اُچکتے رہتے تھے اور شفق کی سُرخی میں کلیسا کے گنبد پر منڈلانے کے بعد غول باندھے سیاہ بادلوں کی اوٹ خدا جانے کہاں غایب

ہو جاتے تھے۔ وہ کبھی اس نظارے کا ذکر کسی سے نہ کرتا تھا۔ لیکن دیر تک اس کی خوش نمائی اسے مگن رکھتی تھی۔

اس کے برعکس جاکوف ماموں کا بیٹا ساشا نمبر تین ہر معاملے پر سیانوں کی طرح تقریر کیا کرتا تھا۔ جب اسے خبر لگی کہ مجھے رنگ سازی کا شوق اٹھا ہے تو اس نے مجھے رائے دی کہ الماری سے میز کی عمدہ سی چادر نکالو اور اسے نیلے رنگ میں رنگو۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ رنگ سفید کپڑے پر ہی اچھا چڑھتا ہے۔

میں نے ایک بھاری سی میز کی چادر نکالی اور آنگن میں پہنچ کر اس کا کونا نیلی ناند میں ڈالا ہی تھا کہ کہیں سے سگنوک مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اپنے آہنی ہاتھوں سے چادر چھین کر اس نے ساشا کو پکارا جو دور سے میری کارروائی کا معائنہ کر رہا تھا: "اپنی نانی کو دوڑ کر بلا لا۔"

اپنے کالے کالے سر کی جنبش سے کسی مصیبت کی اطلاع دیتے ہوئے وہ بولا: "بچو، اب بچ کر کہاں جاؤ گے۔"

نانی روتی چلاتی ہوئی دوڑی: "ارے بدنصیب، اب خدا ہی تجھے مار سے بچائے۔"

مگر پھر اس نے سگنوک سے کہا: "بھیا تو نانا سے کچھ نہ کہیو، خدا کوئی ایسی تدبیر کرے گا کہ ان کی نظر چادر پر نہ پڑے گی۔"

سگنوک نے اپنے رنگ برنگ پیش بند میں ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا: "میں؟ مجھے کیا پڑی ہے۔ ہو سکے تو ساشا کا منہ بند کرو۔ اس کی زبان لمبی ہے۔"

سینچر کو میری طلبی باورچی خانے میں ہوئی، جہاں کامل خاموشی اور تاریکی کا تسلط تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ سب دروازے بند تھے اور برسات کی شام کا کُہر ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں ٹپاٹپ گر رہی تھیں۔ تندور کے آگے چھوٹے سے تخت پر سگنوک خلاف عادت منہ بنائے بیٹھا تھا۔ نانا پانی کی بالٹی سے کئی لمبی لمبی بیدیں نکال کر انھیں ناپ رہے تھے اور کبھی کبھی انھیں ہوا میں گھماتے تھے تو شائیں شائیں کی صدا سے کمرا گونج اُٹھتا تھا۔ نانی الگ کھڑی ہوئی ناس سڑک کر بڑبڑا رہی تھی:

"ظالم آج تو تیری مراد بر آئی"

ساشا جاکوف بیچ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی آنکھوں کو مل مل کر کسی بوڑھے فقیر کی طرح گڑگڑا رہا تھا، "خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دیجیے"

کرسی کے آزو بازو ماموں مائیکل کے دونوں بچے "بُت بنے کھڑے تھے۔

ایک بھیگی ہوئی بید کو شنشناتے ہوئے نانا نے کہا: "جب میں تمھیں ٹھونک چکوں گا تو معاف کر دوں گا . . . . . اچھا، اب اپنا پائجامہ اُتار دو"

بڈھا بہت اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز، نانی کی بے چین ہچر مچر اور ساشا کی کرسی کی چرچراہٹ ——— کوئی بھی چیز اس موبت کے سکوت کو نہ توڑ سکی جو اندھیری چھت کے نیچے اُس تنگ سی کوٹھری پر چھایا ہوا تھا۔

ساشا نے اپنا پائجامہ گھٹنوں تک اُتار دیا اور اسے ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے لڑکھڑاتا ہُوا بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کی یہ حالت عبرتناک تھی اور میں بھی اپنے پیروں کی تھرتھری محسوس کر رہا تھا۔

وہ بینچ پر اوندھا لیٹ گیا اور سگنوک نے ایک چوڑی سی تولیے سے اس کی گردن اور ہاتھ باندھ دیئے۔ پھر جُھک کر اپنے سیاہ ہاتھوں سے اس کے پانْو جکڑ لیے۔

نانا نے مجھے پُکارا: "الکسی یہاں آ! اور قریب آ! کیا تو بہرا ہو گیا ہی؟...... اب دیکھ کہ مرمّت کیسی ہوتی ہی!"

ننگے جسم پر اس نے بید کا ایک ہلکا ہاتھ رسید کیا اور ساشا مجروح جانور کی طرح چیخ اُٹھا۔

"ہشت!" نانا نے کہا! "یہ کیا ہی...... آٹے دال کا بھاؤ تو اب معلوم ہوگا"

یہ کہہ کر اس نے اُسے تابڑتوڑ اتنا پیٹا کہ جسم نیلا پیلا ہوگیا اور جگہ جگہ سُرخ چکتّے پڑ گئے۔ میرے بھائی کی گھگی سی بندھ گئی تھی۔ نانا ہر وار کے ساتھ پوچھتے جاتے تھے: "اب مزا ملا؟ کیسا لگ رہا ہی! یہ ہی انگشتانے کا بدلا!"

جب وہ ہاتھ اُٹھاتا تھا میرا دل بھی اوپر اُچھل آتا تھا اور ہاتھ کے گرتے ہی بیٹھ جاتا تھا۔

ساشا نے ایک دل خراش آہ بھر کر کہا: "اب کبھی نہیں کروں گا! کیا میں نے آپ کو میز کی چادر کا قصّہ نہیں بتایا تھا؟"

نانا نے اس اطمینان سے، گویا وہ انجیل پڑھ رہا ہو، جواب دیا:

"چغل خوری کوئی نیک کام نہیں۔ جاسوس کو پہلے سزا ملنی چاہیے۔ اس لیے یہ لے میز کی چادر کا صلہ!"

نانی مجھ سے لپٹ گئی اور میرا ہاتھ تھام کر چلّائی: "میں الکسی کو ہرگز نہ پٹنے دوں گی۔ بھیڑیے کہیں کے! تو اسے چھو کر دیکھ" اور وہ دروازہ بھڑ بھڑاتی ہوئی پکار اٹھی: "ورشکا، اری ورشکا!"

نانا اس پر جھپٹا اور ایسا دھکّا مارا کہ وہ گر پڑی اور مجھے کھینچ کر بینچ کی طرف لے چلا۔ میں اسے مکّے مارنے لگا۔ اس کی ڈاڑھی بھی نوچی اور اس کی انگلیوں میں اپنے دانت پیوست کر دیے۔ وہ ممیا اٹھا اور مجھے گویا شکنجے میں پکڑ لیا۔ بالآخر بنچ پر ٹیک کر اس نے میرے منہ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ میں اس کی وحشت ناک چیخ کو کبھی نہ بھولوں گا: "اسے باندھو! میں آج اس کا خون پی کر رہوں گا" اور نہ میں اپنی ماں کے زرد چہرے اور خوف زدہ آنکھوں کو بھولوں گا جب وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور دردناک انداز میں بولی: "ابّا! لِلّٰہ، اسے نہ ماریئے!۔ اسے مجھے دے دیجیے"

. . . . . . . . . .

نانا نے مجھے اتنا پیٹا کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ میں کئی روز بیمار رہا اور ایک چوڑے سے پلنگ پر اوندھا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک روشن دان تھا اور ایک چراغ کونے میں بی بی مریم کے شہ نشین کے آگے شب و روز جلا کرتا تھا۔

اس غم آگیں زمانے نے میری زندگی کی کایا پلٹ کردی۔ میری طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہوگیا اور میں خود اپنے میں ایک

حیرت انگیز تغیر محسوس کرنے لگا۔ میرے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا اور میں اپنے اور ان کے دُکھ درد کا اتنا خیال کرنے لگا گویا میرے دل کو چیر کر کسی نے اُس میں سوز و غم کا جہان بسادیا ہے۔

اس وجہ سے مجھے اپنی نانی اور ماں کو جھگڑتے دیکھ کر اور بھی افسوس ہوا۔ اس وقت تنگ سی کوٹھری میں نانی بہت بھاری بھرکم لگنے لگی اور غصّے میں امّاں کو کونے میں دبوچ کر چلّانے لگی:

"تونے اسے چھین کیوں نہیں لیا؟"

"میں ڈر گئی تھی۔"

"ایسی تُندرو توانا ہوتے ہوئے بھی! ورنسکا تجھے شرم آنا چاہیے۔ بوڑھی ہو کر بھی میں کسی سے نہیں دبتی۔ تُف ہے تجھ پر!"

"امّاں، جانے بھی دو۔ میں اس دانتا کلکل سے تنگ آگئی ہوں"

"نہیں، ساری بات یہ ہے کہ تو اسے نہیں چاہتی۔ تجھے اس غریب یتیم کا کوئی خیال نہیں۔"

میری ماں نے اُداسی سے کہا: "میں زندگی بھر یتیم رہی ہوں۔"

اس کے بعد وہ دونوں ایک صندوق پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہیں۔ پھر میری ماں نے کہا: "الکسی کا خیال نہ ہوتا تو میں اس گھر میں دم بھر نہ ٹھہرتی۔ امّاں میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

نانی نے بلک کر کہا: "ہائے میری دُلاری۔ ہائے میری آنکھوں کی پتلی!" یہ سب باتیں مجھے یاد رہیں۔ ماں کمزور تھی اور دوسرے دل

کی طرح وہ بھی نانا سے ڈرتی تھی اور میں اسے وہ گھر چھوڑنے سے روک رہا تھا جس کا قیام اس کے لیے ناممکن تھا۔ یہ میری سیہ بختی نہیں تو کیا تھی؟ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میری ماں یک بیک غائب ہوگئی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نانا جان گویا چھپّر پھاڑ کر ٹپک پڑے اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنے سرد ہاتھوں سے میرا سر سہلانے لگے:
"کیوں حضرت کیا حال ہے؟ آؤ بھی منہ نہ بناؤ۔ بولو، اب کیا کہتا ہے؟"
جی تو بہت چاہا کہ بڈھے کے ایک لات جاؤں لیکن پیر سرکانے سے بھی درد ہوتا تھا۔ اس کا سر جو اس وقت زیادہ مٹیالا تھا، بے چینی سے اِدھر اُدھر ہل رہا تھا۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیوار میں کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک سیب، سرخ انگور کا گچھّا، شکر کا ایک سینگ اور میٹھی روٹی کی ایک ٹکری نکالی۔ اور انھیں تکیے کے پاس ٹھیک میری ناک کے نیچے رکھ دیا۔
"اب تو خوش ہوا۔ یہ تیرا انعام ہے۔"
جھک کر اس نے پیشانی پر مجھے بوسہ دیا۔ پھر میرے سر کو اپنے بے رحم ہاتھوں سے —— جن کے ٹیڑھے میڑھے ناخون پیلے پڑ گئے تھے —— تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا: "یار، میں نے بھی تمھاری ساری اکڑ نکال دی۔ تم بہت بوکھلائے، مجھے نوچا کھسوٹا اور پھر میں بھی آپے سے باہر ہوگیا۔ ضرورت سے زیادہ سزا ملنے کی وجہ سے تمھیں کوئی خاص نقصان تو نہ ہوگا۔ آئندہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اگر تمھیں کوئی اپنا سگا مارے تو ہرگز بُرا نہ مانو۔ یہ گویا تمھاری تعلیم کا ایک جُز ہے۔ اگر

کوئی غیر ہاتھ لگاتے تو دوسری بات ہے، لیکن اپنوں کی مار کا خیال نہیں کرتے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کبھی پٹیا نہیں گیا؟ تم خواب میں بھی قیاس نہیں کر سکتے کہ کس کس طرح میری چمڑی اُدھیڑی جاتی تھی! - اس بے رحمی سے میری گوشمالی ہوئی ہے کہ اللہ میاں بھی اسے دیکھ کر رو پڑے ہوں گے اور اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ . . . . . میں جو ایک بے نوا یتیم تھا۔ ایک مفلس بیوہ کا بیٹا تھا، آج اس مرتبہ کو پہنچا کہ ایک کارخانے کا مالک اور اُستاد کاری گر ہوں"

اپنے پُر شکن اور چُست چالاک جسم کو میری طرف جُھکا کر وہ اپنے بچپن کا قصّہ مجھے سُنانے لگا۔ اس کی سبز آنکھیں چمک رہی تھیں اور جب اس کی تیز آواز میرے منہ پر پُھنکار مارتی تھی تو اس کے سنہرے بال تن کر کھڑے ہو جاتے تھے: "تم اسٹیم پر بیٹھ کر یہاں آئے ہو... بھاپ تمھیں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے پر پہنچا سکتی ہے۔ لیکن جب میں کم عمر تھا تو تنِ تنہا اس دریا پر کشتی رانی کرتا تھا۔ کبھی کشتی کنارے باندھ کر چٹانوں پر بھاگتے ہوئے کہیں جانا ہوتا تھا۔ صبح سے شام تک پتوار میرے ہاتھ میں ہوتی تھی اور سورج میرے سر پر ایسی آگ برساتا تھا کہ بھیجا اندر ہی اندر کھولنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے تین تین مصیبتیں برداشت کرنی ہوتی تھیں . . . . . بند بند میں درد ہوتا تھا اور رستہ نہیں سوجھتا تھا پھر بھی کسی نہ کسی طرح سفر طے کرنا ہی ہوتا تھا۔ اوہ اولیشا! اُس زمانے کا ذکر میں تجھ سے کیا کروں . . . .

کھیتے کھیتے پتوار میرے ہاتھ سے پھسل پڑتی تھی اور میں منہ کے بل گر پڑتا تھا۔ پھر میں تازہ دم ہو کر اُٹھتا تھا۔ اگر میں تھوڑی دیر آرام

نہ کروں تو یقیناً مرجاؤں۔

خدا اور حضرت عیسیٰ گواہ ہیں کہ میں نے ایسی ہی زندگی بسر کی ہے۔ اس طرح دریائے وولگا کو میں نے اس کے دہانے سے دہانے تک تین تین مرتبہ چھان مارا اور ہزاروں میل کا دھاوا مار آیا۔ چار سال میں میں نے اپنے مالک کو بتایا کہ میں کس مٹّی کا بنا ہوں۔ وہ بھی مان گیا اور مجھے آزاد ملّاح بنا دیا۔"

یہ بیان سُنتے سُنتے مجھے محسوس ہوا کہ وہ بادل کی طرح وسیع ہوگیا ہے۔ اور کوئی نحیف و نزار بوڑھا نہیں بلکہ عظیم الشان جن ہے۔ کیا وہ بڑا سا بجرا لیے ہوئے اکیلا ندی پار نہیں کیا کرتا تھا؟

جوش میں آکر وہ پلنگ سے اُچھل پڑتا تھا اور بتاتا تھا کہ برگی کس طرح بجرا کھیتے تھے اور پانی کس طرح نکالا کرتے تھے۔ اونچی آواز میں وہ ان کے گیت کے چند بند سنانے لگتا تھا۔ میری حیرت کو دوچند کرکے وہ بڑی پھرتی سے پھر پلنگ پر اُچک آیا اور اپنے قصّے کو خستہ مگر اثر افزا آواز میں یوں جاری رکھا: "اولیشا، کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ گرمی کی کسی شام کو ہم پہاڑیوں کے دامن کے قریب لنگر ڈال دیتے تھے۔ بے فکری سے کنارے بیٹھ کر ہم کھانا پکاتے تھے اور پہاڑی ملّاح آپس میں مل کر گانے لگتے تھے۔ تان چھڑتے ہی سب لوگ الاپنے لگتے تھے۔ ان کی آواز جسم میں تھرتھری ڈال دیتی تھی اور گمان ہوتا تھا کہ دریا گھوڑے کی طرح بھاگا جا رہا ہے اور بادلوں کی طرح اوپر اُٹھ رہا ہے۔ اس موقع پر چھوٹی موٹی تکلیفیں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ گانے میں ایسے مگن ہو جاتے تھے کہ ہنڈیا اُبل جاتی تھی

پھر تو پکانے والے پر سب یک بارگی بگڑ پڑتے تھے: "اپنا فرض نہ بھولو، پھر چاہے ننگے ناچو۔"

کئی مرتبہ کاری گر نانا کو بلانے آئے لیکن میں التجا کرتا رہا کہ وہ نہ جائے اور وہ بھی ہنس کر ان سے کہہ دیتا تھا: "ذرا دیر میں آیا۔" وہ مجھے اُس وقت تک قصّے سُناتا رہا جب تک شام کا دُھندلکا نہ پھیل گیا۔ پھر وہ مجھے بڑی محبّت سے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ نہ وہ بد طینت ہے نہ سنگ دل۔ یہ سوچ کر مجھے رونا آنے لگا کہ اسی شخص نے میری کُندی کی تھی۔ اس حادثہ کو میں کسی طرح نہ بھول سکا۔

نانا کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی میری مزاج پُرسی کو آنے لگے اور صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی پلنگ پر بیٹھا مجھے بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سے میں بسا اوقات بیزار بھی ہو جاتا تھا۔

یوں زیادہ آنا جانا تو نانی کا رہتا تھا، جو اسی پلنگ پر سوتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں مجھے سب سے زیادہ سگنوک نے متاثر کیا اس کا جسم گٹھیلا، سینہ چوڑا، بال چکنے اور گھنگھرالے تھے۔ گھنی بھووں کے نیچے اس کی آنکھیں مسکراتی رہتی تھیں اور موچھوں کے نیچے سفید دانت چمکتے تھے۔ وہ شام کو اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس ہو کر میرے پاس آتا تھا۔ اس کے جوتے باجا سا بجاتے تھے۔ سنہری دھاری کی قمیص سے روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں پھوٹ نکلتی تھیں۔

اپنی آستین کہنی تک اُلٹ کر اس نے کہا: "یہ دیکھو!" اس کے ہاتھ پر لال لال اول اُبھر آئے تھے۔ "دیکھو، یہ حصّہ کتنا سوج گیا ہے۔ کل تو

اس میں بلا کا درد تھا۔ جب بڑے میاں کو غصہ آیا اور میں سمجھ گیا کہ اب وہ تمھیں نہ چھوڑیں گے تو میں نے یہ سوچ کر ہاتھ بیچ میں ڈال دیا کہ بید ٹوٹ جائے گی اور قبل اس کے کہ وہ دوسری اٹھا لائیں تمھاری نانی یا اماں بیچ بچاؤ کر دیں گی۔ . . . ایسے کھیل میں نے بہت کھیلے ہیں۔"

وہ جی کھول کر ہنسا اور پھر اپنی سوجی ہوئی کلائی دیکھ کر بولا: "مجھے تم پر بہت رحم آیا۔ کیسے شرم کی بات تھی۔ لیکن وہ تمھاری مرمّت پر تُل ہی گئے تھے۔" گھوڑے کی طرح ہنہناتے اور سر ہلاتے ہوئے وہ اُس معرکہ کی داستان سُنانے لگا اور اس کی طفلانہ سادگی نے مجھے مسحور کر لیا۔ میں نے کہا کہ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ اس کے جواب میں اس نے ایسے خلوص سے جو ہنوز میرے دل پر نقش ہے کہا: "تم بھی مجھے بہت پسند ہو۔ اگر میں تمھیں چاہتا نہ ہوتا تو یہ چوٹ کیوں کھاتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ہر ایرے غیرے کے لیے ہاتھ تڑواتا پھروں گا؟ میں احمق نہیں ہوں۔"

بعد ازاں اس نے دروازے پر نظر رکھتے ہوئے کان میں مجھے یہ ہدایت کی: "آیندہ وہ جب کبھی تمھیں پیٹیں تو نہ بھاگنے کی کوشش کرو نہ اسے روکنے کی۔ روکو تو چوٹ کا بار دوگنا ہو جاتا ہے۔ اگر تم حجت و تکرار نہ کرو گے تو سستے چھوٹ جاؤ گے۔ جسم کو چکا لو اور تیور نہ چڑھاؤ۔ میری نصیحت حرف بہ حرف یاد رکھنا لاکھ روپے کی سیکھ دے رہا ہوں۔"

"لیکن اب وہ مجھے ہرگز نہ پیٹیں گے" میں کہہ اُٹھا۔

"کیوں نہیں۔ وہ تمھیں ایک دو نہیں بلکہ درجنوں مرتبہ پیٹیں گے۔" سگنوک نے نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"اور اس کی وجہ؟"

"وجہ یہ کہ بڑے میاں تمھاری گھات میں رہتے ہیں۔"

سگنوک نے ایک اور نصیحت کی: "بید کا ہاتھ سیدھا آتا ہے۔ اگر تم چپ چاپ پڑے رہوگے تو وہ بید اوپر نہ اٹھائے گا کہ کہیں تمھاری کھال نہ اُدھڑ جائے۔ اب سمجھ میں آیا؟ اپنا جسم بید اور ہاتھ کی طرف اُچکا دوگے تو چوٹ ہلکی آئے گی۔" کن انکھیوں سے دیکھتے ہوتے جاتے جاتے وہ یہ بھی سُنا گیا: "اس معاملے میں میں پولیس والوں کا بھی چچا ہوں۔ لڑکے، ننگی پیٹھ پر میں نے اتنے کوڑے کھائے ہیں کہ کھال تک کھنچ آئی ہے۔"

## باب ۳

اچھا ہونے کے بعد مجھے معلوم ہؤا کہ اس گھر میں سگنوک کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ نانا اپنے بیٹوں سے زیادہ اس کا لحاظ کرتے تھے اور اس کی پیٹھ پیچھے اپنی آنکھیں بند کرکے اور سر ہلا کر کہتے تھے ''سگنوک ہوشیار کاریگر ہے۔ میری بات یاد رکھو کہ وہ ترقی کرے گا اور ایک روز بڑا آدمی ہوگا۔''

میرے ماموں بھی سگنوک سے رکھ رکھاؤ برتتے تھے اور اس سے ویسے مذاق نہ کرتے تھے جن کا ''تختۂ مشق'' گری گوری بنا کرتا تھا اس بیچارے سے ہر روز کوئی نہ کوئی اوچھا اور گندا مذاق کیا جاتا تھا۔ کبھی تو وہ لوگ اس کی قینچی کا دستہ گرم کر دیتے تھے کبھی اس کی کرسی کی گدّی میں سوئی چبھو دیتے تھے اور کبھی ایک ہی رنگ کے کپڑے اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ نیم بینائی کی وجہ سے وہ انھیں ایک ساتھ سیتا چلا جاتا تھا اور انجام کار نانا کی گالیاں کھاتا تھا۔

ایک روز اسے کھانا کھاتے ہی کرسی پر نیند آگئی، تو لوگوں نے اس کا چہرا نیل سے رنگ دیا اور وہ دیر تک اسی مضحکہ خیز اور دہشت انگیز ہیئت میں باہر گھومتا رہا۔ اس کی رنگین ناک بھوری داڑھی میں چونچ کی طرح لٹک رہی تھی اور تارِ نظر عینک سے ہوکر اپنی راہ ٹٹول رہا تھا۔

ان کے پاس اس قسم کے مذاقوں کا لاتناہی ذخیرہ تھا۔ مگر گری گوری خاموشی سے ان سب کو برداشت کرلیتا تھا۔ وہ جی ہی جی میں اینٹھ کر رہ جاتا تھا اور کسی چیز کو چھونے سے پہلے اپنی انگلیاں کو تھوک سے گیلا کرلیتا تھا۔ اسے اس کی ایسی عادت پڑگئی کہ کھاتے وقت انگلی پر تھوک لگائے بغیر چھری کانٹے تک کو نہ چھوتا تھا اور بچے یہ دیکھ کر لوٹ پوٹ جاتے تھے۔ جب اُسے کوئی دُکھ ہوتا تو اس کے چوڑے سے چہرے پر جھرّیوں کی ایک لہر اُٹھتی جو اس کی بھووں پر سکڑن اور ماتھے پر شکن ڈال کر گنجی کھوپڑی میں خدا جانے کہاں غایب ہوجاتی تھی۔

یہ یاد نہیں کہ اپنے بیٹوں کے اس کھیل کو نانا کس نظر سے دیکھتے تھے لیکن نانی انھیں مُکّا دکھا کر اکثر چیخا کرتی تھی:

"بے حیا، بے رحم جانور۔"

لیکن میرے ماموں سگنوک کی غیر حاضری میں اس کی بُرائی کیا کرتے تھے وہ اس پر پھبتی کستے، اس کے کام پر نکتہ چینی کرتے اور اسے چور ڈاکو کہا کرتے تھے۔

میں نے نانی سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ اس نے حسبِ عادت ایسا سُلجھا ہوا جواب دیا کہ سارا معاملہ صاف ہوگیا:

"ان میں سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ جب وہ اپنا کارخانہ کھولے تو سگنوک کو ساتھ لے جائے۔ اسی لیے وہ ایک دوسرے سے اس کی بُرائی کرتے ہیں۔ زبان سے تو وہ اسے اناڑی کاریگر کہتے ہیں لیکن دل میں ایسا نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی مکّاری ہے۔ وہ ڈرتے

ہیں کہ سگنوک کسی کے ساتھ نہ جائے گا۔ نانا کے ساتھ کام کرتا رہے گا اور نانا اسے لے کر کہیں نیا کارخانہ نہ قایم کردیں جس سے اُن سب کی بدھیا بیٹھ جائے گی۔ اب تم سمجھے؟" اس نے ہنس کر کہا: "یہ سب بڑے سیاہ قلب ہیں اور خدا کا بھی خوف نہیں کھاتے۔ نانا ان کی چالاکی کو خوب جانتے ہیں اور انھیں یہ کہہ کر جلایا کرتے ہیں کہ میں سگنوک کو فوجی خدمت سے استثنا دلا دوں گا کیوں کہ اس کے بغیر میرا کام نہیں چل سکتا۔ یہ سن کر وہ آگ بگولا ہو جاتے کیوں کہ فوجی خدمت سے بریت حاصل کرنے کے لیے خاصی رقم خرچ کرنی ہوتی ہے۔

اب میں برابر نانی کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ سونے سے پہلے وہ مجھے پریوں کی کہانی یا اپنی زندگی کے احوال سُنایا کرتی۔ یہ بھی کچھ کم دل چسپ نہ تھے۔ لیکن خانگی معاملات مثلاً جائداد کی تقسیم یا کسی نے گھر کی خرید— کا ذکر وہ کسی اجنبی یا پڑوسی کی طرح کرتی تھی، گھر کی مالکن کی حیثیت سے نہیں۔

اسی نے مجھے بتایا کہ سگنوک بچپن سے یتیم ہے۔ موسم بہار میں اوس سے بھیگی ہوئی ایک رات کو وہ برساتی میں پڑا ہوا پایا گیا نانی نے پُر اسرار اور اداس آواز میں سُنایا: "وہ سردی سے ایسا اکڑا ہوا تھا کہ رو تک نہ سکتا تھا۔"

"نانی، لوگ اپنے بچّوں کو پھینک کیوں دیتے ہیں؟"

"ماں یا تو اسے دودھ نہیں پلا سکتی یا اسے کھلانے کو کچھ نہیں ہوتا۔ جب وہ سنتی ہے کہ بستی میں کسی کا بچہ مر گیا ہے تو وہ چپکے سے اپنا بچّہ اس کی دہلیز پہ چھوڑ آتی ہے۔"

سر کھجاتے ہوئے لمبی سانس لے کر، در و دیوار کو گھورتے ہوتے وہ کہنے لگی: "او لیشا، اصل وجہ غربت ہے اور یہ غربت ایسی کہ اس کا ذکر بھی بُرا سمجھا جاتا ہے کیوں کہ بِن بیاہی لڑکی کے اگر بچّہ ہوجائے تو لوگ اس پر تھڑی تھڑی کرنے لگیں۔ تیرے نانا اسے ٹھکانے لے جانا چاہتے تھے، مگر میں نے کہا کہ ہماری جو اولاد اللہ کو پیاری ہوئی یہ اس کا بدل ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں اٹھارہ بچّوں کی ماں تھی۔ اگر سب جیتے ہوتے تو پورا محلّہ بس جاتا —— اٹھارہ نئے گھر آباد ہوتے!۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری شادی ہوئی اور اُس وقت تک میرے پندرہ بچّے ہوچکے تھے۔ لیکن اللہ کو میرے جگر پارے ایسے پیارے تھے کہ ایک ایک کرکے سب کو بُلا لیا —— میرے سب دودھ پیتے بچّے رضوان بن گئے۔ مجھے اس صدمے سے دُکھ بھی ہوا اور سُکھ بھی۔"

پلنگ کی پائنتی رات کے لباس میں بال کھولے ہوئے وہ اُس بھالو کی طرح معلوم ہوتی تھی جسے ایک مداری ہمارے آنگن میں لایا تھا۔ اپنے سفید و شفاف سینے پر صلیب کا نشان بناکر وہ ہنسنے لگی، کیوں کہ اپنی کسی مصیبت کو بھی وہ زیادہ اہمیت نہ دیتی تھی: "اچھا ہوا کہ وہ سب سدھارے۔ لیکن میرے لیے ان کی جُدائی جان لیوا تھی۔ اس لیے سگنوک کو پاکر میں بہت خوش ہوئی تھی۔ . . . . . . تاہم اپنے بچّوں کی یاد اب بھی میرے زخموں کو کرید دیتی ہے۔ خیر ہم نے اس کی پرورش کی بپتسمہ دیا اور اب تک وہ ہمارا شریکِ حال ہے۔ پہلے میں اسے "جھینگر" کہہ کر

پکارتی تھی، کیوں کہ در اصل کبھی کبھی وہ جھنکار اُٹھتا تھا اور کمروں میں جھینگر کی طرح منمناتا پھرتا تھا ........ وہ بڑا شریف ہی، تم اسے چاہا کرو۔"

میں سگنوک کو چاہتا تھا اور دل سے پسند کرتا تھا۔ سنیچر کو جب نانا بچّوں کو ہفتے بھر کے گناہوں کی سزا دے کر کلیسا چلے جاتے تو ہم لوگ باورچی خانے میں بڑے مزے سے وقت گزارتے تھے۔ سگنوک تندور سے کئی تل چٹے پکڑ کر اُن کے دھاگے کی لگام لگاتا تھا۔ پھر وہ پٹھّے کی گاڑی میں ان سیاہ گھوڑوں کی دولمبی قطاروں کو جوتتا تھا۔ چکنی چکنی پیلی میز پر یہ گھوڑے بڑی شان سے چلتے تھے۔ سگنوک لکڑی کے تنکے سے کوڑے کا کام لیتا اور انھیں کو بچتے ہوئے کہتا: "دیکھو، بڑے پادری کی بگھّی جا رہی ہی!" ایک تل چٹے کی پیٹھ پر کاغذ چپکا کر وہ اسے گاڑی کے پیچھے چلاتا: "ہم تھیلا تو بھول ہی آئے تھے۔ بیچارا چھوٹا پادری اسے لاد کر لے جا رہا ہی۔ چل، بے چل!"

دوسرے تل چٹے کی ٹانگ میں وہ روئی کا پھاہا باندھ دیتا اور جب وہ لنگڑا کر اور سر جھکا کر چلتا تو سگنوک تالی بجا کر چلّاتا: "یہ دیکھو منجھلے پادری کو جو شراب کو جو شراب کی بھٹّی سے نکل کر گرجا گھر جا رہا ہی!"

آخر میں وہ ہمیں جیب سے نکال کر ایک چوہا دکھاتا تھا جو اس کے حکم پر دو ٹانگوں کے بل چلنے لگتا تھا۔ اپنی لمبی دُم سے جھاڑو دیتے ہوتے اور شیشے کی سی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے وہ

نہایت مضحکہ خیز لگتا تھا۔

سگنوک بڑی سنجیدگی سے کہتا تھا: "چوہے بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ اس گھر کا ہم زاد ان کا جگری دوست ہے۔ جو چوہوں کی خاطر کرے گا، ہم زاد ان کی مُراد بر لائے گا۔"

اسے تاش اور سکوّں کی شعبدہ بازی میں بھی دخل تھا۔ وہ بچوّں سے بھی زیادہ جھینپتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم سب اور اُس میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک مرتبہ تاش کے کھیل میں سب نے اُسے چور بنانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ وہ پے در پے ہارتا گیا اور سخت برہم ہُوا۔ ناک بھوں چڑھا کر اس نے کھیلنے سے انکار کر دیا اور بعد میں مجھ سے شکایت کرنے لگا: "پہلے کی لگی بدی تھی۔ وہ سب اشارے کر رہے تھے اور میز کے نیچے سے ایک دوسرے کو پتّے بانٹ رہے تھے۔ یہ بھی کوئی کھیل میں کھیل ہے۔ اگر وہ دھاندلی پر آمادہ ہیں تو میں بھی کوئی ایسا انیلا نہیں ہوں۔" یاد رکھیے کہ اس کی عمر ۱۹ سال کی ہو چکی تھی اور وہ اکیلا ہم چاروں سے بڑا تھا۔

میں تیوہاروں کی شام کی اُن صحبتوں کو کبھی نہ بھولوں گا۔ نانا اور مائیکل ماموں اپنے دوستوں سے ملنے چلے جاتے تھے۔ اِدھر میلا کچیلا جاکوف اپنا ستار لیے داخل ہوتا تھا اُدھر نانی جائے کے ساتھ بھانت بھانت کے پکوانوں کی تیاری میں مصروف ہو جاتی تھی اور ایک چوڑی سی بوتل میں، جس کے نچلے حصّے پر بڑی خوبصورتی سے سُرخ پھول ڈھلے ہوئے تھے، ووڈکا بھر کر میز پر

رکھ دیتی تھی۔ ان موقعوں پر سگنوک زرق برق لباس میں نظر آتا تھا اپنی رنگین عینک چمکاتے ہوئے گری گوری پنجوں کے بل کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ ٹماٹر کی طرح گول مٹول اور سُرخ فام یوجنیا اپنی پتلی آواز اور چور آنکھیں لیے ہوئے اس کے پیچھے ہوتی تھی اور بھی کئی رنگ برنگے جانور آتے تھے جن میں سے کوئی کُدال سے ملتا تھا تو کوئی پھاوڑے سے۔ وہ سب کھانے پر یوں ٹوٹ پڑتے تھے کہ ان کے منہ سے آواز بھی نکلتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہاں مسرّت اور گرم جوشی کی ایک عجیب سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔

جاکوف ستار پر کسی عشقیہ گیت کا سرگم جما کر بار بار یہ جملہ دُہراتا جاتا تھا: "اب شروع کریں؟"

اپنے کاسۂ سر کو ہلا کر اور بطخ کی سی گردن ہلا کر وہ ستار پر جھک پڑتا تھا۔ اس کے لاپروا چہرے پر ایک خواب آگیں کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی جذبہ پوش اور حیا پرور آنکھوں کے آگے کہر کی چادر سی پڑ جاتی تھی۔ تاروں کو بڑی نزاکت سے چھیڑ کر پہلے وہ کوئی بے ربط سی راگنی شروع کرتا تھا۔ بجاتے بجاتے مست ہو کر وہ بلا ارادہ اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی موسیقی کا اشارہ تھا کہ ہر طرف خاموشی ہو۔ دُور سے آتی ہوئی پہاڑی ندی کی طرح وہ جھپٹتی تھی اور دل کی ہر رگ سے ٹکرا کر اس میں اُداسی اور بےچینی کا جھرنا سا بہا دیتی تھی یہ موسیقی ہم سب کو غم آشنا بنا دیتی اور ایک لمحہ کے لیے ہر بوڑھا بچپن کی یاد میں کھو جاتا تھا۔ ہم سب بے حرکت بیٹھے ہوتے تھے اور خواب کے سکوت میں محو ہو جاتے تھے۔ خصوصًا ساشا کا ہر بنِ مُوگوش

برآواز ہوجاتا تھا۔ وہ اپنے چچا کے پاس تن کر بیٹھا ہوا منہ کھولے ستار کو تاکتا رہتا تھا اور خوشی کے مارے سُبکیاں سی بھرنے لگتا تھا۔ باقی سب یوں دم مارے بیٹھے رہتے تھے گویا وہ شل ہوگئے ہیں یا مسحور ہوگئے ہیں۔ صرف سماور کی مسلسل سرسراہٹ کی آواز سُنائی پڑتی تھی لیکن وہ ستار کی فریاد میں خلل انداز نہ ہوتی تھی۔

خزاں کی شب کی سیاہی کو دو چھوٹے چھوٹے جھروکوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی کسی قدر اُجال دیتی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ان جھروکوں کے پٹ پر تھاپ مار دیتا تھا۔ دو موم بتیوں کی بیلی لو بھالوں کی نوک کی طرح، میز پر ٹمٹما رہی تھی۔

جاکوف کا جسم یوں اکڑ گیا اور دانت یوں بند ہوگئے گویا وہ گہری نیند میں ہو۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں جیسے جان سی پڑ گئی تھی اس کے داہنے ہاتھ کی مُڑی ہوئی اُنگلیاں ایک سرے پر مجروح پرندوں کی مانند تڑپ رہی تھیں اور بایاں پنجا بلا کی تیزی سے یہاں وہاں ناچ رہا تھا۔

جب وہ نشے میں متوالا ہوجاتا۔ تو نہایت کرخت آواز میں یہ بے سر پیر کا گیت الاپا کرتا تھا:

ای کاش میں کُتّا ہوتا تو صبح و مسا بس روتا
ہو! تھک کر ہوں میں چورا اور دنیا ہے ایک جھنجھٹ!
سڑکوں پہ جوگن جائیں گھر کوّے بیٹھے گائیں
تندور پہ جھینگر بولے کونے کونے میں ڈولے
اوف! تل چٹے یہ نٹ کھٹ یہ دنیا ہے ایک جھنجھٹ

ایک بھک منگے کی جھولی — اس کے بھائی نے لے لی
لڑتے ہیں دونوں کھٹ پٹ — یہ دنیا ہے ایک جھنجھٹ!

مجھے اس گیت سے انتہائی نفرت تھی اور جب جاکوف بھک منگے کی جھولی تک پہنچتا تھا تو میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔

موسیقی کا اثر اوروں کی طرح سگنوک پر بھی ہوتا تھا۔ اپنی نیم باز آنکھوں سے کسی نکتہ کو گھورتے ہوئے وہ انگلیوں سے اپنے بالوں کو دیر تک سلجھاتا رہتا تھا۔

کبھی کبھی وہ شکوہ کار انداز میں بول اٹھتا تھا: "اوہ! اگر میری آواز میں رس ہوتا تو میں کیسا اچھا گویا ہوتا۔"

نانی لمبی سانس بھر کر کہتی تھی: "جاکوف! ہمیں زیادہ مغموم نہ کر.......سگنوک، اب تو ناچ شروع کر۔"

اس فرمایش کی فوری تعمیل تو نہ ہوتی تھی لیکن کبھی جاکوف ستار روک کر، اپنی مٹھیاں اس طریقے سے باندھ کر گویا وہ کوئی نامعلوم چیز ابھی زمین پر پھینک دے گا، زور سے چلاتا تھا: "دکھ درد کو گولی مارو! سگنوک آؤ میدان میں!"

جب سگنوک اپنی زرد قمیص کی چُنّت نکالتا ہوا کمرے کے بیچ میں کھڑا ہوتا تھا، تو وہ بڑا تیز و طرّار معلوم ہوتا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا گویا آگ پر چل رہا ہے۔ اس کا سانولا چہرا تمتما جاتا اور وہ شرمیلی آواز میں کہتا تھا: "جاکوف بھیّا اور تیز اور تیز!"

ستار طوفان کی طرح دہلنے لگتا تھا، لوگوں کی ایڑیاں بیک آواز

فرش پر تال دینے لگتی تھیں، برتن ہر طرف جھن جھنانے لگتے تھے اور انگنے میں سگنوک بجلی کی طرح جھپٹتا تھا، پتنگ کی طرح پیچ کھاتا تھا، اپنے بازوؤں کو بادبان کی طرح ہلاتا تھا۔ اس کے پانو اس تیزی سے گردش کرتے تھے کہ بے حرکت سے معلوم ہونے لگتے تھے پھر وہ زمین پر بیٹھ کر اس تیزی سے چکّر کھاتا تھا گویا کوئی زرّیں ابابیل گردش کناں ہو کیوں کہ اس کی ریشمی قمیص اپنی لچک اور پھیلاؤ کے ساتھ ہر سو نور کا ہالہ سا بنا دیتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آتش بہ کف ابھی ہوا میں اُڑ جائے گا۔ خود فراموشی کے عالم میں وہ انتھک ناچتا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ دروازہ کھلا ہو تو یہ ناچتے ناچتے باہر نکل جائے گا۔ اور سڑک سے ہوکر شہر میں، پھر شہر سے پرے کہیں اور —— حدِّ نظر سے دُور کہیں غایب ہو جائے گا۔

"پٹک دو، پٹک دو!" جاکوف نے پیر پٹک کر للکارا اور زور سے سیٹی بجائی۔ پھر اپنی پھٹی ہوئی آواز میں اس نے ایک پُرانی کہاوت الاپنا شروع کی۔

خدا گواہ نہ گر کھیت کی لگی ہو لگام
تو بیوی بچّوں کو ہو دُور سے ہزار سلام

سب لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ پر تالی پیٹتے اور بیچ بیچ میں یوں چیخ اُٹھتے گویا کوئی ان کا کچومر نکال رہا ہو۔ ٹوڑھیل گری گوری آپ اپنی چاند پر چپت لگا کر اس ہنگامے میں شامل ہو گیا۔ میرے شانے پر اپنی نرم نرم ڈاڑھی ڈال کر اس نے بڑی

سنجیدگی سے کہا: "الکسی، تیرا باپ میکسم اگر یہاں ہوتا تو لطف دوبالا ہوجاتا۔ وہ کس قدر ہنس مکھ اور رنگین مزاج تھا۔ تجھے یاد تو ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔"

"نہیں!۔ ایک بار وہ اور تیری نانی ——— اچھا ٹھہرو۔" بانس کی طرح لمتڑنگ وہ کھڑا ہؤا اور نانی کے آگے سر جھکا کر پھٹے ہوئے ڈھول کی سی آواز میں بولا: "اماں، کیا آپ ہماری خاطر ایک بار وہی ناچ ناچیں گی جو آپ نے اپنے داماد کے ساتھ ناچا تھا۔ محفل میں جان پڑجائے گی۔"

نانی نے ہنس کر اور شرما کر کہا: "گری گوری، تو پاگل تو نہیں ہوگیا؟۔ میرے سفید چونڈے پر ناچ کود پھبتا ہے؟ میری ہنسی کرانا چاہتا ہے؟"

لیکن یک بیک وہ لڑکیوں کی طرح اچھلی، اپنے لہنگے کو کھونسا اور اکڑ کر باورچی خانے میں یہاں سے وہاں دوڑ گئی۔ پھر بولی: "ہنسنا ہے تو ہنسو۔ میری جوتی سے!۔ جاکوف، تال نہ بگڑنے پائے۔"

ماموں صاحب سے کہنے کی دیر تھی۔ آنکھیں بند کرکے وہ بڑی نزاکت سے ستار بجانے لگے۔ سگنوک پل بھر چپ کھڑا رہا پھر نانی کے پاس جاکر اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کا احاطہ کرلیا۔ ادھر نانی بازو پھیلائے ابرو پر بل ڈالے اور خلا میں ٹکٹکی لگائے اس خاموشی سے نرت کرنے لگی گویا ہوا میں اڑ رہی ہے۔ مجھے وہ حددرجہ مضحکہ خیز معلوم ہوئی اور میں زور سے ہنس پڑا۔ لیکن گری گوری نے مجھے گھونسا دکھایا اور سب بڈھے غصّے سے میری طرف دیکھنے لگے۔

گرہی گوری نے کہا، "سگنوک، آواز نہ ہونے پائے۔" اس کی تعمیل میں وہ فوراً الگ ہٹ کر دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ ادھر یوجنیا نے اپنی ہتھوتھنی نکال کر سُریلی آواز میں یہ گیت شروع کیا:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ۔۔۔ پر وہ دُکھیا کبھی نہ سوتی ہے
ہر گھڑی کپڑے بیٹھے سیتی ہے ۔۔۔ پیٹ کے صدقے آنکھ کھوتی ہے

یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ نانی ناچ رہی ہے۔ گمان ہوتا تھا کہ کوئی کہانی کہہ رہی ہے۔ وہ بڑی نزاکت سے جنبش کرتی تھی گویا نیند میں کروٹ بدل رہی ہے۔ ہولے ہولے مٹکتی تھی تو اس کا بھاری بدن ہل جاتا تھا اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ کبھی ٹھٹک کر یوں رُک جاتی جیسے کسی چیز سے ڈر گئی ہے اور اس کا چہرا سہم جاتا تھا...... لیکن دفعتاً ایک دل کش تبسّم اسے جگمگا دیتا تھا۔ وہ یوں داہنے دبک جاتی تھی جیسے کسی کو راستہ دے رہی ہو یا کسی سے دامن چھڑا رہی ہو۔ پھر اس کا سر یوں نڈھال ہوجاتا تھا گویا اب وہ مرجائے گی اور پھر یہ محسوس ہوتا کہ وہ کسی کی باتیں کان لگا کر سُن رہی ہے اور خوشی سے کھلی جارہی ہے...... اچانک وہ کوندے کی طرح لپک کر اس تیزی سے چکّر کھانے لگتی کہ محسوس ہوتا کہ اس کا جسم حسین اور قد دراز ہوگیا ہے۔ اس حیرت انگیز تجدیدِ شباب کے موقع پر وہ کیسی من موہنی ہوجاتی تھی! —— ادھر یوجنیا کی چیں چیں جاری رہتی تھی:

گر اتوار کا ہے یہ بانا
ناچنا، گانا اور پیے جانا

ناچ ختم کرکے نانی ساور کے پاس بیٹھ گئی۔ سب نے اس کی تعریف کی اور وہ اپنا جوڑا باندھتی ہوئی بولی: "اجی لبس بھی کرو! تم نے ناچ دیکھا کہاں ہے۔ میرے گانو میں ایک لڑکی تھی ——— بھلا سا نام تھا۔ جب وہ ناچتی تھی تو لوگ خوشی کے مارے رو دیتے تھے۔ اسے ناچتے دیکھنا، ہزار نظاروں کا ایک نظارہ تھا۔ اس کے بعد انسان کوئی ہوس نہ کرتا۔ میں نصیب جلی اس سے کتنا رشک کیا کرتی تھی۔"

یوجینیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "گویّے اور نرت کار دنیا کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔" اور اس نے جھٹ سے حضرت داؤد کا جنگ نامہ شروع کر دیا۔ ادھر جاکوف ماموں نے سگنوف کو گلے لگا کر کہا: "اگر تم شراب خانوں میں ناچو تو لوگوں کے ہوش اُڑ جائیں۔" مگر سگنوک کا گلہ باقی رہا: "کاش میری آواز اچھی ہوتی تو میں بچپن میں ہی گانا شروع کر دیتا، چاہے اس کے لیے مجھے راہب ہی کیوں نہ بننا پڑتا۔"

وہ سب شراب پینے لگے۔ گری گوری کا نمبر سب سے بڑھا ہوا تھا۔ نانی اس کا پیالہ پیہم بھر کر ٹوکتی جاتی: "گری گوری، زیادتی کی تو اندھا پٹ ہو جائے گا۔" مگر وہ یہی کہے جاتا کہ "مجھے ان آنکھوں سے کیا لینا ہے۔ جانا ہے تو جائیں، مجھے کوئی پروا نہیں۔"

گلاس پر گلاس چڑھانے کے باوجود اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ ہر گھونٹ کے ساتھ وہ زیادہ باتونی ہوتا جاتا تھا اور مجھ سے متواتر میرے مرحوم باپ کا ذکر کر رہا تھا: "میرا دوست میکسم بڑا

دریا دل تھا —" نانی نے آہ بھر کر اس کی تائید کی،" خدا بخشے ہیرا تھا ہیرا۔"

یہ سارا نظارہ اس قدر دلچسپ تھا کہ میں مبہوت بیٹھا رہا اور میرے دل پر ایک نازک اور لطیف سی مایوسی چھا گئی کیوں کہ ہم میں خوشی اور غم کے جذبے ایک ساتھ رہتے ہیں اور کسی طرح جدا نہیں کیے جا سکتے۔ وہ کب اور کیسے ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں، اس کی خبر ہمیں کبھی نہیں ہوتی۔

ایک مرتبہ جاکوف ماموں پر نشہ چڑھ گیا۔ وہ اپنی قمیص پھاڑنے لگا اور اپنے گھنگھرالے بالوں، ترشی ہوئی موچھوں اور موٹے ہونٹوں کو نوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ رو رو کر وہ چیخنے لگا: "میں کون ہوں؟ میں یہاں کیوں آیا؟" پھر اپنا سر اور سینہ پیٹ کر وہ ہچکی لیتے ہوئے چلّایا "سیاہ قلب، گنہگار، جہنمی!"

"اوہو، یہ تم نے ٹھیک کہا" گری گوری نے جواب دیا لیکن نانی نے جو خود بھی کچھ کچھ بہک چلی تھی، اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "جاکوف بس کرو، اللہ اپنے بندوں کو نیک راہ دکھاتا ہے۔"

شراب نوشی کے وقت اس کی موہنی بڑھ جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور سیاہی زیادہ شگفتہ ہو جاتی اور سب پر اس کے دل کی گرمی عیاں کر دیتی تھی۔ گرمی سے بوکھلا کر وہ سر سے رومال اتار دیتی اور بہکی ہوئی آواز میں گنگنایا کرتی: "اللہ اللہ زندگی کس قدر پیاری ہے! ۔ ارے لوگو، دیکھو تو سہی کہ دنیا کیسی سہانی ہے۔"

یہ اس کے دل کی صدا تھی ــــــ اور در اصل یہ اس کی زندگی کا فلسفہ تھا۔

اپنے آوارہ مزاج ماموں کے ماتم نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے نانی سے پوچھا کہ وہ اپنا سر کیوں پیٹ رہا ہے، سینہ کیوں کوٹ رہا ہے۔

نانی نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا: "تجھے تو ہر چیز کی ٹوہ رہتی ہے! ذرا صبر کر تو تجھے خود یہ بھید معلوم ہو جائے گا۔"

میرا تجسس بڑھتا گیا اور میں سگنوک سے پوچھنے کے لیے کارخانے پہنچا مگر وہ بھی کچھ بتانے کو تیار نہ تھا۔ گری گوری کو آنکھ مار کر وہ زیرِ لب ہنسا اور یہ کہہ کر ٹال دیا: "بھاگتا ہے یا نہیں۔ زیادہ محبت کی تو ناند میں ڈال کر رنگ میں نہلا دونگا۔"

تندور میں کئی بڑی بڑی ناندیں چُنی گئی تھیں اور گری گوری ایک لمبی سی لکڑی سے انھیں چلاتا جاتا اور بیچ بیچ میں اسے نکال کر پانی کی رنگت دیکھتا جاتا تھا۔ اس کا رنگ برنگا پیش بند پادری کی قبا سے ملتا جلتا تھا اور تیز آنچ اس پر دھوپ چھاؤں کا تماشہ کر رہی تھی۔ ناند میں رنگ بدبدا رہا تھا اور ہر طرف بھاپ کے بادل اُڑ رہے تھے۔ گری گوری نے اپنی دُھند لی اور سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے کے بعد سگنوک سے کہا: "کوئی تمھیں بلا رہا ہے سنتے نہیں۔" اور جب وہ چلا گیا تو گری گوری توتیا کی بوری پر بیٹھ گیا اور مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ گھٹنے پر مجھے بٹھا کر اور ڈاڑھی میرے گال سے بھڑا کر اس نے آہستہ سے کہا: "تمھارا ماموں اپنی بیوی کا

قاتل ہی اور اب ضمیر اس پر ملامت کرتا ہی۔ تم ہر چیز کو سمجھنا چاہتے ہو اور اسی لیے گرڈ بڑا جانتے ہو۔"

گری گوری نانی کی طرح صاف گو تھا، لیکن اس کی باتیں اضطراب کن ہوا کرتی تھیں اور وہ ہر معاملے کی تہ تک پہنچتا تھا چبا چبا کر وہ بولتا گیا: "کس طرح قتل کیا؟ ۔ سنو ۔ دونوں پاس پاس لیٹے ہوئے تھے کہ اس نے پلنگ پوش سے اس کا منہ بند کر دیا اور اسے مارنا شروع کیا ۔ وہ خود نہیں جانتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔"

اس دوران میں سگنوک اپنے دامن میں آنگن سے کوئی چیز بھر لایا تھا اور آگ کے آگے بیٹھا ہاتھ سینک رہا تھا ۔ لیکن اس کی موجودگی میں مطلق پروا نہ کر کے مستری کہتا گیا: "شاید وجہ یہ تھی کہ وہ ان ذاتِ شریف سے زیادہ نیک تھی اور یہ دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتا تھا ۔ لڑکے، تیرے نانا کا قبیلہ بھلے مانسوں کے حق میں بڑا بُرا ہی ۔ ان سے یہ لوگ جلتے ہیں ۔ اپنی نانی سے پوچھ کہ انھوں نے تیرے باپ کی کیسی دُرگت کی تھی ۔ وہ سچ سچ کہہ دے گی ۔ اسے دھوکا دھڑی سے کد ہی کیوں کہ وہ اینچ پینچ نہیں سمجھ سکتی ۔ شراب پینے اور ناس سونگھنے سے کیا ہوتا ہی درا صل اس کا شمار ولیوں میں ہونا چاہیے ۔ عجیب و غریب عورت ہی ۔ اس کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا ۔ اسی میں تیرا بھلا ہی۔"

اس کے اشارے پر میں باہر چلا آیا ۔ میرے دل پر غم اور خوف کا بار تھا ۔ سگنوگ گھر کی ڈیوڑھی پر مجھے ملا اور اس نے نرمی سے

میرے کان میں کہا: "اس سے ڈرا نہ کرو۔ وہ بھلا آدمی ہے۔ لگی لپٹی نہ رکھو تو وہ خوش رہتا ہے۔"

یہ فضا میرے لیے حیرت افزا بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ مجھے کسی دوسرے ماحول کا تجربہ تو نہ تھا لیکن یہ یاد پڑتا تھا کہ میرے ماں باپ اس طرح نہ رہتے تھے۔ ان کا طور طریقہ ہی اور تھا۔ ان کا مسرت کا تخیل بھی مختلف تھا۔ گھر اور باہر کہیں ان کا ساتھ نہ چھوٹتا تھا۔ شام کو جب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھتے تھے تو دیر تک قہقہے لگاتے اور گلا پھاڑ کر گاتے تھے۔ راہ چلتے لوگ رک کر یہ تماشا دیکھنے لگتے تھے اور ان کی شکلیں ایسی مضحکہ خیز ہوتی تھیں کہ مجھے جھوٹی رکابیوں کا خیال آتا تھا۔ لیکن اس گھر میں شاید ہی کوئی ہنستا ہو اور کبھی کوئی چھوٹے منہ ہنسا بھی تو یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اکثر وہ ایک دوسرے پر بگڑتے تھے اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے تھے۔ بچّوں پر مُردنی چھائی رہتی تھی اور کوئی ان کی بات نہ پوچھتا تھا۔ جس طرح بارش کا پانی مٹّی کو دبا دے، اسی طرح یہ بھی پامال ہوگئے تھے میں یہاں ایک اجنبی تھا۔ آئے دن کوئی نئی چوٹ لگتی تھی جو مجھے زیادہ مشتبہ بنادیتی اور مجبور کردیتی تھی کہ میں واقعات کا مطالعہ زیادہ غور سے کروں۔

سگنوک سے میری دوستی گہری ہوتی گئی۔ نانی تو گھربار کے دھندے میں صبح سے شام تک پھنسی رہتی تھیں اور میں سارا وقت سگنوک کے ساتھ گزارتا تھا۔ جب کبھی نانا میری مرمت

کرتے تو وہ اپنا ہاتھ ضرور بید کے نیچے رکھ دیتا اور دوسرے دن اپنی فگار انگلیاں دکھا کر کہتا تھا: "یہ حماقت نہیں تو کیا ہے؟ اس سے تمہارا بھلا بھی نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ میری گُندی ہوتی ہے۔ اب میں اس جھگڑے میں نہ پھنسوں گا۔" یہ کہے دیتا ہوں۔"

لیکن دوسری مرتبہ پھر وہ پھٹے میں ٹانگ ڈال کر مار کھا جاتا تھا اور میں پوچھتا تھا: "مگر تم نے تو ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟"

"سمجھ میں نہیں آتا۔ بے سوچے میں پھر یہ حرکت کر گیا۔"

اسی زمانے میں مجھے سگنوک کے متعلق ایک نئی بات معلوم ہوئی جس نے اس سے میری دل چسپی اور محبت کو دوبالا کر دیا۔ ہر جمعہ کو وہ نانی کی دُلاری گھوڑی "شاریا" کو اِکّے میں جوتتا تھا۔ یہ گھوڑی بلا کی بدمزاج اور تندخو تھی۔ اپنا بھاری بھرکم اوورکوٹ اور ٹوپی پہنے، ہرے فیتے سے کمر کس کر وہ سامان خریدنے کے لیے بازار کی راہ لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی دیر سے آتا تھا اور سارا گھر فکرمند ہو جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی ہر آن کھڑکی تک جا کر منہ کی بھاپ سے شیشے کی برف صاف کر کے سڑک کے دونوں سروں کو دیکھا کرتا تھا۔

"اس کا کوئی پتہ نہیں؟"

"نہیں۔"

سب سے زیادہ تردد نانی کو ہوتا تھا: "خدا کی مار! تم نے گھوڑی اور لڑکے دونوں کو ختم کر دیا۔ ارے بے ایمانو! تم میں انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی؟ تھو ہے تم پر احمقو اور شرابیو!

خدا تمھیں اس کی سزا دے گا۔" نانا ناک بھوں چڑھا کر غرّاتا تھا، "بس بھی کرو! آئندہ ایسا نہ ہوگا۔"

کبھی سگنوک دوپہر تک نہ لوٹتا تھا۔ نانا اور ماموں اس کے آتے ہی آنگن کی طرف بھاگتے تھے۔ نانی بھی بھالو کی طرح لپکتی تھی اور زور سے ناس سڑکتی جاتی تھی کیوں کہ یہ اس کا مقررہ وقت تھا لڑکے بھی دوڑ پڑتے تھے اور اِکّے سے سامان اُترنے لگتا تھا۔ گوشت مچھلی اور مُردہ پرندوں کا انبار لگ جاتا تھا۔

نانا اپنی تیز آنکھوں سے سارے سامان کا جائزہ لے کر پوچھتا تھا: "سب چیزیں آگئیں؟ کچھ بھول تو نہیں آئے۔"

سگنوک آنگن میں اُچھلتے ہوئے ہنس کر جواب دیتا، "ٹھیک ہے، سب کچھ آگیا۔" اور دستانے میں بند ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے زور سے ملنے لگتا تھا۔

نانا ڈپٹ کر کہتا تھا: "دستانوں کو برباد کرنے کا ارادہ ہے؟ ان میں دام نہیں لگے؟ بدلنے کو کپڑے ہیں یا نہیں؟"

"نہیں"

نانا سامان کی ڈھیری کا چکّر لگاتے ہوئے زیرِ لب کڑکڑانے لگتا تھا: "پھر اس قدر سامان آگیا۔ کیا روپے پیڑ میں پھلتے ہیں۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔" اس طرح جھلّاتے ہوئے وہ چلا جاتا تھا۔

میرے ماموں خوشی خوشی سامان اُتارتے تھے اور سیٹی بجاتے ہوئے مچھلی، مُرغ اور گوشت کے بڑے بڑے قتلے ہاتھوں پر تولنے لگتے تھے: "لو بھئی سامان تو اُتر گیا۔" وہ اطمینان سے پکار اُٹھتے تھے۔

مائیکل ماموں خاص طور پر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ کبھی سامان کے اِرد گرد پھرتے تھے، کبھی پرندوں کی بو زور سے سونگھتے تھے اور چٹخارہ بھر کر اپنی بے چین آنکھوں کو بند کر لیتے تھے۔ ان کی صورت شکل اپنے باپ سے ملتی تھی۔ وہی روکھا پھیکا انداز تھا۔ قد البتہ کچھ اونچا اور بالوں کا رنگ زیادہ گہرا تھا۔

اپنے سرد ہاتھوں کو آستینوں میں چھپا کر اس نے سگنوک سے پوچھا:

"ابّا نے تمھیں کتنے روبل دیے تھے؟"

"پانچ روبل"

"یہ سامان پندرہ روبل سے کم کا نہیں! تم نے کتنا خرچ کیا؟"

"چار روبل دس کوپک"

"تو گویا نوّے کوپک آپ کی جیب میں ہیں! سنا بھائی جاکوف یہاں چاندی کس طرح گلتی ہے!"

یہ حضرت ایک نیم آستین پہنے برف میں کھڑے، نیل گوں روشنی میں ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے دانت نکوس رہے تھے۔

اس نے الکساہٹ سے پوچھا: "سگنوک، ہمارے لیے تھوڑی سی برانڈی ہے یا نہیں؟"

ادھر نانی گھوڑی کی لگام کھول رہی تھی: "اچھا، میری بٹیا! نازوں کی پالی! اللہ میاں کی گڑیا!"

گھوڑی ایال ہلانے لگی اور اپنے سفید دانت اس کے کاندھے پر رکھ دیے۔ اپنی مخملی ناک اس کے بالوں میں گھسیڑ کر اس کے

چہرے کو مطمئن نگاہوں سے تکنے لگی اور اپنے پپوٹوں کی برف جھاڑ کر دھیرے دھیرے ہنہنانے لگی۔

" اوہو! اب تجھے روٹی چاہیے "

نانی نے نمکین روٹی کا بڑا سا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال دیا۔ اور اس کے منہ کے نیچے اپنا ایپرن (پیش بند) پھیلا کر غور سے دیکھنے لگی۔ سگنوک جو کسی بچھیرے سے کم کھلنڈرا نہ تھا، اُچھل کر اس کے پاس آ کھڑا ہؤا، " نانی یہ گھوڑی بلا کی تیز ہی! "

" چل منہ کالا کر " نانی نے پیر ٹپک کر کہا: " آیا ہی بڑی باتیں ملانے والا! آج میں تجھ سے سخت خفا ہوں "

پھر اس نے مجھے بتایا کہ سگنوک نے جتنے کا مال نہیں خریدا اتنے کی چوری کی تھی۔ " اگر تیرے نانا اسے پانچ روبل دیتے ہیں تو وہ تین کا مال خریدتا ہی اور تین مار لے جاتا ہی۔ اسے تو چوری میں مزا ملتا ہی عادت بگڑ گئی ہی۔ جب اس نے پہلی مرتبہ یہ حرکت کی تو صاف بچ گیا سب نے اس کی چالاکی کی تعریف کی اور پھر تو اس کا ہاتھ صاف ہو گیا۔ تیرے نانا کی جوانی ایسی غربت میں کٹی کہ اب وہ ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑتے ہیں اور اپنے بیٹوں کے خون سے زیادہ انھیں روپے عزیز ہیں۔ کوئی بھیک بھی دے تو یہ خوشی سے لے لیں اور ناٹکل اور جاکوف ...... " نفرت سے منہ بنا کر وہ دم بھر چپ رہی پھر ناس دانی کو تاکتے ہوئے کہنے لگی: " مگر چاند کی بڑھیا کی کرامات دیکھو ...... ان کا نام ہی بی قسمت ...... اور یہ چاند میں بیٹھی ہمارے نصیب کا تانا بانا تیار کرتی ہی اور ہمیں اس کے کام

میں دخل دینے کا حق بھی نہیں ..... ! جو بھی ہو، اگر ان لوگوں کو سگنوک کی چوری کا حال معلوم ہؤا تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑیں گے!" دوبارہ ایک منٹ خاموش رہ کر وہ کہنے لگی: "دنیا میں اصولوں کی نہیں بلکہ عمل کی کمی ہے۔"

دوسرے دن میں نے سگنوک سے التجا کی کہ آئندہ چوری نہ کرے! "ورنہ وہ تمھیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

"مجال ہے! میں ایک آن میں انھیں بتا دے جاؤں گا۔ میں پھرتی میں کسی سرکس کے گھوڑے سے کم ہوں۔" ہنس کر وہ بولا۔ لیکن پھر اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ چوری میں خطرہ بھی ہے۔ اور گناہ بھی۔ لیکن میں اتنا اُکتا جاتا ہوں کہ دل بہلاتے کے لیے یہ کر گزرتا ہوں۔ مگر میرے پاس ایک دمڑی بھی نہیں بچتی۔ ہفتے بھر میں تمھارے ماموں سب لے اُڑتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کی کیا پروا! میرے پاس خدا کا دیا بہت ہے۔"

یک بیک مجھے گود میں اُٹھا کر جھولا سا جُھلاتے ہوئے وہ بولا: "بڑے ہو کر تم طاقت ور ہو گے۔ ابھی تم ہلکے پُھلکے ہو اور تمھاری ہڈیاں مضبوط ہیں۔ تم ستار بجانا کیوں نہیں سیکھتے؟ اپنے ماموں جاکوف سے کہو۔ مگر افسوس کہ ابھی تم بہت کم عمر ہو۔ اس کے باوجود تمھاری فطرت میں آزادی ہے۔ تمھیں اپنے نانا سے محبت تو نہیں ہے؟"

"معلوم نہیں"

"مجھے یہ کشرن گھرانا بالکل ناپسند ہے۔ سوا تمھاری نانی کے سب شیطان ہیں۔"

"اور میں ؟"

"تم کرسٹن نہیں ہو۔ تم پشکاٹ ہو........ یہ خون الگ ہے یہ نسل جدا ہے۔"

اتنے میں اس نے زور سے میری چونٹی لی "کاش میری آواز اچھی ہوتی اور میں گا سکتا ! میں دنیا میں کیسا ہنگامہ برپا کر دیتا .... اچھا یار، بہت ہوا، اب چلتے بنو، مجھے کام کرنا ہے" اس نے مجھے زمین پر بٹھا دیا اور مٹھی بھر چھوٹی چھوٹی کیلیں منہ میں بھر کر ایک چوڑے سے تختے پر کالی گیلی گیلی پٹیاں ٹھونکنے لگا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ہی وہ مرگیا۔

آنگن کے دروازے سے لگی ہوئی ایک بہت بڑی چوبی صلیب کھڑی ہوئی تھی جس کے بازو دراز اور گرہ دار تھے۔ عرصے سے وہ یوں ہی پڑی ہوئی تھی۔ جب میں اس گھر میں آیا تو اس کا رنگ اُجلا تھا لیکن پانی کھاتے کھاتے اب سیاہ پڑگیا تھا۔ اس سے سڑی ہوئی لکڑی کی بدبو آنے لگی تھی اور وہ اس گھٹنے ہوئے گندے آنگن کی راہ روکے ہوئے تھی۔

جاکوف ماموں نے اپنی بیوی کی قبر پر نصب کرنے کے لیے لے خریدا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اس کی برسی کے دن اپنے کاندھے پر لاد کر اسے قبرستان لے جائیں گے۔ برسی سردیوں کے آغاز میں کسی سنیچر کو پڑتی تھی۔

اُس دن تیز ہوا چل رہی تھی اور برف باری ہوچکی تھی۔ نانا نانی تینوں بچّوں کے ساتھ فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان پیش پیش

جا چکے تھے۔ کسی جرم کی پاداش میں میں گھر میں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔
میرے ماموں سیاہ لبادوں میں ملبوس تھے۔ صلیب ان کے شانوں پر رکھی ہوئی تھی۔ گری گوری نے کچھ پڑوسیوں کی مدد سے بمشکل شہتیروں کو جنبش دی اور صلیب سگنوک کے کشادہ کاندھوں پر لاد دی۔ اس بار کے نیچے وہ لڑکھڑانے لگا اور اس کے پانو کانپنے لگے۔
گری گوری نے پوچھا "کیا تم اکیلے اسے لے جاسکو گے؟"
"معلوم نہیں۔ یہ بہت وزنی ہے۔"
مائیکل ماموں نے غصّے سے کہا: "ابے اندھے، دروازہ کیوں نہیں کھولتا!" اور جاکوف ماموں بولے، "سگنوک تجھے شرم آنی چاہیے۔ تو اکیلا ہم دونوں پر بھاری ہے۔"
گری گوری دروازہ کھول کر بار بار سگنوک سے کہنے لگا: "اللہ شافی! بھیّا، ہاتھ پاؤں بچائے رکھنا!"
مائیکل نے سڑک سے چیخ کر کہا: "گنجا بے وقوف کہیں کا!"
ادھر آنگن کے سب لوگ اس طرح ہنسنے لگے گویا انھیں اس صلیب سے پیچھا چھڑا کر خوشی ہوئی ہو۔
گری گوری میرے ہاتھ میں انگلی دے کر کارخانے میں گیا اور بولا، "اس موقع پر شاید نانا تمھیں معاف کر دیں۔"
اس نے مجھے اونی چادروں کی ایک گٹھری پر بٹھا دیا جو اب رنگی جانے والی تھیں اور ان سے مجھے سرتاپا ڈھنک دیا۔ پھر دیگوں سے نکلی ہوئی بھاپ کو سونگھ کر سنجیدگی سے کہا:
"میاں، تمھارے نانا کو میں سینتیس سال سے جانتا ہوں۔ ان کے

کاروبار کا آغاز بھی دیکھا اور انجام بھی میرے سامنے ہو۔ اس وقت ہم دونوں میں دانت کاٹی تھی۔ بلکہ کاروبار کا سارا خاکہ دونوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ تمھارا نانا بڑا کائیاں ہو۔ مجھے کانوں کان پتہ نہ چلا کہ وہ کارخانے پر قبضہ کرنا چاہتا ہو۔ بہر حال خدا ہم سے زیادہ ہوشیار ہو۔ اس کی ایک ذرا سی ہنسی پر بڑے بڑے دانا اُلّو بن جاتے ہیں۔ ابھی تم ہر معاملے کو نہیں سمجھ سکتے لیکن تمھیں اس کی کوشش کرنا چاہیے۔ یتیم کی زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہو۔ تمھارا باپ آوارہ گرد تھا تو کیا وہ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اسی لیے تمھارے نانا سے اس کی نہ بنتی تھی اور یہ اسے ناپسند کرتا تھا۔"

اس شفیق کی باتیں فرحت بخش تھیں۔ تندور کے سُرخ و زریں شعلے اور بھاپ کی وہ اُجلی اُجلی لہر جو چھت کے خم دار تختوں پر نیلی نیلی لکیر بنا دیتی تھی اور درازوں سے آسمان کے ٹکڑوں کا نظارہ جو نیلی گوٹ جیسے معلوم ہوتے تھے —— میرے لیے یہ سب فردوسِ نظر تھا — ہوا تھم گئی تھی۔ آنگن پر گویا کانچ کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے۔ گاڑیاں سڑک سے گزرتی تھیں تو کڑاکے کی آوازیں آتی تھیں۔ مکان کی چمنیوں پر دُھنوئیں کے بادل اُمنڈ رہے تھے۔ برف پر دُھندلی پرچھائیاں، کوئی کہانی سی سُناتی ہوئی، چل پھر رہی تھیں۔

دُبلا پتلا گری گوری اپنی لمبی ڈاڑھی، گنجی کھوپری اور بڑے بڑے کانوں کے ساتھ دیگ چلاتے ہوئے کوئی نیک دل جادوگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نصیحت کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا: "دُنیا میں کسی سے نہ دبو۔ اگر کُتّا بھی تم پر حملہ کرے تو غُرّانے سے نہ چوکو۔

وہ ضرور دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔"

یک بیک چوکنا ہو کر وہ پکار اُٹھا: "یہ آواز کیسی؟"۔ تندور کا دروازہ اپنے پیر سے بند کر کے وہ آنگن کی طرف لپکا اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ باورچی خانے کے فرش پر سگنوک چت پڑا ہوا تھا کھڑکی سے روشنی کی کرنیں اس کے سارے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ اس کی پیشانی میں عجیب سی چمک آگئی تھی، ابرو چڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں سیاہ چھت پر ٹکی کی ٹکی رہ گئی تھیں۔ اس کے بے رنگ ہونٹوں سے گلابی جھاگ نکل رہے تھے اور دہانے کے کونوں سے خون کی دھار نکل کر اس کی گردن اور فرش پر پھیل گئی تھی۔ پیٹھ سے خون کا فوارہ سا نکل رہا تھا۔ اس کے پیر مُڑ گئے تھے اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ پتلون پیشاب سے بھیگ گئی ہے۔ وہ فرش کے تختوں سے چپک گئی تھی، جو پالش کی وجہ سے جگر جگر کر رہے تھے۔ خون کی نالیاں روشنی کی کرنوں میں گندھ کر چوکھٹ کے پاس جمع ہو گئی تھیں۔

سگنوک بے حرکت پڑا تھا۔ فقط اس کی انگلیاں فرش کو کرید رہی تھیں اور ان کے رنگین ناخون چمک رہے تھے۔

یوجینیا گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی اور ایک پتلی سی موم بتی اس کے ہاتھ میں دینے لگی۔ لیکن وہ اسے نہ تھام سکا اور وہ نیچے گر کر لہو لہان ہو گئی۔ باورچی خانے میں ہوا گانا سا گا رہی تھی۔ اگر میں کواڑ کا سہارا نہ لیتا تو ضرور اُڑ جاتا۔

جاکوف، سر ہلا ہلا کر کانپتی ہوئی آواز میں سارا ماجرا سُنا رہا

تھا۔ اس کا چہرا سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی تھی اور وہ تیزی سے جھپک رہی تھیں :" وہ لڑکھڑا کر گرا اور شہتیر اس پر آ گیا۔ ...... اس کی پیٹھ پر گر پڑا - اگر ہم اسی وقت صلیب کو نیچے نہ ڈال دیتے تو ضرور چوٹ کھا جاتے"
گری گوری نے دانت کٹکٹا کر کہا:" یہ تمھاری کرتوت ہی!"
"کیسے ....؟"
"یہ تمھارا فعل ہی!"
خون برابر بہ رہا تھا اور دروازے کے پاس اس کا کنڈ سا بن گیا تھا جو لمحہ بہ لمحہ زیادہ وسیع اور سیاہ تر ہوتا جاتا تھا۔ خونیں جھاگ کے ایک نئے فوارے کے ساتھ سگنوک زور سے چیخا، تڑپا اور مر گیا۔ وہ یوں بے دم ہو گیا گویا زمین سے چپک گیا ہو اور اس کے اندر دھنس رہا ہو۔
جاکوف نے زیر لب کہا:" مائیکل گھوڑا لے کر ابّا کو خبر کرنے قبرستان گیا اور میں اسے گاڑی پر لاد کر فوراً یہاں لے آیا۔ خیریت ہوئی کہ میں شہتیر کے نیچے نہ تھا ورنہ میرا بھی یہی انجام ہوتا"
یوجینیا نے دوبارہ موم بتّی سگنوک کے ہاتھ میں دی اور اس کی ہتیلی پر موم اور آنسو بہانے لگی۔
"ٹھیک ہی! لیکن اس کا سر زمین پر کیوں نہیں رکھتی ری چڑیل!"
"کیا بک رہے ہو جی!"
"اری اس کی ٹوپی سر سے اُتار دے!"

یوجینیا نے سگنوک کے سر سے ٹوپی کھینچ لی اور وہ بھدسے ایک طرف لڑھک گیا۔ اب خون منہ کے صرف ایک کونے سے بہنے لگا۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پہلے تو مجھے پوری اُمید تھی کہ سگنوک گہرا سانس کھینچ کر اُٹھ بیٹھے گا اور خوابیدہ آواز میں کہے گا "اوف اوہ! کس بلا کی گرمی ہے" اتوار کے کھانے کے بعد وہ یہی کہا کرتا تھا۔

لیکن اُٹھنا تو درکنار، وہ گویا زمین کے اندر دھنسا جارہا تھا سورج آگے بڑھ گیا تھا، اُس کی کرنیں چھوٹی پڑ گئی تھیں اور صرف کھڑکی کو اُجال رہی تھیں۔ سگنوک کا سارا جسم سیاہ پڑ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کی جنبش بند ہوگئی تھی، ہونٹوں کے جھاگ خشک پڑ گئے تھے۔ اس کے سر کے اردگرد تین موم بتیاں اندھیرے میں سر نکالے کھڑی تھیں، اپنی سنہری شعاعوں کو ہلا ہلا کر وہ اس کے بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کو تک رہی تھیں اور کبھی اپنی کانپتی ہوئی زرد لہروں کو اس کے سانولے گالوں پر پھیلا کر، اس کی کھڑی ناک اور خون آلودہ دانتوں کو اُجال دیتی تھیں۔

یوجینیا اس کے پاس بیٹھی رو رو کر کہہ رہی تھی: "ارے میرے سگنا! ارے میرا ہمدرد!"

غضب کی سردی تھی۔ میں میز کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نانا جان گرتے پڑتے باورچی خانے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے نانی، مائیکل ماموں اور کئی پڑوسی بھی تھے۔ اپنا کوٹ فرش پر پھینک کر نانا نے کہا: "ہائے ہائے! تم لوگوں کی لاپروائی نے

کیا غضب ڈھایا! قسم ہے کہ پانچ سال میں وہ سونے کی ترازو میں تُلتا۔"

فرش پر اتنے کوٹوں کا انبار لگ گیا تھا کہ میں سگنوک کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے میں میز کے نیچے سے نکلنے لگا اور نانا کی ٹانگوں سے ٹکرا گیا۔ اُنھوں نے مجھے ایک لات رسید کی اور اپنے بیٹوں کو گھونسا دکھا کر چلّا اُٹھے: "ارے بھیڑیو!"۔ بنچ پر کہنی ٹیک کر وہ بیٹھ گئے اور زار و قطار روتے ہوئے تیز آواز میں بولے "میں سب سمجھتا ہوں ..... وہ تمھاری آنکھوں میں کھٹکتا تھا! ساری بات یہ ہے! بدبخت سگنوک، انھوں نے تیرے ساتھ کیا کیا۔ سچ ہے کہ پردیسی کے گھوڑے میں ٹوٹی ہوئی لگام لگاؤ۔ کیوں جی اس سال خدا ہم سے ناراض ہے یا نہیں؟"

نانی فرش پر گر کر کبھی سگنوک کی نبض چھوتی تھی، کبھی ماتھے پر ہاتھ پھیرتی تھی اور اس کے ہاتھوں کو بھینچتی تھی۔ پھر تمام موم بتیوں کو پھینک کر وہ بہ مشکل کھڑی ہوئی۔ اپنے چمک دار کپڑوں میں وہ زیادہ شان دار معلوم ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں گویا پھٹی پڑتی تھیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا: "بدبختو، یہاں سے ہٹ جاؤ۔"

نانا کے سوا بہت لوگ باہر چلے گئے۔

سگنوک خاموشی سے دفنا دیا گیا اور بہت جلد سب اُسے بھول گئے۔"

---

# باب ۴

ایک موٹا سا کمبل چوہرا کرکے مجھ پر ڈال دیا گیا تھا اور میں پلنگ پر لیٹے لیٹے نانی کی دعائیں سُن رہا تھا۔ وہ دوزانو بیٹھ گئی تھی بیچ بیچ میں وہ نہایت احترام سے اپنے جسم پر صلیب کا نشان بنا دیتی تھی۔ آنگن میں غضب کا پالا پڑ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں کے برفانی لحاف سے ہوکر ہری ہری سی چاندنی کمرے میں آرہی تھی اور اس کے مہربان چہرے اور بڑی سی ناک کو اُجالتی ہوئی، اس کی سیاہ آنکھوں میں جوت جگا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی گھنیری ریشمی زلفوں میں مشعل سی جل رہی ہو۔ اس کا کالا لبادہ شانوں پر سے لہراتا ہوا فرش پر اس کے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

دعا ختم کرکے نانی نے چپ چاپ کپڑے بدلے اور احتیاط سے تہ کرکے انھیں صندوق پر رکھ دیا۔ پھر وہ پلنگ کے پاس آئی میں جھوٹ موٹ خراٹے بھرنے لگا۔

"ارے بچے، تو سویا کب ہو! مٹیا کر پڑ گیا ہو! آجا میرے گُڈے، چادر لگوالے"

مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا اور اس خیال سے میں مسکرا پڑا یہ دیکھ کر وہ چلّائی: "ارے تو اپنی بوڑھی نانی سے ایسی شرارت

کرتا ہی" اور اس نے اس ہوشیاری اور پھرتی سے کمبل اپنی طرف کھینچا کہ میں ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا پروں کے نرم نرم بستر پر دھم سے گر پڑا ۔ وہ قہقہہ لگا کر بولی: "کیوں میاں مٹھو کیا مچھر نے کاٹا؟"

لیکن بعض اوقات اس کی دعاؤں کا سلسلہ اتنا طویل ہوتا تھا کہ مجھے دراصل نیند آجاتی تھی۔

دعا طوالت اس صورت میں پکڑتی تھی جب دن جنگ و جدل یا پریشانیوں میں گزرتا تھا۔ اس موقع پر میں دعاؤں کو بڑی دلچسپی سے سُنتا تھا۔ نانی اللہ میاں کو گھر کا پورا روزنامچہ سُنا جاتی تھی۔ جب وہ جھکتی تھی تو مٹی کا تودہ معلوم ہوتی تھی۔ دوزانو ہوکر پہلے دل ہی دل میں بدبداتی ہوئی وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگتی تھی: "خدا تجھے معلوم ہی کہ ہم سب اپنے کو سدھارنا چاہتے ہیں۔ بڑے لڑکے کو شہر میں رہنا چاہیے، ندی کا کنارا اس کے لیے مضرت رساں ہو واللہ اعلم کیا ہونے والا ہی! پھر بڑے میاں کو بھی دیکھ۔ وہ جاکوف پر دم دیتے ہیں۔ کیا ایک بچے کو دوسرے سے زیادہ چاہنا اچھا ہی؟ لیکن بڑے میاں کب کسی کی سُنتے ہیں۔ الٰہی، انھیں کان دے۔"

اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خدا کے سیاہ بت کو تاکتی ہوئی وہ اسے یہ مشورہ دیتی تھی: "اللہ، خواب میں انھیں ایسا درس دے کہ وہ اپنی اولاد سے اچھا برتاؤ کرنے لگیں۔"

سجدے میں گرکر اور اپنی پیشانی فرش پر رگڑ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور خوشامد کے لہجے میں بولی: "اور میری بیٹی کو راحت دے

تو اس سے ناراض کیوں ہے؟ کیا وہ دوسروں سے زیادہ گناہ گار ہے؟۔ ایک جوان عورت کو ان مصائب میں مبتلا نہ کر۔ ہاں اور میرے خدا، گری گوری کو نہ بھول ۔ اس کی آنکھیں زیادہ خراب ہو رہی ہیں۔ اگر وہ اندھا ہوگیا تو در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا اس نے اپنی ساری قوت بڑے میاں کے لیے صرف کر دی، لیکن کیا تو سمجھتا ہے کہ وہ اس کی مدد کریں گے! اللہ میرے اللہ!"

سر جھکائے ہاتھ لٹکائے وہ دیر تک خاموش کھڑی رہتی تھی اور گمان ہوتا تھا کہ یا تو وہ سوگئی یا یک بیک اکڑ گئی ۔

پھر ماتھے پر بل ڈال کر وہ خود بخود کہہ اٹھتی تھی: "اب باقی کیا رہا۔"

"میرے مالک ایمان والوں کی مدد کر! میں ناسمجھ سہی — لیکن معاف کر دے۔ تو جانتا ہے کہ میں دانستہ نہیں بلکہ نادانستہ گناہ کر جاتی ہوں" اور ایک گہری سانس لے کر وہ اطمینان و مسرت سے کہہ اٹھتی تھی: "خدا کے بیٹے، تجھ سے کیا چھپا ہے۔ تو تو سب کچھ جانتا ہے"

مجھے نانی کا خدا بہت بھاتا تھا کیوں کہ وہ اس سے اتنا قریب تھا اور میں اکثر اصرار کرتا تھا: "مجھے خدا کا حال سناؤ"۔ ایک خاص انداز میں وہ اس کا ذکر کرتی تھی —— آہستہ آہستہ آنکھیں بند کر کے اور ایک ایک لفظ تول کر۔ وہ قصداً اپنے سر کا رومال ٹھیک کر کے نیچے بیٹھ جاتی تھی اور پھر ذکر شروع کرتی تھی: "جنت کی وادیوں میں پہاڑیوں کی چوٹی پر خدا کا محل ہے۔ فردوس میں نہ خزاں ہے نہ زمستاں، کیوں کہ بہار وہاں کا ابدی تحفہ ہے اور ہر پھول سدا

بہار ہی۔ وہاں طوبیٰ کے درختوں کے نیچے زمرد کی قربان گاہ ہی اور یہی اُس مالک کا مقام ہی۔ خدا کے ارد گرد فرشتے برف کے گالوں کی طرح اُڑا کرتے ہیں اور ہر طرف بھونرے گُنگناتے ہیں۔ اور زمین و آسمان کے بیچ میں راج ہنسوں کی ڈاک جاری رہتی ہی جو خدا کو ہمارا پیام سناتی ہی اور دنیا میں ہم سب کو ایک ایک فرشتہ دیا گیا ہی خدا ہم سب سے برابر کا سلوک کرتا ہی۔ مثلاً تمھارا فرشتہ جب اس سے شکایت کرے گا کہ الکسی نے اپنے نانا کے منہ چڑھایا تو وہ حکم دے گا: اس کے بدلے نانا کو اسے پیٹنا چاہیے۔ ہم سب کا یہی حال ہی۔ جو جس لایق ہی اس دربار سے اسے وہی ملتا ہی —— کسی کو رنج کسی کو راحت۔ اس کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں اور فرشتے پر پھڑپھڑا کر شب و روز حمد گاتے ہیں: تیری رحمت کے قربان تیری رحمت کے قربان! یہ سُن کر وہ مسکراتا ہی اور فرشتے باغ باغ ہو جاتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ مسکراتی ہوئی جھومنے لگتی تھی۔

"تم نے یہ سب دیکھا ہی؟"

"دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یہ سب معلوم ہی۔"

خدا، جنّت یا فرشتوں کا ذکر کرتے وقت وہ سمٹ سی جاتی تھی۔ اس کے چہرے میں جوانی اور آب دیدہ آنکھوں میں عجیب سی گرمی اور روشنی آجاتی تھی۔ اس کی دراز و گداز چوٹی ہاتھ میں لے کر میں اپنے گلے میں لپیٹ لیتا تھا اور خاموش بیٹھا یہ لامتناہی مگر دل حسپ داستان سُنا کرتا تھا۔

"انسان کی بے نور آنکھیں خدا کے دیدار کی تاب کب لاسکتی ہیں؟

صرف اولیا کو ہی یہ مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن فرشتوں کو میں نے دیکھا ہے۔ جب روح عبادت میں محو ہو تو وہ اپنا جلوہ دکھا جاتے ہیں میں کابیسا میں صبح صبح کلام اللہ سُننے گئی تھی تو دو فرشتے بادل کے ٹکڑوں کی طرح قربان گاہ کے گرد پھر رہے تھے۔ ان کے پر ے ہر چیز منوّر ہوتی جاتی تھی اور ان کے ڈینے فرش تک لٹکے ہوئے تھے۔ جب بوڑھا پادری دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا تو وہ اسے سہارا دیتے تھے۔ وہ بالکل بوڑھا تھا اور نابینا ہونے کی وجہ سے اٹک اٹک جاتا تھا۔ لیکن اس روز اس نے فرفر نماز ختم کر دی۔ فرشتوں کو دیکھ کر میری حالت شادیٔ مرگ کی سی ہوگئی۔ میرا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا اور آنکھیں نہا رہی تھیں۔ وہ نظّارہ بھی کیسا حسین تھا! میرے بیٹے، خدا زمین پر ہو یا آسمان پر، وہاں خوشی ہی خوشی ہے!

”لیکن ہمارے گھر میں خوشی کہاں ہے؟“

فوراً صلیب کا نشان بنا کر وہ جواب دیتی تھی:

”صلوٰۃ بر مریم! یہاں بھی خوشی ہے۔“

یہ سُن کر مجھے غصّہ آجاتا تھا۔ میں کبھی نہ مان سکتا تھا کہ اس گھر میں عافیت ہی عافیت ہے۔ میری رائے میں تو گھر کی حالت زیادہ ناگفتہ بہ ہوتی جاتی تھی۔

ایک روز ماموں مائیکل کے دروازے سے گزرتے ہوئے میں نے ممانی نتالیا کو دیکھا جو ہاتھ سینہ پر باندھے بڑی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھیں اور دردناک لہجے میں کراہ رہی تھیں ”اچھے خدا اپنے پاس بُلا لے۔ یہاں سے مجھے ہٹا لے۔

میں اس کی دعا سے اتنی ہی ہم دردی کر سکتا تھا جتنی گریگوری کی اس شکایت سے: "جب میں اندھا پٹ ہوجاؤں گا تو وہ مجھے بھیک کا ٹھیکرا تھما کر نکال دیں گے۔ لیکن اس زندگی سے بھیک بھی بہتر ہے۔"

اور میری یہ تمنا تھی کہ وہ جلدی سے اندھا ہوجائے، تاکہ میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں اور دونوں رل کر بھیک مانگنے لگیں میں نے اپنی خواہش اس پر ظاہر کر دی تھی اور گریگوری نے ہنس کر کہا تھا: "ہاتھ ملاؤ! ہم دونوں ساتھ ساتھ نکل پڑیں گے۔ لیکن پہلے میں شہر جاؤں گا۔ وہاں اسی خاندان کا ایک آدمی میرا ملاقاتی ہے شاید وہ مجھے کچھ کام دے دے!"

کئی مرتبہ میں نے ممانی نتالیا کی آنکھوں کے نیچے سوجن یا اس کے زرد چہرے پر کٹے ہوئے ہونٹ کا نشان دیکھا۔ میں نے نانی سے پوچھا: "کیا ماموں انھیں مارتے ہیں؟" اس نے آہ بھر کر جواب دیا "ہاں وہ شیطان اس پر بھی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے، گو زیادہ نہیں۔ مار پٹائی رات کو ہوتی ہے تو تیرے نانا بھی کچھ نہیں کہتے۔ وہ بڑا بدمزاج ہے اور یہ بیچاری نری اللہ میاں کی گائے ہے۔"

ذرا اطمینان کے لہجے میں وہ کہتی گئی: "لیکن اب اس نے مار پیٹ کم کر دی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھونسا پیٹھ پر یا ایک چپت منہ پر۔ بہت ہوا تو ایک دو منٹ بال پکڑ کر ادھر اُدھر کر دیا۔ لیکن پہلے تو وہ گھنٹوں اس پر ستم توڑتا تھا اور تو اور تیرے نانا نے ایک تیوہار کی رات کو میری ایسی ٹھکائی کی کہ کھانے کے وقت سے لے کر

سونے کی گھڑی تک دم نہ لیا۔ دے مار دے مار، پانی پی پی کر، سانس لے لے کر ـــــ اور وہ بھی کوڑے سے!"

"اور اس کا سبب؟"

"اب میں بھول گئی۔ دوسری بار اس نے مجھے اس زور سے پٹکا کہ میں ادھ مری ہوگئی اور پانچ گھنٹے کھانا پانی نہ دیا۔ میں بالکل ادھ مری ہوگئی تھی۔"

میں بھوچکا رہ گیا۔ نانی نانا سے دوگنی تھی اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اسے زیر کر سکے۔ اس لیے میں نے پوچھا: "کیا وہ تم سے زیادہ قوی ہیں؟"

"قوی تو نہیں مگر عمر میں زیادہ ہیں۔ یہی نہیں، وہ میرے شوہر ہیں اور انھیں میرے ایک ایک فعل کا جواب خدا کو دینا ہے میرا فرض ہے کہ صبر سے ہر تکلیف برداشت کروں۔"

وہ تماشہ بھی دلچسپ ہوتا تھا جب نانی شہ نشین کی گرد جھاڑتی اور اس کے آرائشی کام کو صاف کرتی تھی۔ اس کے تاج میں چاندی ہوتی اور کئی رنگ برنگے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اور جب وہ اسے ہاتھ میں اٹھاتی تو اس کے لبوں پر تبسم آجاتا اور اس کے دل سے یہ صدا آتی: "اس کا مکھڑا کتنا پیارا ہے!" اور صلیب کا نشان بنا کر اسے چوم کر وہ کہتی جاتی تھی: "مریم، عیسائیوں کی نگہبان پرہیزگاروں کی دستگیر، تو خاک و گرد میں اٹی ہوئی ہے! بیٹے الکسی، دیکھ یہ لکھاوٹ کتنی باریک ہے اور حرف کیسے ننھے منّے ہیں، پھر بھی سب پڑھ لیا جاتا ہے۔ اس کا نام ہے "بارہ متبرک دن" اور بیچ میں عیسیٰ کی

کنواری ماں جلوہ گر ہی۔ اور یہاں لکھا ہی: "ماں، میرا ماتم نہ کر کیوں کہ میں جلد قبر میں سو جاؤں گا۔"

کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ شہ نشین سے اتنے ہی شوق و انہماک سے کھیلا کرتی ہی جتنا کہ میری ماموں زاد بہن اپنی گڑیا سے۔

اسے اکثر بھوت نظر آتے تھے، کبھی اِکّے دُکّے، کبھی بہتیرے

"ایک چاندنی رات کو میں رو ڈولفوف کے گھر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ سر اُٹھایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ چھت پر ایک بھوت چمنی سے لگا بیٹھا ہی۔ یہ تند و توانا جانور کبھی غرّاتا، کبھی ناک سُڑکتا اور دُم پھیلائے ہوئے برابر اپنے پنجے جھاڑتا جاتا تھا۔ میں نے اس کی طرف صلیب کا نشان بنا کر کہا: "عیسیٰ کو نئی زندگی عطا ہوئی ہی اور اس کے دشمن تین تیرہ ہو گئے ہیں! یہ سننا تھا کہ وہ چیخ کر چھت سے گرا اور فرش پر آ رہا ـــــ اسے بھاگتے ہی بنی اس روز روڈولفوف کے گھر گوشت پک رہا ہوگا اور بھوت اس کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔"

بھاگتے بھوت کے تصور سے میں ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گیا اور نانی بھی ہنس کر کہنے لگی: "بھوت بچّوں کی طرح شریر ہوتا ہی۔ ایک روز کپڑے دھونے میں مجھے بڑی دیر ہو گئی۔ اتنے میں کوٹھری کا دروازہ کُھلا اور سُرخ سبز و سیاہ جانوروں کا ایک ریلا اندر گھس آیا۔ یہ تِل چٹوں سے بڑے نہ ہوں گے۔ میں نے باہر بھاگنے کی کوشش کی مگر یہ بُھتنے مجھے کب جانے دیتے تھے وہ جم غفیر تھا کہ پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کچھ میرے پیروں پر رینگ رہے تھے

کچھ میرا دامن کھینچ رہے تھے اور میں ان کے نرغے میں اس بری طرح پھنس گئی تھی کہ صلیب کا نشان بنانے کی بھی جگہ نہ تھی۔ نرمی اور گرمی میں وہ بلّی جیسے تھے۔ پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوکر وہ میرے چاروں طرف گھوم پھر رہے تھے، ہر چیز کا معاینہ کرتے، چوہوں کے سے دانت دکھا کر اپنی ہری آنکھوں کو جھپکاتے اور مجھے اپنے سینگوں سے کوچتے تھے اور اپنی ذرا ذرا سی دُم کو ہلاتے تھے۔ ارے بھیّا، میں تو دیوانی سی ہوگئی تھی اور مجھے انھوں نے چرخی کی طرح گھُما مارا۔ قندیل بجھ گئی، ناند کا پانی ٹھنڈا ہوگیا اور سارے کپڑے زمین پر بکھر گئے۔ ارے، یہ کہو کہ جان بچ گئی۔"

آنکھیں بند کرکے میں اس کوٹھری کا تصور کرسکتا تھا جس میں رنگ برنگے بھوت بھرے ہوتے تھے۔ میں انھیں قندیل بجھاتے اور منہ چڑھاتے دیکھ سکتا تھا۔ یہ تماشہ کتنا مضحکہ خیز اور خوفناک ہوگا۔

دم بھر چپ رہ کر اور سر ہلاکر نانی نے پھر اپنی ٹوٹا کہانی شروع کردی: "میں نے دیو بھی دیکھے ہیں۔ جاڑوں کی رات تھی اور برف پڑ رہی تھی۔ تمھیں وہ جگہ یاد ہو جہاں تمھارے ماموں بڑے میاں کو باؤلی میں ڈبونا چاہتے تھے؟ بس میں ادھر سے ہوکر چھوٹی سڑک کی طرف مڑی ہی تھی کہ بینا، پکڑنا، کی آوازیں آئیں اور تین سیاہ گھوڑے مجھ پر جھپٹ پڑے۔ کوچبان کی جگہ ایک اونچا پورا بھوت، سُرخ ٹوپی پہنے بڑے بڑے دانت نکالے کھڑا

تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں آہنی زنجیروں کی بنی ہوئی
لگام تھی۔ اور تو کوئی جگہ تھی نہیں، اس لیے گھوڑے برف پوش
تالاب میں کود پڑے اور برف کے بادل میں غایب ہو گئے۔
گاڑی میں اور بھی کئی دیو بیٹھے ہوئے ہاہو کر رہے تھے اور
ٹوپیاں اچھال رہے تھے۔ ایسی ایسی سات گاڑیاں تھیں جیسے
پوری آگ گاڑ ہو۔ سب میں کالے گھوڑے جتے ہوئے اور دیو
بھرے ہوئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ وہ اپنی برادری والوں سے
ملنے جاتے ہیں اور تیوہار تقریب میں رات کو سفر کرتے ہیں۔ میرا
خیال ہے کہ اس رات کو کسی دیو کی شادی ہوگی!"
نانی کی بات کو جھٹلا کون سکتا تھا کیوں کہ وہ اس سادگی
اور وثوق سے باتیں کرتی تھیں۔
لیکن سب سے مزیدار قصہ حضرت مریم کا ہوتا تھا جو اس
مظلوم دنیا کا گشت کرتی تھیں اور ایک عورت ڈاکو "انگل چیف"
کو حکم دیتی تھیں کہ روسیوں کو ہرگز دق نہ کرے۔ اس سلسلے میں
رہزنوں، ولیوں اور پادریوں کا بھی ذکرِ خیر آجاتا تھا۔ یہی نہیں
بلکہ اسے بے شمار پہیلیاں اور لوریاں بھی یاد تھیں۔
دنیا میں وہ کسی سے نہ ڈرتی تھی —— نہ نانا سے نہ بھوت
پریت سے۔ مگر کالے تل چٹوں سے اس کا دم نکلتا تھا۔ دس گز کی
دوری سے وہ ان کی بو سونگھ لیتی تھی۔ کبھی آدھی رات کو مجھے
جگا کر وہ کان میں کہتی تھی: "اچھے بیٹے، کوئی تل چٹا گھس آیا ہے
للہ اس مُردار کو دفان کر!"

نیند سے جھومتے ہوئے، قندیل جلا کر میں پلنگ کے نیچے اس بیری کو ڈھونڈنے لگتا تھا۔ مگر یہ تلاش بسا اوقات ناکام رہ جاتی تھی
"تل چٹے کا نام بھی تو نہیں ہے" میں جھلّا کر کہتا تھا۔ لیکن اپنے سر کو چادر میں لپیٹ کر وہ بھرّائی ہوئی آواز میں خوشامد کرتی تھی؛
"ہے کیوں نہیں! بیٹے اچھی طرح دیکھ کسی کونے میں دبک گیا ہوگا"
اس کا خدشہ ہمیشہ ٹھیک نکلتا تھا۔ بالآخر پلنگ کے آس پاس مجھے تل چٹا مل ہی جاتا تھا۔ چادر ہٹا کر اور اطمینان کی سانس لے کر وہ مسکراتی تھی:" مار دیا مردُود کو! شکر اللہ! بڑی عمر ہو بیٹے!"
اگر کبھی مجھے تل چٹا نہ ملا تو وہ کسی طرح سو نہ سکتی تھی اور مجھے رات کی خاموشی میں اس کی کنپ کنپی کا احساس ہو جاتا تھا ہانپتی ہوئی وہ کہتی تھی:" وہ دروازے کے پاس ہے۔۔۔۔ اب صندوق کے نیچے چھپ گیا۔"
"لیکن تل چٹوں سے تم ڈرتی کیوں ہو ما؟"
"میں خود نہیں جانتی۔" وہ جواب میں کہتی —— اور یہ سچ بھی تھا:" یہ مکروہ کالے مکوڑے رینگتے کس طرح ہیں! اور ہر مکوڑے کے ساتھ تو خدا کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ دیمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ گھر سیل گیا ہے۔ کھٹمل خبر دیتے ہیں کہ دیوار گندی ہے۔ جوئیں ایک بیماری کی اطلاع لاتی ہیں۔ لیکن تل چٹے! —— یہ کس طرح جیتے ہیں اور کیا بتلاتے ہیں، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔"

× × × × × × × × × × × ×

ایک روز دوزانو بیٹھی وہ خدا سے راز و نیاز کی باتیں کر رہی

تھی کہ نانا دروازہ کھول کر چلا اُٹھے: "بڑی بی خدا نے پھر ہم پر ایک نیا ستم توڑا! گھر میں آگ لگ گئی ہے!"

نانی فرش سے اُچھل پڑی: "تم کیا کہہ رہے ہو؟" دونوں برآمدے کی طرف لپکے: "یوجینیا، شہ نشین اُتارے، نتالیا، بچے کو کپڑے پہنا"

نانی للکار کر یہ احکام دے رہی تھی لیکن نانا آہستہ آہستہ "اوف اوہ" کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

میں باورچی خانے کی طرف دوڑا۔ جو کھڑکی آنگن کی طرف کھلتی تھی، سونے کے پترے کی مانند جگمگا رہی تھی اور فرش پر زرد شعلے لہلہا رہے تھے۔ جاکوف کپڑے پہنتے پہنتے ان پر ننگے پاؤں رکھ کر، پھر یوں اُچھل پڑتا تھا جیسے جل گیا ہو اور پکارتا جاتا تھا "یہ مائیکل کی حرکت ہے! آگ لگا کر وہ بھاگ گیا"

"چپ رہ کُتّے!" یہ کہہ کر نانی نے اس دروازہ کی طرف اس زور سے ڈھکیلا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔

کھڑکی کے شیشوں پر جمی ہوئی برف سے کارخانے کی جلتی ہوئی چھت نظر آ رہی تھی اور کھلے ہوئے دروازے سے آگ کی لپٹیں دھدھک رہی تھیں۔ رات سنسان تھی اور شعلوں کی رنگت میں دھنویں کی ملاوٹ نہ ہوئی تھی۔ دھنویں کی سیاہ چادر ان سے الگ اپنا حلقہ بنا رہی تھی لیکن وہ سڑک کی روپہلی پوشش کو نہ چھپا سکتی تھی۔ برف ایک سُرمئی روشنی میں جھل جھلا رہی تھی۔ مکان کی دیواریں چرمراتی ہوئی یوں کانپ رہی تھیں گویا ابھی

آنگن کے اس حصّہ میں سر کے بل گر پڑیں گی جہاں کارخانے کی لال لال درازوں سے ہو کر شعلے زبان دکھا رہے تھے۔ ٹیڑھی بیڑھی کیلیں گل گل کر نیچے ٹپک رہی تھیں۔ چھت کی سیاہ شہتیروں میں سُرخ و زرد فیتے سے لپٹ گئے تھے اور ان کے بیچ میں چمنی کی نلی دھنوئیں کی نہر سی بہا رہی تھی۔ کھڑکیوں پر ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہو رہی تھی گویا ریشمی دوپٹا لہرا رہا ہو۔ آگ کی ندی امنڈتی آتی تھی اور کارخانے کے در و دیوار کالیا کے طاقوں کی طرح زرنگار معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا نظارہ میرے لیے نہایت نظر فریب تھا۔

اپنے سر پر ایک بھاری سا کوٹ ڈال کر اور جس جوتے میں میرے پیر اٹ گئے اسے لے کر میں نے برساتی کی راہ لی اور سیڑھیوں پر فق حیران کھڑا ہو گیا۔ آگ کے اس کھیل نے اور گھر بھر کی چیخ پکار نے مجھے باؤلا بنا دیا تھا۔ سب سے زیادہ دہشت مجھے نانی کو دیکھ کر ہوئی جو سر پر ایک ٹاٹ ڈالے اور پیٹھ کو ایک زین سے ڈھنکے، آگ کے اندر دھنسی پڑتی تھی۔ وہ یہ کہتی ہوئی آگ کے الاؤ میں کود پڑی: "عقل کے اندھو، نوتیا کی بوتل پھٹ پڑے گی!" نانا چلّایا: "گری گوری، اسے پکڑلے آؤ! وہ بھی گئی ــــ"

لیکن اسی آن نانی نوتیا کی بوتل کے بار سے جھکی ہوئی دھنوئیں میں سیاہ بھوت بنی، نیم بے ہوشی کی حالت میں برآمد ہوئی۔ کھانستی اور کھکھارتی ہوئی وہ چیخ اٹھی: "بڑے میاں گھوڑی کو باہر

نکالو۔ اور اس چیز کو میرے کاندھے سے اُتارو۔ دیکھتے نہیں کہ اس میں آگ لگ چکی ہے؟"

گری گوری نے اس کے کاندھوں سے جلتی ہوئی زین اُتاری اور پھر تیزی سے کارخانے کے دروازے پر پھاوڑے میں بھر بھر کر برف پھینکنے لگا۔ ہاتھ میں کدال لیے میرا ماموں اس کے پاس دولتّی جھاڑ رہا تھا اور اُدھر نانا نانی پر برف کی بارش کر رہے تھے۔ نانی نے وہ پوٹلی تو برف کی ایک نالی میں پھینکی اور پھاٹک کی طرف جھپٹی جہاں تماشائیوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ انھیں سلام کر کے وہ بولی: "پڑوسیو! للّٰہ کارخانے کو بچالو، اگر آگ پھیل گئی تو ہم اس میں جل مریں گے اور تم بھی نہ بچو گے۔ چھت کو گرادو اور سوکھی گھاس باغ میں پھینک دو! ارے گری گوری تو ساری برف نیچے ہی ڈالے جاتا ہے کچھ اوپر بھی توڈال۔ جاکوف، اس ناچ سے کیا حاصل؟۔ پڑوسیوں کو کدال اور پھاوڑے کیوں نہیں دیتا؟ بھائیو اس وقت ہماری مدد کرو، خدا تمھیں اس کا اجر دے گا۔"

میرے لیے وہ آگ سے کم دل چسپ نہ تھی۔ اُن شعلوں میں دہکتی ہوئی جن کے منہ سے وہ ابھی ابھی نکلی تھی، وہ آنگن میں بجلی کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اس کا تن بدن سیاہ ہوگیا تھا اور وہ ہر موقع پر موجود، سب کی نگرانی میں مستعد تھی اور کوئی چیز اس کی نظر سے دُور نہ تھی۔

گھوڑی یوں بوکھلا کر پینترے بدلنے لگی کہ نانا گرتے گرتے رہ گئے۔ گھوڑی کی بڑی بڑی آنکھیں روشنی میں ایک خاص انداز سے

چمک رہی تھیں۔ اپنے اگلے پاؤں ہوا میں ہلاتے ہوئے وہ ہانپ رہی تھی۔ نانا لگام پھینک کر ایک طرف ہٹ گیا اور زور سے پکارا:

"بڑی بی، تمھیں اس کا جتن کرو۔"

نانی گھوڑی کے پیروں تلے آتی آتی بچی اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ گھوڑی دردناک لہجے میں ہنہنانے لگی اور آگ کی طرف پیٹھ کرکے اس کے قریب آگئی۔

نانی اس کی گردن تھپ تھپاکر اور لگام سنبھال کر دھیرے سے بولی: "اری کوئی یوں بھی ڈرتا ہے؟ کیا تجھے میں یوں ہی چھوڑ دیتی؟ واہ ری میری چوہیا!"

اور یہ چوہیا، جو نانی سے دوگنی ہوگی، اس کے سرخ چہرے کو سونگھتی اور تکتی ہوئی چپ چاپ دروازے کی طرف چلی گئی۔

نوکرانی کچھ کمبل پوش بچوں کو لیے ہوئے گھر سے نکلی۔ یہ بچے بری طرح بسور رہے تھے۔

"بڑے میاں، الکسی کا کہیں پتہ نہیں۔"

نانا نے ہاتھ ہلاکر کہا: "اری نکل یہاں سے، ہٹ!" میں سیڑھی کے نیچے دبک گیا تاکہ یوجنیا مجھے پکڑ نہ لے جائے۔

کارخانے کی چھت گر پڑی تھی اور آتش زبان، دلکش شہتیریں آسمان کی طرف منہ اٹھائے نیچے پڑی تھیں۔ یک بیک ایک دھاڑ کے ساتھ عمارت کے اندر ایک سبز و سرخ طوفان سا آیا اور شعلے نئی امنگ کے ساتھ آنگن اور ان آدمیوں کی طرف لپک پڑے جو اس آتش بازی میں برف کے تودے پھینک رہے تھے۔

گرمی کے مارے دیغیں کھد بدا نے لگیں۔ بھاپ اور دھنوّیں کی آندھی سی آگئی اور ایک عجیب قسم کی بو کے مارے ہم سب کی آنکھوں سے پانی گرنے لگا۔ میں سیڑھی سے نکل کر نانی کے پانؤ کے پاس آگیا وہ چیخ پڑی: " ارے بھاگ، ورنہ کچل کر مرجائے گا"۔

اسی گھڑی ایک گھڑ سوار "تانبے کا خود پہنے ہوئے آنگن میں گھس آیا۔ اس کا گھوڑا جھاگ میں نہا سا گیا تھا اور کوڑا اوپر اٹھا کر وہ ڈپٹ کر بولا: " راستہ خالی کرو!"

گھنٹیاں خوشی کے مارے جلد جلد بجنے لگیں۔ یہ سارا سماں تیوہار کا سا تھا۔

نانی نے مجھے سیڑھی پر دھکیل کر کہا: " میری بات نہیں مانتا؟ ہٹ یہاں سے۔"

اس موقع پر مجھے حکم عدولی کی تاب نہ تھی۔ باورچی خانے میں جاکر میں کھڑکی سے چپک کر بیٹھ گیا۔ لیکن اتنی بھیڑ تھی کہ آگ نظر بھی نہ آتی تھی۔ صرف بال دار ٹوپیوں کے بیچ میں خودوں کی جھلک دکھائی پڑ جاتی تھی۔

دم بھر میں آگ بالکل بجھ گئی اور عمارت بھی معدوم ہوگئی۔ پولیس نے تماشائیوں کو کھدیڑ دیا۔

نانی باورچی خانے میں داخل ہوئی: " یہ کون ہے؟ ارے تو ہے۔ اب تک سویا کیوں نہیں۔ ڈر گیا۔ آئیں؟ آگ بجھ گئی، ڈرنے کی بات نہیں۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی لرزش کو میں محسوس کرسکتا تھا۔

رات کی تاریکی اور خاموشی سے قدرے اطمینان سا ہونے لگا۔ اتنے میں نانا بھی آئے اور چوکھٹ پر کھڑے کھڑے پوچھا: "بڑی بی ؟"

"کیا ہے جی ؟"

"تم جلیں تو نہیں"

"ذرا سا چرکا لگ گیا، کوئی بات نہیں۔"

نانا نے چقماق کی آگ سے قندیل سلگائی اور اس کا دھیا سا چہرا چمک اُٹھا۔ پھر وہ نانی کے قریب بیٹھ گیا۔

"نہانا ہی پڑے گا۔" نانی نے رائے دی۔ کیوں کہ وہ بھی دھوئیں میں لتھڑی ہوئی تھی اور اس سے جلانے کی بو آرہی تھی۔

نانا نے لمبی سانس لے کر کہا: "کبھی خدا تمھیں بھی سمجھ دے دیتا ہے۔" باچھیں چیر کر اُس کے کہنی ماری: "لیکن صرف ایک آدھ گھنٹے کے لیے۔"

نانی نے ہنس کر کچھ کہنا شروع کیا تھا کہ نانا نے بات کاٹ کر غصّے سے کہا: "گری گوری کو جواب دینا ہی پڑے گا۔ اس کی لاپرواہی سے یہ نقصان ہوا۔ اب نہ وہ کام کا رہا اور نہ اس میں دم رہا اور وہ اُلّو جاکوف باہر بیٹھا رو رہا ہے، اُسے جاکر سمجھاؤ۔"

نانی اپنی اُنگلیوں پر پھونک مارتی ہوئی باہر چلی گئی اور نانا نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے مجھ سے پوچھا: "تم نے شروع سے یہ ماجرا دیکھا ؟ یہ بھی دیکھا کہ تمھاری نانی کیسی بہادر ہے؟ یہ نہ بھولو کہ اب وہ بوڑھی ہوچکی ہے ——— خستہ و خراب، تھکی ہاری ——— تاہم، دیکھا تم نے ؟ . . . . ہشت دھت !"

دیر تک وہ ہاتھ پانو سمیٹے چپ بیٹھا رہا۔ پھر بتّی بجھاکر پوچھا:

"تم ڈر گئے تھے"

"نہیں تو"

"شاباش! ڈرنے کی کیا بات تھی"

جھلاہٹ سے قمیص اُتارتے ہوئے، وہ کونے میں رکھی ہوئی سلفچی کے پاس گیا۔ اندھیرے میں پیر پٹک کر وہ آپ ہی آپ کہنے لگا: "آگ سے بڑی مصیبت کیا ہوسکتی ہے۔ آتش زن کے سر بازار کوڑے لگنے چاہئیں یا تو وہ بدمعاش ہوگا یا احمق۔ ایسی سزا دی جائے تو کسی کا بیاؤ نہ ہو۔ اچھا، تم بیٹھے کیوں ہو، چلو سو رہو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن نیند آنکھوں سے کالے کوسوں دور تھی۔ ابھی میں نے پانو پھیلائے ہی تھے کہ ایک وحشت ناک چیخ نے میرے حواس باختہ کر دیے۔ میں باورچی خانے کو بھاگا۔ بیچوں بیچ نانا ننگے بدن ایک قندیل تھامے کھڑے تھے جس کی لو اُچھل رہی تھی۔ پانو پٹک کر وہ پکار رہے تھے:

"بڑی بی! ہاکوف! ارے کیا ہوا؟"

میں تندور کے کونے میں دبک گیا اور از سر نو مکان میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ در و دیوار کو دہلاتی ہوئی ایک کراہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی تھی پھر وہی تماشہ ہوا جو آتش زنی کے وقت دیکھا تھا۔ نانا اور ماموں بے وجہ اُچھلنے کودنے لگے۔ نانی انھیں ہٹاکر اللہ توبہ کرنے لگی۔ تندور میں لکڑی کے کندے ڈالنے اور کیتلی میں پانی بھرنے میں گرگوری نے سارا گھر سر پر اُٹھالیا۔ اونٹ کی طرح ڈگمگاتے ہوئے وہ باورچی خانے میں پھدکنے لگا۔

نانی نے ڈانٹ کر کہا: "تندور میں آگ تو دھکنے دے۔" وہ یہ کرنے چلا تو میری ٹانگ سے ٹکرا کر گر پڑا اور گھبرا کر پکارا یہ کون ہے؟ اوف اوہ! تم نے تو میری جان ہی لے لی تھی! جس برج میں دیکھو چاند شاہ ولی۔"

"آخر ہوا کیا۔"

نیچے اترتے ہوئے اس نے اطمینان سے کہا: "ہونا کیا۔ بی نتالیا نے ایک بچہ جن دیا۔"

مجھے یاد آیا کہ میری ماں میرے مرحوم بھائی کی پیدائش کے وقت اتنا نہ چیخی چلائی تھی۔

کیتلی آگ پر رکھ کر گری گوری ایک پائپ لیے ہوئے میرے پاس آ بیٹھا اور اسے دکھا کر بولا: "اس سے میری آنکھوں کو فائدہ ہوگا۔ نانی تو ناس سونگھنے کو کہتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تمباکو نوشی سے بینائی بڑھتی ہے۔"

پالتی مار کر وہ تندور کے کنارے بیٹھ گیا اور قندیل کی ٹمٹماتی ہوئی شعاع کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرا دھوئیں سے کالا ہو گیا تھا، قمیص کی ایک کور پھٹ گئی تھی اور اس سے اس کی چوڑی چوڑی پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور اس خلا سے ایک سرخ اور آب دیدہ آنکھ جھلکنے لگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی زخم کا نشان ہے۔

پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے وہ کان لگا کر حاملہ عورت کی دردناک چیخیں سننے لگا اور پھر کسی متوالے کی طرح اکھڑی اکھڑی آواز

میں بولا: "تمھاری نانی آگ میں ایسی جل بھُن گئی ہو کہ اس بیٹیا کی ماری کو شاید ہی مدد پہنچا سکے۔ سنو تو سہی کہ تمھاری ممانی کس طرح کراہ رہی ہو۔ کسی کو اس غریب کی سدھ ہی نہ رہی تھی۔ آگ لگنے کی دیر تھی کہ وہ دردِ زہ میں مبتلا ہو گئی۔ خوف کے مارے اس کی یہ حالت ہوئی۔ بچّہ پیدا کرنا اپنی جان پر کھیلنا ہو، تاہم عورتوں کی کون پرواہ کرتا ہو! لیکن میرا کہا یاد رکھنا —— عورتوں کا خیال پہلے کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ہماری مائیں ہیں ——"

یہ سنتے سنتے میری آنکھ لگ گئی۔ مگر دم بھر میں میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے تھے اور مائیکل ماموں شراب کے نشے میں چور اناپ شناپ بک رہے تھے۔ کوئی یہ بے تکے الفاظ دوہرا رہا تھا:

"صدر پھاٹک کھول دو ——!"

"اسے آدھے گلاس تیل میں اتنی ہی شراب ملا کر دو، اور چمچ بھر کاجل بھی حل کر دو۔"

ادھر مائیکل کسی بیہودہ بچے کی طرح لگاتار کہے جاتا تھا:

"اُسے میں بھی تو ایک نظر دیکھ لوں۔"

زمین پر وہ پانو پھیلائے بیٹھا تھا اور ہاتھ پٹک کر بیچ میں فرش پر تھوک دیتا تھا۔

تندور خاصا جہنّم بن گیا تھا۔ میں نیچے کود کر ماموں کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ دی اور میں منہ کے بل گر پڑا۔

"اُلو کا پٹھا!" میں بے اختیار پکار اُٹھا۔

اس نے اُچھل کر مجھے پکڑ لیا: "وہ پٹخنی دوں گا کہ —"

میں برآمدے میں شہ نشین کے نیچے چھپتے چھپتے نانا کے پانو تلے آ گیا۔ وہ مجھے الگ ہٹا کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا: "ہم سب پر خدا کی مار!"

مورت کا دِیا اس کے سر کے اوپر جگمگا رہا تھا، بیچ کمرے میں میز پر ایک قندیل سر دھن رہی تھی اور کہر آلود صبح زمستاں کا اُجالا کھڑکی پر ہویدا ہونے لگا تھا۔

نانا نے مجھ پر جُھک کر پوچھا: "آخر تجھے کیا ہوا ہے؟"

مجھے کیا نہیں ہوا تھا؟ سر بھاری بھاری، جسم تھکان سے چور لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا کیوں کہ مکان میں عجیب افرا تفری ہو گئی تھی۔ کمرے کی تمام کرسیوں پر اجنبی لدے ہوئے تھے۔ سُرخ لبادے میں ملبوس پادری اور فوجی وردی ڈانٹے ہوئے ایک عینک باز بوڑھا کئی آدمیوں کے ساتھ یوں دم سادھے بیٹھے تھے گویا یہ ٹوٹے ہوئے بُت یا پتھر کی مورتیں ہیں جو کسی کے انتظار میں محو ہیں۔ کہیں پاس ہی پانی کے چھڑکاؤ کی آواز پر ان کے کان لگے ہوئے تھے۔ دروازے پر جاکوف ہاتھ باندھے تنا ہوا کھڑا تھا۔ نانا نے اس سے کہا: "دیکھو اس لڑکے کو سُلا آؤ!"

ماموں نے مجھے اشارہ کیا اور پنجوں کے بل نانی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جب میں لیٹ چکا تو اس نے کان میں کہا:

"تیری ممانی نتالیا مر گئی۔"

مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ عرصے سے اس کی شکل نہ دیکھی تھی۔
نہ وہ ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ نہ باورچی خانے میں آتی تھی۔
"نانی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"وہاں" یہ کہتے ہوئے وہ پانو دبائے باہر چلا گیا۔
لیٹے لیٹے میں دروِ دالان کو تاکنے لگا۔ ایسا لگا کہ کھڑکی سے کئی سفید سر اپنی بے بصر آنکھوں سے ادھر دیکھ رہے ہیں۔ گو میں جانتا تھا کہ کونے کے صندوق پر نانی کے کپڑے رکھے ہیں لیکن اس وقت یہ محسوس ہؤا کہ وہاں کوئی زندہ جانور چُپ چاپ کھڑا ہؤا ہے۔ تکیہ کے نیچے میں نے منہ چھپالیا۔ صرف ایک آنکھ کھلی رہنے دی تاکہ دروازے پر نظر رہے۔ بہت جی چاہا کہ کود کر باہر بھاگ جاؤں۔ سخت گرمی تھی اور ایک مکروہ بدبو دم گھونٹ رہی تھی جو مجھے اس رات کی یاد دلانے لگی جب سگنوک مرا تھا اور اس کا خون دروازے پر جم گیا تھا۔
میرے دل یا دماغ میں کوئی چیز پیچ و تاب کھانے لگی۔ اس مکان کے سارے تاثرات گاڑیوں کی ایک لمبی قطار کی طرح میرے آگے آگئے اور گویا میں ان کے نیچے کچل گیا۔
دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اسے کاندھے سے بند کرکے نانی قریب آئی۔ چراغ کے آگے ہاتھ پھیلا کر وہ بچوں کی طرح بلک اٹھی۔
"ارے میرا ہاتھ! اس میں کتنا سخت درد ہے!"

———— ⁘ ————

# باب ۵

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک تازہ مصیبت کا سامنا ہؤا۔ شام کو چائے ختم کرکے میں نانا کے ساتھ کتابِ زبور کا وِرد کر رہا تھا اور نانی برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اتنے میں جاکوف حیران و پریشان کمرے میں گھس پڑا۔ اس کے بال تو ہمیشہ بکھرے رہتے تھے لیکن اس وقت اس کی شکل اور جھاڑو میں کوئی فرق نہ تھا دعا سلام کے بغیر ٹوپی کونے میں پھینک کر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں تیزی سے بولنے لگا:

"مائیکل نے خواہم خواہ کا ہنگامہ مچا رکھا ہے! میرے ساتھ کھانا کھانے کے بعد وہ اتنی شراب پی گیا کہ اب اپنے آپے میں نہیں ہے۔ برتن بھانڈے توڑ دیے، کھڑکی چور چور کر دی اور کچھ مال کا ستیاناس کرکے اس نے مجھے اور گری گوری کو خوب گالیاں دیں۔ اب وہ آپ کی خبر لینے کے ارادے سے یہاں آ رہا ہے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے: "میں ابّا کی ڈاڑھی نوچ کر رہوں گا۔ آج ان کی جان نہ چھوڑوں گا۔ اب آپ اپنی خیر منائیے۔"

نانا بمشکل اُٹھ کھڑا ہؤا۔ اس کے ہاتھ میز پر ٹکے ہوئے تھے، پر چینٹ پڑ گئی تھی، چہرا سوکھ کر لنبا ہو گیا تھا اور اس میں رحم کا نام

بھی نہ رہا تھا۔

نانا نے گلا پھاڑ کر کہا: "بڑی بی کچھ سُنا؟ اب کیا کہتی ہو؟ بیٹا باپ کو قتل کرنے آرہا ہے! سچ ہے، مجھے اب مرجانا چاہیے۔"

وہ تن کر کواڑ تک گیا اور اس سے لوہے کی ارگل اُتارلی اور جاکوف کو مڑکر دیکھا: "یہ تماشا اس لیے رچایا گیا ہے کہ اپنی بہن کے جہیز پر قبضہ کرلو۔ کیوں؟"

اور وہ جاکوف کے مُنہ پر حقارت سے ہنسنے لگا۔ یہ جھلاّ کر بولا: "مجھے اس سے کیا کرنا ہے؟"

"ارے تو؟ میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔"

برتنوں کو جلد جلد ہٹاتے ہوئے نانی خاموش رہی۔

نانا نے تلخی سے قہقہہ لگایا: "بیٹا، شکریہ تمھارا! بہت خوب! بڑی بی، اس بھیڑیے کو لوہے کی ایک چھڑ تو دینا۔ جاکوف، میں چاہتا ہوں کہ جب تیرا بھائی یہاں آئے تو تو اُسے قتل کردے!"

ماموں جیب میں ہاتھ ڈال کر کونے میں ٹہلنے لگا:

"اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو خیر ——"

نانا نے پیر پٹک کر کہا: "تجھ پر اور اعتبار! —— نہیں، میں کسی کُتّے یا سانپ پر یقین کرلوں گا لیکن تجھ پر ہرگز نہیں! میں تجھے پہچانتا ہوں۔ تو نے اسے شراب پلاکر یہ سب گُر سکھائے ہیں۔ اچھا اب تو چاہتا کیا ہے؟ مار ڈال —— اسے یا مجھے، دونوں میں سے ایک کو!"

نانی نے میرے کان میں کہا: "اوپر جاکر کھڑکی سے دیکھتا رہ۔

جیسے ہی مائیکل سڑک پر نظر آئے دوڑ کر خبر کر دینا چل بھاگ !"
اپنے بدمعاش ماموؤں کے حملے کے خوف سے میں ڈرا ہوا تو تھا لیکن اپنے فرض کی اہمیت کا فخر بھی تھا۔ کھڑکی سے میں سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اس پر گرد کی ایسی موٹی تہ چڑھ گئی تھی کہ کچھ دیکھنا آسان نہ تھا۔ بائیں جانب سڑک دور تک چلی گئی تھی۔ ٹیلیا سے ہو کر وہ بڑے چوک تک نکل گئی تھی اور وہاں ایک پرانی عمارت اپنے چار میناروں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ دراصل یہ پرانا قیدخانہ تھا اور اس میں اب تک غم آشنا حُسن کی شان باقی تھی۔ داہنی سمت، صرف تین مکانوں کے بعد چھوٹا چوک نظر آتا تھا۔ یہ جیل کے افسروں کی بارک کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے بیچ میں ایک آتش مینار تھا جس کے جھروکے سے سنتری بندھے ہوئے کتوں کی طرح تاکا کرتے تھے۔ ٹیلیا اور اس چوک کے بیچ میں ایک طرف چھوٹی سی جھاڑی اور دوسری طرف اُس اندھی باؤلی نے فصل پیدا کر دیا تھا جس میں میری نانی کی روایت کے مطابق دونوں ماموں نانا کو ڈبو دینا چاہتے تھے۔ ہماری کھڑکیوں کے سامنے ایک چھوٹی سی گلی تھی جو "تین حواری" نامی تنگ و تاریک کلیسا تک جاتی تھی۔ سیدھے دیکھو تو اس کی چھت پر اوندھی کشتی کا گمان ہوتا تھا جو باغ کی سبز موج نما روش پر پڑی ہوئی ہو۔ جاڑے کے برفانی طوفانوں اور برسات کی جھڑیوں نے ہمارے محلے کے بیرنگ مکانوں کو مٹ میلا بنا دیا تھا۔ کلیسا کی چوکھٹ پر کھڑے ہوئے بھکاریوں کی طرح وہ ادھ کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور

معلوم ہوتا تھا کہ میری طرح وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی کھڑکیوں تک سے شک و شبہ کی بو آتی تھی۔

سڑک پر چند سیلانی یوں مٹرگشت کر رہے تھے گویا متفکر تل چٹے تندور پر چل رہے ہوں۔ اتنے میں گرمی کا ایسا بھپکا آیا کہ دم گھٹنے لگا۔ دراصل یہ پیاز اور گاجر کی بُو تھی جو پتیلی سے نکل کر مجھ تک آگئی تھی۔ اس بو سے ہمیشہ میری طبیعت متلا جاتی تھی۔

ایسی وحشت ہونے لگی کہ بیان نہیں کرسکتا۔ یہ معلوم ہوا کہ سینہ گرم گرم سیسے سے بھرا ہوا ہے اور یہ پسلی توڑ کر باہر نکل رہا ہے۔ ایسا لگا کہ میں پھول کر غبارہ ہوگیا ہوں۔ مگر دیکھا تو میں صحیح سلامت اس تابوت نما کوٹھری میں جوں کا توں دھرا ہوا تھا۔

آنکھ اُٹھائی تو ماموں مائیکل نظر آئے۔ یہ حضرت مکانوں کی آڑ میں چھپ کر کھڑکی کی موڑ سے جھانک رہے تھے۔ اپنی ٹوپی سے کان چھپانے کا لاکھ جتن کرتے لیکن وہ پھر اُبھر آتی تھی۔ وہ ایک بھوری صدری اور ایک گرد آلودہ بوٹ ڈانٹے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ پتلون میں تھا اور دوسرا ڈاڑھی کی بلائیں لے رہا تھا۔ ان کا چہرا تو نظر نہ آتا تھا لیکن تیور کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی نانا کے مکان کو اپنی مٹھی میں دبالیں گے۔ مجھے نیچے دوڑ کر اس کی آمد کی اطلاع دے دینا تھا لیکن میں ہکّا بکّا کھڑکی کے پاس کھڑا رہا، اس وقت تک جب کہ مائیکل نے بوٹ کی گرد جھاڑنے کے لیے پاؤں نہ پٹک لیے اور سڑک کے اس پار نہ آگیا۔ اس نے میخانے کا دروازہ اس زور سے کھولا کہ وہ چوں بول گیا اور شیشے ٹکرا گئے۔ میں فوراً دوڑا اور

نانا کی کوٹھری کھٹ کھٹائی۔

اس نے ڈانٹ کر پوچھا: "کون ہے؟ ... اچھا تو ہے، کیا خبر ہے؟"

"وہ کلہار کی دوکان میں داخل ہوئے ہیں۔"

"ہوں ... خیر، تو اپنی جگہ پر مستعد رہ۔"

"لیکن مجھے وہاں ڈر لگتا ہے"

"تو کیا کیا جائے۔"

میں پھر اپنے پہرے پر ڈٹ گیا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ سڑک دھول سے پٹ کر بالکل کالی ہوگئی تھی۔ آس پاس کی کھڑکیوں سے روشنی کی کرنیں نکل آئی تھیں۔ اور سامنے کے گھر سے کسی باجے کی درد انگیز مگر دل کش آواز آرہی تھی۔ میکدے میں بھی گانا ہو رہا تھا دروازہ کھلتا تھا تو ایک نحیف و نزار صدا تڑپ کر رہ جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اُس لنگڑے فقیر کی آواز ہے۔ اس ڈرھیل بڈھے کی ایک آنکھ مصنوعی تھی اور دوسری کو وہ ہمیشہ بند رکھتا تھا۔ دروازہ بند ہوتا تو یہ گمان ہوتا کہ کسی نے کُلھاڑی سے اس کے گیٹ کے دو ٹکڑے کر دیے۔

نانی کو اس فقیر سے ایک قسم کا رشک تھا۔ اس کے گیت سُن کر وہ سانس بھر کر کہا کرتی: "اسے کہتے ہیں کمال! اسے کتنے گیت بزبان ہیں۔ خدا داد بات ہے ــــــ"

کبھی کبھی وہ اسے آنگن میں بُلا لاتی۔ سیڑھی پر بیٹھ کر یا تو وہ گاتا یا کوئی داستان چھیڑ دیتا۔ نانی پاس بیٹھی بڑے غور سے سُنتی اور بیچ بیچ میں اسے ٹوک دیتی:

"پھر کیا ہُوا . . . . . تو کیا حضرت مریم رُوس بھی آئی تھیں ؟"
اور وہ بڑے یقین سے جواب دیتا: "ان سے زمین کا کوئی کونا چھوٹا ہی؟"
ایک نامعلوم خواب آور تکان کی سی کیفیت مجھے نڈھال کر دیتی تھی اور اس کا بوجھ دل و نظر کو جُھکانے لگتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ای کاش نانی نہیں تو نانا ہی میرے پاس آجائیں۔ میں سوچنے لگتا تھا کہ میرے ابّا میں ایسی کون سی بات تھی کہ میرے ماموں اور نانا اسے ناپسند کرتے ہیں لیکن نانی اور گری گوری اس کی تعریف کرتے ہیں اور میری ماں کہاں ہی؟ اب میں روز اسے یاد کرتا تھا اور نانی نے جتنی کہانیاں سُنائی تھیں وہ ان کا مرکز بن گئی تھی۔ اس وجہ سے اس کی عزت میرے دل میں دوبالا ہوگئی کہ اس نے اپنے کنبے میں رہنا گوارا نہیں کیا۔ میرے تخیّل میں وہ رہزنوں کے ساتھ کسی سرائے میں رہتی تھی اور یہ سب امیر راہ گیروں کا مال چھین کر غریبوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جنگل میں شریف ڈاکوؤں کے ساتھ رہتی ہو اور ان کا گھر بار دیکھنے کے علاوہ مال اسباب کی حفاظت کرتی ہو۔ یہ بھی عجب نہیں کہ وہ زمین دوز خزانوں کی چھان بین میں دنیا کا سفر کر رہی ہو ——— ڈاکوؤں کی سردار انگلی چیف کی طرح جو مریم کے ساتھ پھرا کرتی تھی اور بہت ممکن ہی کہ مریم اسے بھی یہی نصیحت کرے:

"اری او مت ماری بدذات، ذرا کچھ میری بات بھی مان!
لوٹ لوٹ کر جوڑ چولی سونے روپے کی کان!
تھوڑے دن کے عیش کی خاطر یہ سب کیا جنجال!

تیری ہوس کو دیکھ دیکھ کر دُنیا ہے بدحال!

اس کے جواب میں اسی ڈاکٹی کے الفاظ میں میری ماں کہے گی:

"حضرت مریم معاف کرو — میری بھی کچھ عرض سنو
ایک ہے بچہ چھوٹا سا — ننھا سا اور مُنّا سا
اس کی خاطر چور ہوں میں — ماں ہی ہوں — مجبور ہوں میں"

اور مریم جو نانی کی مانند نیک دل تھی اسے معاف کر کے یہ نصیحت کرے گی:

"بخشش کے لیے تیری سولی پہ چڑھا عیسیٰ
کچھ دھیان رہے اس کا او سنگِ دل انگلی شا
مغلوں کو اگر لوٹو تو پوری ہے آزادی
کافر کی موت — واللہ یہ ہے نوید شادی
روسی کا مگر ہرگز ہووے نہ بال بیکا!!"

اس قصّے کی یاد میں میں ایسا ڈوب گیا گویا یہ کوئی سُپنا ہے میں یہ خیالی پلاؤ پکا ہی رہا تھا کہ نیچے آنگن کی طرف سے مار پیٹ اور چیخ پکار کی آواز آئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ نانا، ماموں جاکوف اور شراب خانے کا نوکر ملیان، سب مل کر مائیکل کو باہر نکال رہے ہیں۔ وہ وار کرنے سے نہ چوکتا تھا لیکن ان تینوں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ بالآخر وہ دروازے سے نکل کر منہ کے بل سڑک پر جا گرا۔ دروازہ بند ہو گیا اور اس میں اندر سے زنجیر چڑھ گئی اس ہنگامے کی یاد دلانے کے لیے ایک پھٹی پُرانی ٹوپی سڑک پر پڑی رہ گئی۔ پھر چہار سو سنّاٹا چھا گیا۔

کچھ دیر بے حرکت پڑے رہنے کے بعد میرا ماموں اُٹھ کھڑا ہوا
اس کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے اور جسم لہولہان تھا۔ ایک پتھر اٹھا
کر اس نے زور سے دروازے پر دے مارا۔ اس کے جواب میں نانا ہوں
کا گروہ گالی بکتا اور آستین چڑھاتا ہوا سڑک پر جھپٹ پڑا۔ آس
پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں پر سر ہی سر نمودار ہو گئے۔ سڑک پر
ہنستے بولتے آدمیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ یہ سب کسی قصے سے کم دلچسپ
نہ تھا اور ساتھ ساتھ عبرتناک بھی تھا۔ یک بیک سارا تماشہ ختم
ہوگیا۔ آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ اور ہر چیز آنکھ اوجھل ہوگئی۔

× × × × × × × × ×

کواڑ کے پاس ایک صندوق پر نانی دم سادھے جھکی ہوئی بیٹھی
قریب جاکر میں اس کے گرم و گداز گالوں کو تھپکنے لگا۔ لیکن اسے
اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں لگاتار بدبدانے
لگی: "خدا! کیا میں اور میرے بچے تیری رحمت سے محروم ہی
رہیں گے؟ رحم کر رحم"!

اس مکان میں نانا کو آئے سال بھر بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن اسی
عرصے میں اس کی ہنگامہ پروری کا چرچا پھیل گیا تھا۔ ہر اتوار کو
ہمارے گھر کے آگے محلے کے لونڈے یہ چلاتے ہوئے جمع ہوجاتے
تھے: "کشرن کے گھر میں پھر مار پٹائی ہو رہی ہے!"

مائیکل اکثر شام کو آتا تھا اور رات بھر مکان کا محاصرہ کیے
رہتا تھا۔ ہم سب کی جان ضیق میں پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ دو تین
ذلیل غنڈوں کو اپنی کمک پر لے آتا تھا۔ یہ چُپ چاپ باغ میں

گھس آتے تھے اور شراب کے نشے میں ساری کیاریوں کو نوچ ڈالتے تھے۔ کبھی وہ دھوبی گھر پر دھاوا بول دیتے اور جو چیز سامنے آتی اسے توڑ ڈالتے تھے۔ کیتلی، تندور، فرش، دروازے کی چوکھٹ۔ غرض کہ ہر چیز ان کے لیے برابر تھی۔

نانا بے زبان و بے حرکت کھڑکی کے پاس کھڑے ان غارت گروں کی حرکت کو دیکھا کرتے تھے۔ لیکن نانی اندھیرے کونے سے نکل کر آنگن میں جاتی اور گڑگڑا کر کہتی:

"مائیکل تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

اس کے جواب میں وہ درندہ پاگل کتے کی طرح بوکھلا کر نہایت فحش گالیاں دینے لگتا تھا۔ اسے اپنے کہے کرے کا ذرا بھی ہوش نہ تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس موقع پر نانی کا پیچھا نہ پکڑنا چاہیے لیکن تنہائی سے گھبرا کر میں نانا کے کمرے میں دبک جاتا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ پڑتا: "صورت حرام! بھاگ یہاں سے!"

دوڑ کر میں اوپر کی کوٹھری میں چڑھ جاتا تھا اور روشن دان سے جھانک کر باغ میں نانی کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس خوف سے کہ یہ لُچّے اسے کہیں مار نہ ڈالیں، میں رو رو کر اسے بلاتا تھا مگر وہ نہ آتی تھی۔ البتہ میرا شرابی ماموں میری آواز پہچانتے ہی میری ماں کو گندی گالیاں دینے لگتا تھا۔

ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے۔ نانا کی طبیعت ناساز تھی اس کا سر بھیگے ہوئے تولیے میں لپٹا ہوا تکیے پر بے چینی سے ہل رہا تھا اور

وہ آہ بھر کر یہ کہتا جاتا تھا:

"اسی دن کے لیے میں نے گناہوں اور روپیوں کا انبار لگایا تھا! جگ ہنسائی کا خیال نہ ہوتا تو میں پولیس میں رپٹ کرکے کل اسے بندھوا دیتا۔ لیکن دنیا کیا کہے گی! یہی نا کہ باپ بیٹے پر مقدمہ چلا رہا ہے، خون سفید ہوگیا ہے۔ ارے بھائی، خون کا گھونٹ پی اور یہ سب سہے جا!"

لیکن اچانک وہ پلنگ سے کود کر لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس گیا: "ارے مائیکل! ڈاکو! پاگل کتے!"

یہ کہنے کی دیر تھی کہ کھڑکی کا اوپری شیشہ تڑاخ سے چکنا چور ہوگیا اور پتھر نانی کے پاس کی میز پر بھد سے گر پڑا۔ نانا گلا پھاڑ کر چلّایا: "ارے میرا سر کس دن کے لیے باقی رکھا!"

نانی نے بچے کی طرح اسے گود میں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بار بار یہ دوہرانے لگی:

"تمھارے دل میں کیا سمائی ہے؟ خدا تم پر رحم کرے! جانتی ہوں کہ اس کی قسمت میں کالا پانی لکھا ہے۔ کمبخت کو اس کا ہوش بھی نہیں کہ کالا پانی کیا چیز ہے۔"

غصے کے مارے پانو پٹک کر اور سسکیاں بھر کر، رندھی ہوئی آواز میں نانا نے کہا: "میرا خون اس کی گردن پر ——"

باہر دیوار پیٹنے اور چیخنے چلّانے کا شور ہو رہا تھا۔ میز سے وہ پتھر اٹھا کر میں کھڑکی کی طرف لپکا ہی تھا کہ نانی نے مجھے پکڑ کر کونے کی طرف دھکیل دیا: "شیطان کہیں کا"

ایک مرتبہ مائیکل ایک لاٹھی لیے ہوتے غلام گردش میں گھس آیا اور سیڑھی پر چڑھ کر دروازہ توڑنے لگا۔ لیکن ادھر نانا پہلے سے ڈنڈا لیے اس کی خاطر کو مستعد تھے اور اس کی کمک پر دو سونٹے باز کرائے دار بھی موجود تھے۔ کلہار کی بیوی بھی بیلن لیے تیار کھڑی تھی نانی پنجے دبائے نانا کے پاس کھڑی خوشامد کر رہی تھی: "مجھے تو اس کے پاس جانے دو! میں اسے سمجھا لوں گی۔"

نانا ایک پانو بڑھائے اس پیتڑے سے کھڑے تھے کہ بھالو کا شکار نامی تصویر کا خیال آتا تھا، جس میں ایک شکاری اسی انداز سے بھالا تانے کھڑا تھا۔ نانا نے بنا کچھ کہے کہنی سے اسے پیچھے دھکیل دیا چاروں کمر کسے کھڑے ہوئے تھے۔ طاق پر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا اور اس کی دھندلی جوت ان کے چہروں پر ایک ملگجی روشنی ڈال رہی تھی۔ سب سے اوپر کی سیڑھی سے میں یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں منا رہا تھا کہ نانی یہاں آجائے۔

ماموں نے دروازہ توڑنے میں تو بڑی پھرتی دکھائی۔ ایک پٹ چوکھٹ سے الگ ہو گیا تھا اور دوسرا بھی چرمرانے لگا تھا۔

نانا اپنے مددگاروں سے یہی کہے جاتے تھے: "بھیا ہاتھ پانو کی جا ہے جو گت ہو لیکن اس پاگل کی کھوپڑی پر ہاتھ نہ پڑے۔"

اس دروازے کے قریب ایک چھوٹا سا جھروکا تھا جس سے بہ مشکل سر باہر جا سکتا تھا۔ مائیکل نے اس کے شیشے توڑ دیے تھے اور وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی شکل میں کسی کی سوجی ہوئی آنکھ سے ملتا جلتا تھا۔ نانی نے بے سوچے سمجھے اس میں سے سر نکال کر چیخ کر کہا:

"مائیکل! خدا کا واسطہ، جان عزیز ہی تو بھاگ جا! یہ لوگ تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن مائیکل نے اسے ایک لاٹھی رسید کردی۔ اندر سے صاف نظر آیا کہ کوئی بھاری سی چیز اس کے ہاتھ پر گری اور نانی اسی آن نیچے گر پڑی۔ گر کر بھی وہ پکارتی گئی:

"مائی ــــــ کل! بھاگ جا۔"

نانا نے وحشت زدہ آواز میں پکارا: "بڑی بی! کہاں گئیں۔"

دروازہ اڑا کر گر پڑا اور چوکھٹ پر ماموں کی صورت نظر آئی اسی گھڑی اس پر ایسا حملہ ہوا کہ وہ سیڑھی کے نیچے جا گرا۔

کمہار کی بیوی نانی کو اس کی کوٹھری میں اٹھا لے گئی۔ نانا بھی پیچھے پیچھے آیا اور اداسی سے پوچھا "ہڈی تو نہیں ٹوٹی؟"

آنکھیں بند کر کے نانی کراہنے لگی: "معلوم ہوتا ہی کہ سارا جسم چورا ہوگیا ہی.... لیکن تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟" نانا نے سختی سے کہا: "تم دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو؟ کیا میں کوئی بھیڑیا ہوں؟ وہ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کوٹھری میں ڈال دیا گیا ہی اور میں نے اسے پانی سے شرابور کردیا ہی۔ میں بھی کہتا ہوں کہ یہ بری بات تھی لیکن اس کی ذمہ داری کس پر ہی؟"

نانی کراہتی گئی۔

نانا پلنگ کے پائتانے بیٹھ گیا: "ہڈی بٹھانے والی آتی ہی ہوگی تب تک دل مضبوط رکھو.... بڑی بی، ان لوگوں نے ہمیں برباد کرنے کا تہیّہ کرلیا ہی۔"

"جو وہ مانگتے ہیں دے دو"

"اور لڑکی کا کیا ہوگا؟"

دیر تک وہ اس معاملے پر بحث کرتے رہے — نانی عاجزی اور ملال سے نانا غصّہ سے اور طیش سے۔

اتنے میں ایک پستہ قد کبڑی بڑھیا اندر آئی۔ اس کا دہانا ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلا ہوا تھا، منہ مچھلی کی طرح کھلا تھا نچلا جبڑا کانپ رہا تھا اور ہونٹ پر ایک نکیلی ناک دھری ہوئی تھی۔ آنکھوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کی برساتی تو جنبش کرتی تھی لیکن پاؤں کی حرکت کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بقچہ تھا جو کھڑکھڑاتا جاتا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ نانی کی جان لینے آئی ہے۔ میں اس پر ٹوٹ پڑا اور گلا پھاڑ کر چلّایا "نکل جا یہاں سے!"

نانا نے بے مہری سے مجھے پکڑ لیا اور تیکھی چتونوں سے گھورتے ہوئے اوپر لے جاکر بند کر دیا۔

---

# باب ۶

آمد بہار کے ساتھ دونوں ماموؤں نے اپنی اپنی راہ لی۔ جاکوف شہر میں رہا اور مائیکل نے ندی کنارے ڈیرا ڈالا۔ ادھر نانا نے ایک کشادہ اور آرام دہ مکان خرید لیا۔ پہلی منزل میں ایک شراب خانہ تھا۔ اوپر کئی چھوٹے چھوٹے آسایش بخش کمرے تھے۔ باغ بھی تھا جو پُلیا تک پھیلا ہؤا تھا اور بید مجنوں کی بے برگ شاخوں سے لہلہا رہا تھا۔

باغ میں ٹہل کر جب میں نانا کے ساتھ صاف و سادہ سڑک پر آیا تو اس نے اپنی شریر اور متبسم آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا: "تیرے لیے بیدوں کی کمی نہیں ہے! اب میں خود تجھے سبق دوں گا اور یہ بیدیں خوب کام آئیں گی۔"

ہمارا گھر کرایہ داروں سے بھرا ہؤا تھا۔ صرف اوپر کی منزل میں ایک کمرا نانا کی خواب گاہ اور بیٹھک کے کام آتا تھا اور دوسری کوٹھری میں میں نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی کھڑکی سڑک کی طرف کُھلتی تھی۔ شام کو یا چھٹی کے دن اس سے جھانک کر دیکھو تو متوالے جھومتے جھامتے، گاتے بجاتے مے کدے سے باہر نکلتے نظر آتے تھے کبھی وہ سامان کی بوری کی طرح سڑک پر پھینک دیے جاتے تھے اور اُٹھ کر پھر اندر جانے کی کوشش کرتے تھے۔ دروازہ ان کی چوٹوں سے

کراہنے لگتا تھا اور دھینگا مُشتی شروع ہو جاتی تھی۔ یہ سارا تماشہ پُر لطف تھا۔

نور کے تڑکے نانا اپنے بیٹوں کے کارخانوں کا راستہ پکڑتے تھے اور دن بھر انھیں کاروبار کے گُر سکھاتے تھے۔ شام کو وہ لوٹتے تو تھکان سے چور اور غصّے سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔

نانی کی کھڑ بڑ دن بھر جاری رہتی تھی۔ کھانا، سینا، کبھی باورچی خانے میں تو کبھی باغ میں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کولھو کا بیل ہی جو کسی کوڑے کے ڈر سے چکّر لگا رہا ہی۔ چہرے سے پسینہ پونچھ کر وہ ہر دفعہ کہا کرتی: "جو دن بیت گئے ان کو ہزار سلام! اولیشا بیٹے اب ہماری زندگی کس خوشی اور اطمینان سے گزر رہی ہی؟ خدا کی لاڈلی، یہ سب تیرے دم کا ظہورا ہی!"

لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس قسم کا اطمینان ہی کیوں کہ صبح سے شام تک کرائے دار شور مچاتے اوپر نیچے اندر باہر آیا جایا کرتے تھے اور اس طرح پڑوس کا حق ادا کرتے تھے۔ بظاہر تو وہ بڑی جلدی میں ہوتے تھے لیکن واقعتاً ہمیشہ پھسڈی رہتے تھے ان کی شکایت کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا تھا اور وہ رہ رہ کر نانی کو پکارا کرتے تھے، "اجی بڑی بی! اکولنا اِوانووا!"

اور بڑی بی جگت نانی بنی ہوئی تھیں۔ وہ سب کی مشیرکار تھیں۔ جواب دینے سے پہلے وہ ناس سونگھ کر اپنی ناک اور انگلیوں کو احتیاط سے سُرخ رومال میں پونچھ لیتیں: "بھیّا، پسّو سے چھٹکارا چاہتے ہو تو روز نہاؤ اور اگر پسّو جسم سے چپک گئے ہیں تو چمچ بھر

گندھک میں اتنی ہی چربی ملاؤ اور تین رتی پارے میں حل کر کے
ان تینوں چیزوں کو لہسن کے عرق میں ڈالو اور کوری ہنڈیا میں
سات مرتبہ جوش دو پھر اسے مرہم کی طرح استعمال کرو۔ لیکن یہ یاد
رہے کہ لکڑی یا ہڈی کا چمچ لگایا تو پارہ ضایع جائے گا اور پیتل یا
چاندی کے چمچ سے چھوا تو نقصان دے گا۔"
کبھی بڑے غور و فکر کے بعد وہ یہ جواب دیتی تھی: "بھئی مجھے اس
معاملے میں دخل نہیں۔ تم چوک والے حکیم جی سے پوچھ آؤ۔"
وہ دائی کا کام بھی انجام دیتی تھی اور گھریلو جھگڑوں میں پنچ
بن جاتی تھی۔ بچوں کے امراض میں اسے بڑا دخل تھا۔ اور جب وہ
حضرت مریم کا درود سنایا کرتی تو عورتیں اسے فوراً ازبر کر لیتیں
گرہستی کے معاملات میں مشورہ دینے کو وہ ہمیشہ مستعد رہتی تھی:
"کدو خود خبر کر دیتا ہے کہ کب اسے توڑنا ہے۔ جب وہ زمین پر گر کر
ایک خاص قسم کی بو دینے لگے تو سمجھ جاؤ کہ اسے توڑنا ہے۔۔۔۔
دہی جمانے کے مختلف طریقے ہیں۔۔۔۔"
دن بھر میں اس کا دم چھلا بنا کبھی باغ یا آنگن میں اور کبھی
پڑوسیوں کے یہاں پھرا کرتا تھا۔ وہاں وہ گھنٹوں بیٹھی چائے پیتی اور
بھانت بھانت کے قصے سنایا کرتی تھی۔ میں گویا اس کے جسم کا ایک
حصہ بن گیا تھا اور زندگی کے اس دور میں اس بہادر بوڑھیا کی
یاد سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہ کبھی دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے
نہ چوکتی تھی۔
اس زمانے میں کسی نامعلوم مقام سے میری ماں چند گھڑیوں

کے لیے ہمیں دیکھنے آجاتی تھی۔ وہ ویسی ہی سخت گیر اور دامن کش تھی۔ اپنی بھوری اور بے حس آنکھوں سے زمستان کے سورج کی طرح وہ ہمیں دم بھر دیکھ کر پھر غایب ہو جاتی۔ اس کی یاد دلانے کو کوئی چیز باقی نہ بچتی تھی۔

ایک بار میں نے نانی سے پوچھا: "کیا تم جادوگرنی ہو؟" وہ ہنس پڑی: "توبہ کر لڑکے، تیرے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟" پھر کچھ سوچ کر بولی: "مجھے جادو ٹونے سے کیا نسبت؟ یہ فن نہایت دقت طلب ہے۔ میرے لیے تو الف کا نام بھالا ہے۔ البتہ تیرے نانا علم میں افلاطون سے کم نہیں۔ ۔ ۔ مگر مریم نے مجھے علم سے محروم رکھا"۔

جب اس نے یہ ذکر چھیڑا تو اس کی زندگی کا ایک نیا رخ مجھ پر روشن ہوا: "میں بھی تمھاری طرح یتیم تھی۔ میری ماں ایک غریب دیہاتن تھی اور وہ اپاہج بھی تھی۔ وہ ابھی بچی ہی تھی کہ ایک مردوے نے اس پر ہاتھ صاف کردیا۔ ڈر کے مارے وہ کھڑکی سے کود پڑی اور اس کی داہنی پسلی اور کاندھے میں ایسی چوٹ آئی کہ سیدھا ہاتھ ہمیشہ کے لیے سوکھ گیا۔ اسی عمر میں زردوزی میں اس نے کمال حاصل کرلیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد اس کے مالکوں نے جواب دے دیا۔ ہاتھ بنا روٹی کون کماسکتا ہے۔ مجبوراً وہ بھیک مانگ کر پیٹ پالتی تھی۔ لیکن اس زمانے کے لوگ زیادہ آسودہ اور رحم دل تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالاخانہ کے بڑھئی اور زردوز مشہور تھے اور ہر آدمی ہنر کا رسیا تھا"۔

برسات اور سردی میں اماں کے ساتھ شہر میں ہی کاٹتی تھی

لیکن جیسے ہی جبرائیل عصا ہلا کر سردیوں کو بھگا دیتا اور دنیا کو بہار پوش کر دیتا، ہم دونوں پھر اپنی نا معلوم منزل کو روانہ ہوتیں اور جدھر سینگ سماتا چل کھڑی ہوتیں۔ ہم نے کئی شہروں کی خاک چھانی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ بہار اور گرمیوں میں سفر کا لطف ہی، جب زمین مسکراتی ہی اور گھاس مخمل بن جاتی ہی، خدا کی ماں کھیتوں کو چمن چمن کر دیتی ہی۔ ہر برگ و شجر شادی کا پیامی ہوتا ہی اور دل سے دو بدو ہم کلام ہوتا ہی۔ جب ہم کسی پہاڑی پر چڑھتیں تو ماں گانے لگتی۔ اس کی آواز میں زور تو نہ تھا لیکن وہ گھنٹی کی طرح صاف تھی اس کے گیت سنو تو یہ لگتا کہ ہر ذرّہ گہری نیند سو گیا ہی۔ خدا جانتا ہی کہ وہ زندگی کتنی سہانی تھی"۔

"ابھی میں نو برس کی ہی ہوئی تھی کہ امّاں کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اگر لڑکی بھیک مانگتی پھری تو دنیا اسے دشنام دے گی اُسے اس زندگی پر شرم آنے لگی۔ وہ بالا خانے میں رہ پڑی اور گھر گھر جا کر بھیک مانگنے لگی۔ اتوار کو اور کسی تیوہار کے دن وہ گرجا گھر کے آگے کھڑی ہو جاتی اور خیرات مانگتی۔ میں گھر میں زردوزی کا کام سیکھتی۔ مجھے اپنی ماں کی مدد کا بڑا خیال تھا، اسی لیے یہ کام میں نے جلد سیکھ لیا۔ مگر کبھی کبھی کوئی نقشہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا اور میں رونے لگتی تھی۔ لیکن اس کم عمری کے باوجود دو سال میں میرا ہاتھ ایسا جم گیا کہ سارے شہر میں میری ہنرمندی کا چرچا ہونے لگا۔ جب کسی کو واقعی سچّے کام کی ضرورت ہوتی تو وہ ہمارے گھر آتا اور کہتا: اکولینا، دکھاؤ تو اپنا کمال! میری مسرّت کی انتہا نہ رہتی تھی...

وہ دن بھی کیسے اچھے تھے۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ امّاں کا کام تھا۔ کیوں کہ ایک ہاتھ نہ ہونے سے کیا ہوا وہی میری اُستاد تھیں اور ایک ہوشیار اُستاد دس کاریگروں پہ بھاری ہے"۔

"میں نے اتراکر کہا: اچھی امّی اب آپ بھیک پر لات ماریے میں اتنا کما سکتی ہوں کہ دونوں مزے سے رہ سکیں۔ لیکن اس نے جواب دیا: یہ نہ ہوگا۔ تمھاری کمائی تمھارے جہیز کے لیے جمع رہے گی"۔

"تھوڑے عرصے بعد تمھارے نانا سے ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی بائیس سال کی ہی عمر میں وہ آزاد کشتی راں ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ کی مجھ پر خاص شفقت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ ہنرمند ہونے کے علاوہ میں بھکارن کی بیٹی ہوں اور اس کی دھونس سہ لوں گی —— وہ بڑی بدمزاج اور بدنیّت تھی، لیکن گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا فائدہ —— بُرے لوگوں کا ذکر ہم کیوں کریں۔ خدا انھیں دیکھتا اور پرکھتا ہے اور صرف شیطان ان سے محبّت کرتا ہے"۔

اور وہ کھل کھلا کر یوں ہنستی تھی کہ اس کی ناک سُکڑ جاتی تھی اور اس کے الفاظ سے زیادہ اس کی مُسکراتی ہوئی آنکھیں مجھ پر مہر و محبّت کی بارش کرنے لگتی تھیں۔

× × × × × × ×

مجھے ایک خاموش شام کا خیال آتا ہے جب میں نانا کے کمرے میں نانی کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ نانا کی طبیعت خراب تھی اور وہ لباسِ شب میں کاندھے پر ایک چوڑا سا تولیہ لپیٹے پسینے میں شرابور ہانپ رہا تھا۔ اس کی سبز آنکھیں دُھندلی ہو گئی تھیں، چہرا سفید اور

سوُ جا ہُوا تھا۔ چھوٹے اور نُکیلے کان سُرخ پڑ گئے تھے اور اس نے چائے کی پیالی کے لیے جو ہاتھ پھیلایا وہ کانپ رہا تھا۔ اس کا انداز اتنا نرم پڑ گیا تھا کہ وہ کوئی دوسرا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چڑچڑے بچّوں کی طرح مچل کر وہ بولا: "میری چائے میں شکر کیوں نہیں ہے؟" نانی نے ملائمت سے کہا: "شہد ڈال دیا ہے، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔"

سانس روک کر اس نے ایک گھونٹ میں گرما گرم چائے غٹاغٹ پی لی اور کہا: "اگر اس بار میں مر نہ جاؤں تو نام بدل دینا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ دیکھو میں تمھیں ابھی چنگا کیے دیتی ہوں۔"

"باتیں بنانے سے کیا حاصل! لیکن اگر میں اس موقعہ پر مرا تو زندگی کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

"اچھا باتیں نہ کرو، چپ ہی رہو۔"

آنکھیں بند کر کے وہ لیٹ گیا، اپنے بے رنگ ہونٹوں کو چاٹنے لگا اور انگلی سے داڑھی میں کنگھی کرنے لگا۔ لیکن اچانک وہ یوں بدک پڑا گویا کسی نے کانٹا چُبھا دیا ہو اور زور زور سے اپنے دل کا راز بیان کرنے لگا: "مائیکل اور جاکوف کو جلد از جلد شادی کر لینا چاہیے۔ خاندان کا بار ذمّہ داری کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ کیوں جی تمھاری کیا رائے ہے؟" پھر وہ شہر بھر کی کنواری لڑکیوں کے نام گنانے لگا۔

لیکن پے در پے چائے کی پیالیاں خالی کرتے ہوئے نانی چپ رہی۔ میں کھڑکی سے شفقِ شام کا نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان سُرخ سے سُرخ تر ہوتا گیا اور سامنے کے مکانوں کے جھروکوں پر اس کا

خونیں پرتو نظر آنے لگا۔ کسی گناہ کی پاداش میں نانا نے مجھے باغ یا دالان میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ جبن کے پیڑوں پر بھونرے پر جھاڑ رہے تھے، بازو کے آنگن میں ایک مزدور کام کر رہا تھا اور کہیں قریب ہی کوئی چھری تیز کر رہا تھا۔ پیڑوں کے جھرمٹ کی آڑ سے اور پلیا کی اوٹ سے بچوں کا شور آ رہا تھا۔ یہ سب آوازیں مجھے پاس بلا رہی تھیں اور جھٹپٹے کا سماں میرے دل میں غم گھول رہا تھا۔

یکایک نانا نے کسی کونے سے ایک نئی کتاب نکال کر زور سے ہاتھ پر ماری اور کڑک کر مجھے پکارا۔

"چل بے بدمعاش ادھر آ! - یہ ہی پہلی کتاب۔ یہ ہی الف، میرے ساتھ دوہراتا جا . . . الف ب پ

"یہ کیا ہی؟"

"ب"

"ٹھیک اور یہ؟"

"پ"

"غلط، یہ ہی ت۔ اچھا آگے چلو۔ ج چ ح"

"یہ کیا ہی؟"

"ج"

"شاباش! اور یہ؟"

"چ"

"ٹھیک اور یہ؟"

"ب"

نانی نے بات کاٹ کر کہا: "بڑے میاں تمھیں آرام کرنا چاہیے۔"

"آخر اس سے میرا کیا بگڑتا ہے۔ جی بہلتا ہے اور خیال بٹتا ہے۔ چل الکسی آگے پڑھ۔"

اپنا گرم اور گیلا ہاتھ اس نے میری گردن میں ڈال دیا اور حروف کو گویا میرے شانوں میں کو چبھنے لگا۔ اس کے منہ سے سرکے کی بو آرہی تھی اور اس پر طرفہ کچی پیاز کی بدبو تھی۔ میرا تو دم گھٹنے لگا۔ ادھر اس کا غصّہ بھڑک پڑا اور وہ میرے کان میں چیخنے لگا:

"س ش۔" ان آوازوں سے تو میں آشنا تھا لیکن ان کی شکلیں میرے لیے انوکھی تھیں۔ کوئی حرف مکڑی سے ملتا تھا تو کوئی گری گوری کے کاندھے سے اور ایک پر تو یہ گمان ہوتا تھا کہ میں نانی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ نانا جان تمام حروف میں مشترک ہیں۔

اس نے بیسیوں بار مجھے سبق رٹایا، کبھی تو سلسلے وار اور کبھی بے سلسلہ۔ اس کی گرم مزاجی یقیناً متعدی ہوگی کیوں کہ میں بھی پسینے میں نہا گیا اور گلا پھاڑ کر جواب دینے لگا۔ اِس سے اُسے بڑا لطف آیا۔ کھانستے کھانستے اس نے کتاب پھینک دی اور منمنانے لگا:

"بڑی بی، لونڈے کی غرّاہٹ سُن رہی ہو، ابے استراخانی دیوانے تو شور کیوں مچا رہا ہے؟ ایں؟"

"لیکن شور تو آپ مچا رہے تھے۔"

مجھے اس آن نانا اور نانی کو دیکھ کر بڑا مزا آیا۔ وہ میز پر کہنی ٹیکے ہم دونوں کی حرکتیں دیکھتی ہوئی زیرِ لب ہنس کر بولی: "تم دونوں

کی یہی حالت رہی تھی تو ہنسی کے مارے باؤلے ہو جاؤ گے۔"

نانا نے دوستانہ لہجے میں کہا: "بیماری کی وجہ سے میں چڑچڑا ہو گیا ہوں۔ لیکن تجھے کیا ہوا ہی؟ ائیں؟" پھر اپنا گیلا سر ہلا کر وہ نانی سے بولا، "خدا بخشے تتالیا کو غلط فہمی ہوئی تھی جو وہ کہتی تھی کہ اس کا حافظہ خراب ہی۔ خدا جانتا ہی کہ یہ بلا کا ذہین ہی۔ اچھا چل بے بھوندو!"

آخر اس نے ہنس کر مجھے پلنگ سے کھدیڑ دیا۔

"اتنا کافی ہی۔ کتاب لے جا اور اگر کل تو نے سارا ابجد صحیح صحیح سُنا دیا تو میں تجھے انعام میں اِکنّی دوں گا۔

میں نے کتاب کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے مجھے لپٹا لیا اور کہا: "بیٹیا، تیری ماں کو تیری فکر نہیں ہی۔"

نانی چونک پڑی: "بڑے میاں کیا تمھیں بچّے سے ایسی بات کہنی چاہیے۔"

"بیشک مجھے یہ نہ کہنا تھا ـــــ مگر اپنے جذبات کو کیسے ضبط کروں۔ ارے ایسی اچھی لڑکی کو یوں ستیاناس ہونا تھا!"

اس نے مجھے دھکا دے کر کہا: "چل بھاگ یہاں سے! جی چاہے تو باہر ہو آ لیکن سڑک پر قدم رکھا تو ٹانگ توڑ دوں گا۔ آنگن یا باغ میں ہی رہنا۔"

میرا جی خاص طور پر باغ میں لگتا تھا۔ میں اس کے ٹیلے پر چڑھا ہی تھا کہ پلیا پر سے لونڈوں نے مجھ پر سنگ باری شروع کر دی۔ میں نے بھی بدلا چکانے میں کسر نہ رکھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب جھولی

ہیں پھر بھر کر شور مچانے لگتے تھے: "چغد آگیا، چغد آگیا، اس کے پر کترلو"

مجھے چغد کا مطلب نہ معلوم تھا، اس لیے یہ لفظ کچھ معیوب نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس خیال سے مجھے قلبی اطمینان ہوتا تھا کہ ہیں اکیلا دم پوری فوج سے لڑ رہا ہوں، خصوصاً اس وقت جب میرا نشانہ ان سب کو یہاں وہاں چھپ جانے کے لیے مجبور کر دیتا تھا۔ اس جنگ میں دشمنی کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا اور عموماً اس میں کسی کو چوٹ نہ آتی تھی۔

میں آسانی سے پڑھنا لکھنا سیکھ گیا۔ نانی مجھ پر زیادہ توجہ کرنے لگی اور اب مار پیٹ کا سلسلہ بھی بہت کم ہو گیا حالاں کہ میری رائے میں میں اب زیادہ سزاوار تھا کیوں کہ عمر اور طاقت کے ساتھ میں نانا کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتا جاتا تھا اور اس کی حکم عدولی کرتا تھا۔ لیکن اب وہ مکّا دکھانے یا گھڑکی دینے کے سوا زیادہ کچھ نہ کرتا تھا۔ اس سے میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ پہلے وہ مجھے بے وجہ پیٹا کرتا تھا اور میں نے یہ شبہ اس پر ظاہر بھی کر دیا۔

اس نے میرا منہ اوپر اٹھا کر، الفاظ کو چبا چبا کر کہا:

"کیا . . . . . . آں . . . . . . کہا ؟"

اور پھر مسکرانے لگا: "ابے کافر، تجھے کیا خبر کہ تیری کتنی پٹائی ہونا چاہیے ؟ میرے سوا کسے یہ معلوم ہو سکتا ہے؟ اچھا چل بھاگ جا!"

مگر یہ کہتے ہی اس نے میرا شانہ ہلا کر پوچھا:

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ در اصل تو مکّار ہے یا سیدھا۔"

"مجھے کیا معلوم۔"

"نہیں معلوم! اچھا تو میری نصیحت کان لگا کر سُن — مکّار بننا یہی کامیابی کا راز ہے۔ سیدھے پن اور بے وقوفی میں کوئی فرق نہیں۔ بھیڑ سے سیدھا کوئی نہیں یہ یاد رکھ۔ خیر، بھاگتا ہے یا نہیں'

—— × —— × —— × ——

کچھ عرصے میں میں اس قابل ہوگیا کہ ہجّے کرکے مناجات پڑھنے لگ گیا۔ شام کی چائے کے بعد مجھے ایک مناجات سنانا ہوتا تھا۔

پنسل سے کتاب کے حروف کو گرفت میں لاتے ہوئے میں پڑھنے لگا:

"رح م ت . . . . . رحمت ہو اُس پر . . . . . . . .

کس پر، کیا جاکوف ماموں پر؟" کوفت کم کرنے کے لیے میں نے یہ فقرہ جڑ دیا۔

نانا کا غصّہ بھڑک اُٹھا: "وہ چپت پڑے گی کہ سبق یاد ہو جائے گا"

لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ بن رہا ہے، کیوں کہ اس کا نظریہ تھا کہ ایسے موقعہ پر یہی مناسب ہے۔

میرا خیال ٹھیک تھا کیوں کہ گھڑی بھر میں وہ مجھے بھول گیا۔ اور خود بخود کہنے لگا: "ہاں ہاں! ناچ گانا ہو یا کھیل کود، حضرت سلیمان کی کینہ پروری کہیں نہ جاتی تھی۔ واہ جی حضرت، تم زبان و بیان کے راجا تھے تو ساتھ ساتھ مسخرے بھی تھے!"

کتاب چھوڑ کر میں اس کے متحیر اور شکن پر در چہرے کو دیکھنے لگا

اس کی جھپکتی ہوئی آنکھیں گویا میرے آر پار ہوئی جا رہی تھیں اور ان سے ایک اُداس جوت نکل رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ دم بھر میں ان میں وہی سرد مہری آجائے گی۔ میز پر وہ اُنگلی سے باجا سا بجانے لگا۔ اس کے داغ دار ناخون چمک رہے تھے اور سنہری بھنویں تلے اوپر ہو رہی تھیں۔

"نانا جان!"

"ایں؟"

"کہانی سُنائیے!"

اس نے یوں آنکھ مل کر گویا ابھی نیند سے جاگا ہو کہا:

"ابے پوستی، پڑھتا ہو یا نہیں! تجھے مناجات سے زیادہ قصّوں کا شوق ہے!"

مجھے شُبہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی کتاب زبور سے زیادہ قصہ کہانیوں کو پسند کرتا ہے۔ گو کہ اس نے یہ نیت باندھی تھی کہ سونے سے پہلے ایک بار اس کا وِرد کرے گا اور وہ ہر رات کو اسے منتر کی طرح جپا کرتا تھا گویا کوئی پادری بھجن گا رہا ہو۔

میری منّت سماجت کے آگے نانا کو پسیجتے ہی بنی اور یہ واقعہ ہے کہ وہ روز بروز زیادہ رحم دل ہوتا جاتا تھا: "اچھا بھائی! مجھے تو جلد خدا کے دربار میں جانا ہے اور کتاب زبور پڑھنے کو تو تیری عمر پڑی ہے!"

آرام کرسی کی گدّی کا ڈھاسنا لگا کر اور چھت کی طرف تاکتے ہوئے، وہ مجھے آہستہ آہستہ اپنے باپ اور پُرانے زمانے

کے حالات سُنانے لگا۔ ایک مرتبہ بالا خانے کے سیٹھ زیف کے گھر ڈاکہ پڑا
نانا کے ابّا خطرے کا گھنٹا بجانے کلیسہ کے مینار پہ چڑھے، مگر ڈاکوؤں
نے انھیں تلوار کے گھاٹ اُتار کر نیچے پھینک دیا۔

" اس وقت میں دودھ پیتا بچّہ تھا، اس لیے مجھے خود یہ واقعہ
یاد نہیں۔ پہلا آدمی جو مجھے واضح طور پر یاد آتا ہے وہ ایک فرانسیسی
تھا۔ اس وقت میری عمر ٹھیک بارہ سال کی تھی۔ شہر میں قیدیوں
کے تین گروہ لائے گئے تھے۔ وہ سب لاغر و نحیف تھے اور کئی کے
پاس پہننے کو فقیروں کی لنگوٹی تک نہ تھی۔ باقی سب جاڑے میں
ایسے اکڑ گئے تھے کہ بمشکل کھڑے ہو سکتے تھے۔ کسان انھیں قتل کیے
بغیر نہ چھوڑتے، لیکن سپاہیوں نے انھیں مار بھگایا۔ یہ فرانسیسی قیدی
بڑے دانا اور فرزانہ تھے۔ وہ سب ہنس مکھ بھی تھے اور ان سے ہم
لوگوں کی نبھ گئی۔ . . . کبھی وہ گانے بھی سناتے تھے۔ شہروں کے
رئیس گاڑیوں پر لد کر ان قیدیوں کو دیکھنے آتے تھے۔ ان میں سے
کچھ انھیں گالی سُناتے اور مار بیٹھتے تھے، مگر کچھ اُن سے نیک برتاؤ
کرتے۔ انھیں کی زبان میں بولتے اور انھیں پیسے دیتے تھے۔ ایک
بوڑھا امیر منہ ڈھنک کر روتے ہوئے بولا کہ کمبخت نپولین نے فرانس
کو تباہ کر دیا ہے . . . . . دیکھا تم نے! وہ روسی تھا اور پھر شریف
روسی۔ وہ نیک دل تھا اور ان پردیسیوں کا ہم درد تھا!"

پل بھر وہ چپ رہا اور آنکھ بند کر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔
بعد ازاں وہ بڑی صحت سے پُرانے حالات سُنانے لگا۔

" در و دالان میں برف جمی ہوئی تھی۔ یہ فرانسیسی کبھی میری ماں کے

مکان پر آتے اور کھڑکی کے نیچے کھڑے ہوکر بڑا شور مچایا کرتے۔ میری ماں روٹی بیچا کرتی تھی اور یہ گرم روٹیوں کی تلاش میں آتے تھے۔ ماں انھیں جھونپڑی میں آنے کی اجازت نہ دیتی تھی بلکہ کھڑکی سے نیچے روٹی پھینکتی جاتی تھی۔ وہ جلتی ہوئی ہوتی تھی، تاہم یہ لوگ اسے اپنے سینے میں چھپا لیتے تھے، خدا جانے اس کی آنچ اُن سے کیسے سہی جاتی تھی۔ وہ لوگ گرم ملک کے رہنے والے تھے، ہماری سردی برداشت نہ کرسکتے تھے اور کئی اکڑ کر مر بھی گئے۔ ان میں سے دو ـــــ ایک افسر دوسرا اس کا اردلی میروں ـــــ ہمارے مکان کے دھوبی گھر میں رہا کرتے تھے۔

افسر اونچا پورا تھا اور اتنا دُبلا کہ اس کی ہڈیاں باہر نکل پڑتی تھیں۔ جب وہ باہر جاتا تو ایک زنانہ لبادہ اوڑھ لیتا جو اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ وہ بڑا خوش مزاج تھا۔ شراب بہت پیتا تھا اور میری ماں چھُپ کر "بیئر" تیار کرتی اور اسے بیچ دیتی تھی۔ شراب پیتے وقت وہ خوب گایا کرتا تھا۔ جب ہماری زبان میں اسے شُدبُد آگئی تو وہ کہنے لگا ـــــ "تمھارا دیس بڑا بے رونق ہے ـــــ وہ سیاہ اور بدرنگ ہے" وہ بہت غلط سلط بولتا تھا، تاہم ہم اس کا مفہوم سمجھ جاتے تھے۔ اس کا کہنا سچ بھی تھا۔ وولگا کا شمالی حصّہ غیر دلچسپ ہے لیکن دکن کی طرف سردی کم ہوجاتی ہے اور کاسپین سمندر کے کنارے تو برف کا نام و نشان بھی نہیں یہ ماننے کی بات ہے کیوں کہ انجیل یا ذکر عیسیٰ میں کہیں برف یا سردی کا ذکر نہیں ہے، ... اور نہ وہاں جہاں عیسیٰ کا ظہور ہوا تھا ......... اچھا

مناجات ختم ہولے تو ہم ذکر عیلی شروع کریں گے۔"

وہ یوں چپ ہوگیا گویا سوگیا ہو۔ وہ دُور کی بات سوچ رہا تھا اور اس کی آنکھیں تیز اور چھوٹی معلوم ہوتی تھیں۔

اپنی موجودگی کی یاد دلانے کے لیے میں نے کہا: "نانا پھر کیا ہوا؟"

چونک کر وہ کہنے لگا: "ہاں —— ہم فرانسیسیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ بھی ہم جیسے آدمی ہیں، نہ وہ ہم سے بہتر ہیں نہ بد تر۔ کبھی وہ میری ماں کو آواز دیتے "مادام، مادام" اور وہ ان کی بوریوں میں آٹے کا پنج سیرا جھونک دیتی۔ اس میں غضب کی قوت تھی۔ بیس سال کی عمر تک تو وہ بال پکڑ کر مجھے اُٹھا لیا کرتی تھی اور سچ جانو کہ میں کچھ کم وزنی نہ تھا۔ خیر، یہ اردلی میروں گھوڑوں کا عاشق تھا آنگن میں جاکر وہ لوگوں کو اشارہ سے جتاتا کہ وہ کسی گھوڑے کی مالش کرنا چاہتا ہے۔ پہلے تو اس کی وجہ سے تکرار تک کی نوبت آگئی۔ مگر بعد ازاں کسان اسے ارے میروں کہہ کر بُلانے لگے اور میروں خوشی سے ان کے پاس آنے جانے لگا۔ اس کے بال سُرخ، ناک گاجر کی سی اور ہونٹ موٹے تھے۔ وہ گھوڑوں کی ایک ایک رگ سے واقف تھا اور ان کی بیماریوں کے علاج میں مسیحا سے کم نہ تھا۔ وہ شہر میں مویشیوں کا ڈاکٹر بنا دیا گیا۔ لیکن اس کا دماغ چل گیا اور وہ آگ میں جل مرا۔ بہار کے موسم میں افسر کی صحت بھی خراب گئی اور ایک روز وہ کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے چپ چاپ مرگیا۔

یہ اس کا انجام تھا۔ مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ ایک کونے میں جاکر

میں رونے لگا۔ وہ کس قدر شریف تھا۔ میرے کان اینٹھ کر وہ اپنی زبان میں بڑی نرمی سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کی باتیں میری سمجھ میں نہ آتی تھیں پھر بھی انھیں سننے میں لطف آتا تھا ——— ہمدردی بازار میں مول نہیں ملتی۔ وہ مجھے فرانسیسی سکھانے لگا لیکن اماں بہت بگڑیں اور مجھے پادری کے پاس بھیج دیا۔ اس نے مجھے بید لگانے کا فیصلہ کیا اور بنفس نفیس افسر سے شکایت کرنے آیا۔ میاں اُن دنوں ہم سے بڑی سختی برتی جاتی تھی۔ تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ . . . . یاد رکھو کہ اس کے مقابلے میں تم سے شمّہ بھر سختی نہیں کی گئی . . . . مجھے ہی لو . . . . . میں نے کیا کیا دُکھ نہیں جھیلے . . . .“

اندھیرا پھیلنے لگا۔ دُھندلکے میں نانا دراز قامت ہونے لگا۔ اور اس کی آنکھیں بلّی کی طرح چمکنے لگیں اور سب معاملوں پر وہ سوچ کر دھیرے دھیرے باتیں کرتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنا ذکر کرتا تو اس کے لہجے میں تکبّر اور جوش پیدا ہو جاتا اور مجھے یہ کھلتا تھا۔ بار بار کی یہ نصیحت بھی ناگوار معلوم ہوتی ”تو کان لگا کر سُن رہا ہے! یاد رکھنا، ہرگز نہ بھولنا“

ان میں سے بہت سی باتوں کو میں یاد نہ رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ خواہ مخواہ میرے ذہن میں محفوظ ہو گئیں اور میرے دل پہ سانپ کی طرح رینگنے لگیں۔

وہ پریوں کے قصّے نہ سُناتا تھا، بلکہ وہ واقعات جو حقیقتاً گزر چکے تھے۔ اسے سوالات سے نفرت تھی اور اسے چھیڑنے کے لیے

میں اکثر پوچھا کرتا تھا:

"فرانسیسی اچھے ہیں یا رؤسی؟"

جھلّا کر وہ جواب دیتا تھا: "مجھے کیا معلوم؟ کیا میں فرانس گیا ہوں؟ ہر بِلاّ اپنے گھر میں اچھا لگتا ہے۔"

"لیکن کیا رؤسیوں میں خوبیاں بھی ہیں؟"

"کیوں نہیں، کئی معاملوں میں وہ اچھے ہیں۔ لیکن جب زمینداروں کی حکومت تھی تو وہ بہتر تھے۔ اب ہم لوگ بڑی مشکل میں مبتلا ہیں، روٹی کمانا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس کی ذمہ داری شریفوں پر ہے کیوں کہ اُن میں علم ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ ہی نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ باقی کی گت چھچھوندر کی سی ہے۔ ان کے لیے گھوڑے گدھے میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے یہاں خول کی بہتات اور گودے کی کمی ہے۔ یاد رکھنا! اب تک ہمیں عقل آجانی تھی لیکن افسوس کہ ہم وہیں کے وہیں ہیں۔"

"کیا رؤسی دوسرے لوگوں سے زیادہ طاقت ور ہیں؟"

"ہم میں سے کچھ طاقت میں جنّوں سے کم نہیں۔ لیکن طاقت سے زیادہ ذہانت اہم ہے۔ کیا گھوڑا ہم سے زیادہ طاقت ور نہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"مگر فرانسیسی ہم سے لڑنے کیوں آئے تھے؟"

"یہ بادشاہ کا معاملہ ہے۔ ہم بھلا اس رمز کو کیسے سمجھ سکتے ہیں"

مگر جب میں پوچھتا تھا کہ نپولین کیسا آدمی تھا؟ تو نانا بہت غور و خوض کے بعد جواب دیتے تھے: "بڑا سیاہ قلب تھا۔ وہ

دنیا بھر کو جیت کر تمام آدمیوں کو برابر کر دینا چاہتا تھا تاکہ نہ مالک رہیں نہ نوکر۔ اس کی خواہش تھی کہ انسانوں میں نام کے سوا کوئی تفریق نہ رہنے، سب ایک قانون اور ایک مذہب کو مانیں اور نہ ان میں طبقوں کا فرق باقی رہے یہ جنوں نہیں تو کیا تھا۔ ساری خدائی میں کیکڑے کی ایک ایسی جنس ہے کہ ان میں کوئی امتیاز نہیں ـــــ ورنہ مچھلیوں تک میں اختلاف ہے۔ روہو کو ہیرنگ سے بیر ہے تو اسے ہلسا سے کد ہے اور ہمارے ملک میں کئی نپولین ہو چکے ہیں۔ لیکن میں ان کے حالات پھر کبھی سناؤں گا۔"

کبھی وہ چپ سادھ کر مجھے یوں گھورنے لگتا گویا پہلے کبھی دیکھا ہی نہ تھا اور یہ بات مجھے ناگوار گزرتی تھی۔ لیکن وہ امّاں ابّا کا ذکر بھول کر بھی نہ کرتا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں نانی پنجے دبائے اندر آتی اور کونے میں دم سادھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ بیچ میں وہ اپنی چکنی چپڑی آواز میں بول اٹھتی: "بڑے میاں، تمھیں موروں کا سفر یاد ہے جب ہم زیارت کو گئے تھے۔ کیا لطف آیا تھا بہت سوچ بچار کے بعد نانا جان فرماتے تھے: "ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں لیکن ہم طاعون کے پہلے گئے تھے۔ اسی سال ہم نے جنگل میں ان فرار شدہ قیدیوں کو پکڑا تھا۔"

"ہاں، ہاں! اور ہم کس قدر ڈرے ہوتے تھے ـــ"

"ٹھیک کہا"

میں نے پوچھا کہ یہ کس قسم کے قیدی تھے اور جنگل میں کیوں چھپے پھرتے تھے۔ نانا نے با دلِ ناخواستہ سمجھایا: "یہ وہ لوگ ہوتے

ہیں جو قید خانے سے بھاگ جاتے ہیں — اپنے مقررہ کام سے بچنے کے لیے۔"

"آپ نے اُنھیں پکڑا کیسے؟"

"کیسے؟ ارے یہ تو آنکھ مچونی کا کھیل ہے۔ کچھ بھاگتے ہیں کچھ پکڑتے ہیں۔ گرفتاری کے بعد ان کی اتنی مرمّت ہوئی کہ ناک سے لہو بہنے لگا اور ان کی پیشانی داغ دی گئی تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ قیدی ہیں۔"

"لیکن اس کی وجہ؟"

"یہ ایک پہیلی ہے جسے میں بھی نہیں سلجھا سکتا۔ مجرم کون ہے — بھاگنے والا یا پکڑنے والا — یہ بھی ایک معمّا ہے!"

بات کاٹ کر نانی نے پوچھا: "بڑے میاں، تمھیں وہ آگ بھی یاد ہے" نانا نے، جسے ہر امر کی صحت کا سب سے زیادہ خیال رہتا تھا، منہ بنا کر دریافت کیا: "کون سی آگ؟"

ان پرانی داستانوں کی ورق گردانی کے وقت وہ مجھے بالکل بھول جاتے تھے۔ ان کی آوازیں اور الفاظ یوں گھل مل جاتے تھے کہ محسوس ہوتا کہ وہ بیماری یا آتش زنی، قتل یا موت دیوانوں یا پادریوں کے بارے میں غم ناک ترانے الاپ رہے ہیں

نانا نے زیرِ لب کہا: "ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا! اور ہماری زندگی کیسے کیسے مرحلوں سے گزری ہے۔"

نانی نے جواب دیا: "لیکن ہماری زندگی کچھ ایسی بے لطف تو نہیں کٹی۔ تمھیں وہ بہار یاد ہے جب ورینکا پیدا ہوئی تھی۔"

"یہ ۱۸۴۸ء کا واقعہ ہے جب ہنگری پر حملہ شروع ہوا تھا۔ لڑکی کے بپتسمے کے بعد ہی اس کا نانا "مجنون" گھر سے نکال دیا گیا۔"

"اور پھر اس کا پتہ نہ چلا" نانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ دن ہے اور آج کا دن کہ خدا کی رحمت ہمارے گھر سے اٹھ گئی۔ لڑکی کو ہی لو۔"

"بڑے میاں، للہ بس بھی کرو۔"

نانا نے بگڑ کر کہا: "بس کرنے کی کیا بات ہے۔ ہماری اولاد بربادی کی راہ جارہی ہے۔ ہائے ہماری جوانی کیا ہوئی؟ سوچا تھا کہ اسے اپنی اولاد کے پاس رہن رکھ دیا ہے، جیسے کوئی قیمتی اسباب صندوق میں احتیاط سے رکھ دیا جائے۔ لیکن شومئی قسمت کہ اس کے بجائے قدرت نے ہمیں ایسے مخمصے میں ڈال دیا جس سے نکلنا دوبھر ہے۔"

وہ کمرے میں گردش کرتے ہوئے یوں کراہنے لگا جیسے جل گیا ہو اور یوں بلکنے لگا گویا بیمار ہوگیا ہے۔ پھر نانی کی طرف مڑ کر وہ اپنی اولاد کو بد دعائیں دینے لگا اور اپنی پُرشکن مٹھی باندھ کر چیخ پڑا: "اری چڑیل، تو نے ان کی پشت پناہی کرکے سارے گھر کا ستیاناس کر دیا۔"

اس کے طیش اور غصّے کا آخری مظاہرہ ایک اشک آلود ہچکی کی صورت میں ہوا۔ وہ شہ نشین کے سامنے فرش پر لوٹنے لگا اور سینہ کاوی کے ساتھ یہ فریاد کرنے لگا:

"خدا، کیا میں نے دوسروں سے زیادہ گناہ کیا ہے؟ کیوں۔"

وہ سرتاپا تھرتھرانے لگا اور اس کی پُرنم آنکھیں غیظ و غضب سے
چمکنے لگیں۔

نانی نے اندھیرے کونے میں چپ چاپ صلیب کا نشان بنایا
اور بچتے بچتے اس کے قریب جاکر کہا: "آخر یوں رونے بسورنے
سے کیا فائدہ؟ خدا کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں۔ تم سمجھتے
ہو کہ دوسروں کے بچے ہمارے بچوں سے اچھے ہیں۔ بڑے میاں
میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ کوئی گھر محبت و تکرار اور دنگے فساد
سے خالی نہیں۔ ہر ماں اور ہر باپ اپنے گناہوں کو آنسوؤں سے
دھوتا ہے۔ تم ایسے کون سے نرالے ہو!"

اکثر یہ الفاظ ا سے تسکین دیتے اور وہ پلنگ پر لیٹ جاتا۔
تب میں نانی کے ساتھ اپنی کوٹھری میں چلا جاتا تھا۔

لیکن ایک مرتبہ جب وہ نصیحت کی یہ پڑیا لیے ہوئے نانا کے
پاس آئی تو وہ اُس پر جھپٹا اور پوری طاقت سے اس کے منہ
پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔

نانی چکرا گئی اور گرتے گرتے بچی۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے
دھیرے سے کہا: "اُلّو!" یہ کہ کر اس کے پاؤں پر نانی نے خون تھوک
دیا۔ لیکن وہ پھر بپھرا اور دونوں ہاتھ اس کی طرف اُٹھائے۔
"دور ہٹ جا ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا!"

کمرے سے جاتے جاتے نانی نے پھر کہا: "اُلّو کہیں کا!"

نانا اس پر جھپٹا لیکن وہ چوکھٹ سے اُچھلی اور دروازہ اس
کے منہ پر بند کر دیا۔

نانا کا چہرا سفید ہوگیا اور وہ کِواڑ پیٹتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارنے لگا: "چڑیل، چڑیل!"

میں سوفے پر دم بخود بیٹھا تھا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا پہلی مرتبہ اس نے میرے سامنے نانی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے کردار کے اس نئے پہلو کو دیکھ کر مجھے انتہائی کراہت ہوئی۔ یہ گناہ میرے نزدیک ناقابلِ معافی تھا اور محسوس ہوا کہ میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ وہ کواڑ کا سہارا لیے جوں کا توں کھڑا رہا اور اس کے چہرے کی یہ حالت ہوگئی گویا اس پر بھبھوت ملی ہوئی ہے۔

پہلے تو وہ بیچ کمرے میں سجدے میں گر پڑا۔ لیکن ایک آن میں سر اُٹھا کر اور سینہ پیٹ کر پکارنے لگا:

"اللہ ——— ارے میرے اللہ ———"

میں دبے پاؤں اور رینگتے ہوئے کمرے سے نکلا۔ نانی اوپر اپنی کوٹھری میں ٹہل رہی تھی اور بیچ بیچ میں ہونٹ کو پانی سے دھوتی جاتی تھی۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

کونے میں جاکر کُلّی کرتے ہوئے اس نے لاپروائی سے کہا: "کوئی بات نہیں۔ دانتوں کی خیر ہے۔ ہونٹ پر خفیف سی چوٹ آگئی۔"

"لیکن انھیں ہو کیا گیا تھا؟"

باہر دیکھتے ہوئے نانی نے جواب دیا: "وہ چڑچڑے ہوگئے ہیں بڑھاپے میں یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ ہر تدبیر الٹی پڑ رہی ہے

اچھا تو اب دعا پڑھ کر لیٹ جا اور بُری باتوں کو نہ سوچ۔"

میں نے اور بھی کچھ پوچھنا چاہا مگر اس نے خلاف معمول کڑک کر کہا: "میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ لیٹتا ہے یا نہیں؟۔ میں نے ایسی نافرماں برداری کبھی نہیں دیکھی!"

کھڑکی کے پاس بیٹھے وہ ہونٹوں کو چوستی اور رومال میں تھوکتی جاتی تھی۔ کپڑے اُتارتے ہوئے میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا نیلی کھڑکی سے اس کے سیاہ سر پر جگمگاتے ہوئے ستارے نظر آ رہے تھے۔ ہُو کا عالم تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ جب میں لیٹ گیا تو وہ میرے قریب آئی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: "شب بخیر میری جان! میں اُن کے پاس ہو آؤں۔ فکر نہ کرنا۔ یہ میرا ہی قصور تھا۔ لے اب سو جا۔"

مجھے چوم کر وہ چلی گئی۔ لیکن میرا دماغ رنج و غم میں ڈوب گیا۔ نرم و گرم بستر سے اُٹھ کر میں کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور اسی ملال کے عالم میں سنسان سڑک کو دیکھنے لگا۔

---
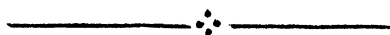
# باب ۷

مجھے بہت جلد یہ بات معلوم ہوگئی کہ نانا اور نانی کے خدا جُدا جُدا تھے۔ یہ فرق اس قدر بیّن تھا کہ میں کسی طرح اسے نظر انداز نہ کرسکا۔

کبھی نانی صبح آنکھ کھولتے ہی بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے گھنیرے بال سُلجھانے لگتی تھی۔ اپنا سر اکڑا کر وہ ٹوٹی ہوئی کنگھی سے کالی ریشمی چوٹی کا بال بال سنوارتی اور جی ہی جی میں کوستی جاتی: "توبہ ہے توبہ جو بال چپکتے ہیں خدا انھیں لے جائے۔"

سب اُلجھنوں کو سُلجھا چکنے کے بعد موٹی سی ایک لڑی چوٹی ڈال کر وہ جلدی جلدی مُنہ ہاتھ دھوتی اور اس دوران میں برابر غصّے سے سر ہلاتی جاتی۔ اس کے دہانے پر چڑچڑے پن کے آثار باقی رہتے تھے اور چہرے پر اب تک وہ لکیریں باقی تھیں جو نیند نے چُن دی تھیں۔ پھر وہ شہ نشین کے آگے کھڑی ہوجاتی اور دراصل اس کے لیے یہ وہ طہارت تھی جو اس کے ہر بُنِ مو کو شگفتہ و شاداب کردیتی تھی۔

اپنے کوبڑ کو سیدھا کرکے اور سر اوپر اُٹھا کر وہ مریم کے گول مٹول مُنہ کو تاکنے لگی اور احترام سے صلیب کا نشان بنا کر بلبلا پڑی:
"اے نور زادی! تو آج ہی مجھے اپنے آغوش میں لے لے!"

بہت جھک کر سلام کرنے کے بعد اس نے بہ مشکل اپنی پیٹھ سیدھی کی اور پھر رقت آمیز لہجے میں سرگوشی کرنے لگی:

"دل کی راحت! نینوں کا سکھ! اور دنیا کی سرتاج!"

ہر روز وہ نئے نئے القاب ڈھونڈ نکالتی تھی۔ اور اسی لیے میں ان دعاؤں کو بہت غور سے سنا کرتا تھا۔

"اری جانِ جاں، تجھ سے زیادہ پاک کون ہی! تو میری محافظ اور امین ہی! تو آفتاب ہی! خدا کی ماں ہی! مجھے لالچ سے بچا۔ میرے ہاتھ سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اور اگر کوئی غلطی سے مجھے ضرر پہنچائے تو میں اس کا برا نہ مانوں۔"

اس کی سیاہ آنکھیں مسکرانے لگتی تھیں اور اس کے آس پاس جوانی کا نور برسنے لگتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے گویا کوئی بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے وہ از سرِ نو صلیب کا نشان بناتی تھی: "عیسیٰ! خدا کے لاڈلے، اپنی ماں کی خاطر اس خطا کار کو بخش دے!"

اس کی دعاؤں میں فقیہانہ مصنوعیت نہیں، بلکہ سادگی اور خلوص کی شان ہوتی تھی۔

صبح اس کی دعا مختصر ہوتی تھی کیوں کہ اسے جھٹ پٹ چائے کا پانی رکھنا ہوتا تھا۔ نانا نے کوئی نوکر نہ رکھا تھا اور چائے میں ایک منٹ کی بھی دیر ہوئی تو وہ جان کو آجاتا تھا۔

کبھی وہ پہلے اٹھ کر ہماری کوٹھری کا رخ کرتا تھا۔ کچھ دیر وہ اس کی دعائیں سنتا رہتا اور اپنے پتلے کالے ہونٹوں کو حقارت سے چبانے لگتا تھا۔ پھر چائے کے وقت وہ غرّا کر کہتا: "اری

بیوقوف، میں نے تجھے ہزار مرتبہ دعا رٹائی ہوگی۔ لیکن تو ہے کہ اپنی بکواس بند نہیں کرتی۔ معلوم نہیں خدا تیرے کفر کو کیوں برداشت کرتا ہے"

نانی ایمانِ راسخ سے کہتی: "وہ پاک پروردگار ہر کہی ان کہی سے واقف ہے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے"

"تیرے دماغ میں گوبر بھرا ہے ا ہشت ۔۔۔۔ دھت ۔۔۔۔"

نانی کا خدا اس کا ہمدم اور یار غار تھا۔ وہ جانوروں تک سے اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ یہ خدا اپنی کائنات کے ذرّے ذرّے کا تابعدار تھا اور وہ چرند پرند، پیڑ پودے سب سے قریب تھا۔ وہ سب پر یکساں مہربان تھا اور کسی شے سے دُور نہ تھا۔

بھٹیاری نے ایک بلّی پال چھوڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سنہری اور بال سُرمئی تھے۔ بڑی چنچل اور چالاک تھی۔ ایک بار وہ باغ سے ایک چڑیا پکڑ لائی۔ نانی نے ادھ موئے پرندے کو آزاد کرکے بلّی کو ٹھونکا اور کہا: "اری چھنال، تجھے خدا کا بھی ڈر نہیں"

یہ سُن کر بھٹیاری بہت ہنسی لیکن نانی نے ڈانٹ کر کہا: "کیا تم سمجھتی ہو کہ جانور خدا کی ذات سے ناآشنا ہیں؟ اری سنگ دل! ہر جانور انسان سے زیادہ خدا کا راز داں ہے"

گھوڑی اب موٹی پڑتی جاتی تھی اور اُداس رہتی تھی۔ اس پر چار جامہ کستے ہوئے نانی بڑے انہماک سے بات چیت کیا کرتی تھی: "خدا کی مزدورنی! تو غم گین کیوں رہتی ہے؟ اچھا، تو بوڑھی ہورہی ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا؟" اور گھوڑی ہنہنا کر سر ہلانے لگتی تھی۔

تاہم وہ خدا کی اتنی دوہائی نہ دیتی تھی جتنی میرے ناناجان۔ میں نانی کے خدا کو سمجھ سکتا تھا۔ اس کے آگے جھوٹ بول کر میں آپ اپنے سے شرمندہ ہوجاتا۔ اس کا خیال ایسی ندامت پیدا کرتا کہ میں نانی سے کبھی جھوٹ نہ بولتا تھا۔ ایسے اچھے خدا سے کچھ چھپانا ناممکن تھا۔ واقعی مجھے اس کا گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔

ایک روز بھٹیاری نانا سے لڑپڑی اور اسے خوب جلی کٹی سُنائی۔ گو نانی نے اس جھگڑے میں کوئی حصّہ نہ لیا مگر بھٹیاری نے اسے بھی بڑی باتیں سُنائیں اور ایک گاجر پھینک ماری۔ نانی نے بہت نرمی سے بس اتنا کہا: "اچھی، تو بڑی نادان ہے" لیکن مجھ سے یہ توہین برداشت نہ ہوئی اور میں نے اس بدذات سے انتقام لینے کا تہیّہ کرلیا۔

کئی روز تک میں یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ اس فربہ اندام سے بدلا لینے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے۔ پڑوسیوں کی لڑائی کا میں نے جو مشاہدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے دشمن کی بلّی کی دُم کاٹ لیتے، اس کے کتّے کو بھگا دیتے، اس کے مُرغے مرغیوں کو ذبح کرکے کھا جاتے، اس کی موری بند کردیتے یا باغ اُجاڑ دیتے تھے لیکن مجھے ان میں سے کوئی تدبیر پسند نہ تھی۔ میں کسی ایسی ترکیب کی تلاش میں تھا جو زیادہ با اثر ہو۔ بالآخر ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔

میں بھٹیاری کے انتظار میں دبک گیا اور وہ جیسے ہی کباڑ خانے میں داخل ہوئی میں نے کھٹ سے چور دروازہ باہر سے بند کردیا۔ تالا بند کرکے چابی چھپّر پر پھینک دی اور باورچی خانے

میں جا پہنچا جہاں نانی کھانا پکا رہی تھی، میں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ پہلے تو نانی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر جب وہ یہ بھید بھانپ گئی تو کلّے پر ایک لپڑ رسید کیا۔ کھینچتے ہوئے وہ مجھے باہر لائی اور چابی ڈھونڈنے کے لیے چھپّر پر چڑھا دیا۔ بادلِ ناخواستہ یہ چابی اُسے دے کر سخت حیرت کے عالم میں میں آنگن کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں سے میں اپنے قیدی کی آزادی کا ماجرا دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں ہنستی ہوئیں باہر چلی گئیں اور بھٹیاری نے اپنی پاؤ روٹی کی سی مٹھی دکھا کر مجھ سے کہا: "دیکھ تجھے کیسا مزا چکھاتی ہوں۔" لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار تھے۔

نانی پھر گردن پکڑ کر مجھے کھینچتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئی۔

"تو نے یہ حرکت کیوں کی؟" اُس نے پوچھا۔

"کیوں کہ اس نے تمھیں گاجر پھینک کر ماری تھی۔"

"اچھا، تو آپ میری خدمت بجا لا رہے تھے! بہت خوب تو میں بھی آپ کو اس کا انعام دوں گی —— ارے میں تیری چمڑی اُدھیڑ کر تجھے چوہوں کے ساتھ تندور میں بند کر دوں گی۔ بڑا میرا محافظ بنا ہے۔ کیا پِدّی کیا پِدّی کا شوربا! نانا کو معلوم ہو تو وہ تیرا بھُرکس نکال دیں۔ چل اپنی کوٹھری میں اور سبق یاد کر۔

دن بھر اُس نے مجھ سے بات چیت نہ کی۔ لیکن رات کی دعا سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اس نے نہایت اثر پذیر انداز میں مجھے یہ نصیحت کی:

"الکسی بیٹے، آیندہ تمھیں کبھی بڑوں کے معاملوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ بڑوں پر ذمّہ داریوں کا بار ہے اور انھیں خدا کو جواب دینا ہے۔ لیکن تم ابھی بچّے ہو۔ اُس روز کا انتظار کرو جب خدا تمھارے دل میں جگہ بنائے گا اور تمھیں ہدایت کرے گا کہ کیا کرنا ہے اور کون سی راہ پکڑنا ہے۔ سمجھ میں آیا؟ کسی قضیے میں کون خطاوار ہے اور کون بے گناہ، اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ خدا انصاف کرنے والا اور سزا دینے والا ہے۔ یہ اس کا اختیار ہے، ہمارا نہیں۔"

ناس سونگھتے ہوئے وہ گھڑی بھر چُپ رہی۔ پھر داہنی آنکھ دبا کر کہنے لگی: "کبھی اللہ میاں بھی غوطہ کھا جاتے اور انھیں پتا نہیں چلتا کہ مجرم کون ہے۔"

مجھے سخت تعجب ہوا: "کیا خدا کو ہر امر کا علم نہیں۔"

"اگر وہ قادرِ مطلق ہوتا تو وہ باتیں نہ ہوا کرتیں جنھیں نہیں ہونا چاہیے۔ پروردگار عرش بریں سے فرشِ زمیں کا معائنہ کرتا ہے اور ہمیں آب دیدہ اور غم رسیدہ پاتا ہے تو پکار اُٹھتا ہے: "میرے بندو! مجھے تمھارے حالِ زار پر رحم آتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔ پھر اپنے گیلے گالوں کو پونچھ کر کونے میں جا کر دعا مانگنے لگی۔

اس دن کے بعد نانی کا خدا مجھ سے قریب تر ہو گیا۔ نانا بھی مجھے پڑھاتے وقت کہا کرتا تھا کہ خدا رحیم و کریم ہے، ستار و غفار ہے۔ لیکن وہ نانی کی طرح دعا نہ مانگتا تھا۔ صبح شہ نشین کے آگے

جانے سے پہلے وہ دیر تک وضو کرتا تھا۔ کپڑے پہن کر نہایت احتیاط سے کنگھی کرتا، بالوں کو سلجھاتا، آئینہ سامنے رکھ کر قمیص کی شکن نکالتا اور ٹائی درست کرتا تھا۔ پھر وہ سنبھل سنبھل کر چوروں کی طرح شہ نشین کی طرف جاتا تھا۔ ایک خاص تختے پر کھڑے ہوکر وہ گھوڑے کی مانند آنکھیں مٹکاتا تھا۔ سر جھکائے اور سپاہیوں کی طرح ہاتھ تانے دم بھر خاموش رہتا اور پھر سرکنڈے کی مانند اکڑکر بڑی شان سے کہتا:

"باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر!"

یہ کہنا تھا کہ کمرے میں مُردنی چھا جاتی تھی اور مکھیاں بھی بھنبھناہٹ بند کر دیتی تھیں۔

سر اکڑائے، بھنویں تانے، داڑھی ہلاتے ہوئے، وہ ایسی سدھی ہوئی آواز میں دعا مانگنے لگتا گویا کوئی سبق دوہرا رہا ہو اور اس کا لہجہ تیز و طرّار ہوتا تھا۔

"جب انصاف کرنے والا آکر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے گا ــــ" سینہ ٹھونک کر وہ جوش سے کہتا جاتا تھا: "عاصیوں کو تیرا ہی آسرا ہے۔ میرے گناہوں سے چشم پوشی کرلے" اس کے الفاظ بندھے بندھائے ہوتے تھے۔ اس کا داہنا پانو برابر کانپتا جاتا تھا گویا دُعا پر تال دے رہا تھا۔ وہ اتنا صاف ستھرا اور اپنی طلب میں مستحکم تھا کہ اس کا جسم لمحہ بہ لمحہ دراز تر ہوتا جاتا تھا۔

"مسیحا، میری بیمار روح کا علاج کر۔ مقدس کنواری، یہ

میری روح کا نوحہ ہے۔ میں تجھ پر اپنے کو قربان کرتا ہوں"۔ اپنی ہری آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ فریاد کرتا تھا: "عمل سے زیادہ مجھے ایمان دے اور میری نیکی کتنی بھی ادنیٰ کیوں نہ ہو، اُسے نہ بھول"

اس دوران میں وہ برابر صلیب کا نشان بناتا جاتا تھا اور اپنے سر کو یوں جنبش دیتا گویا کسی کو ٹکّر مارے گا۔ اس کی آواز بیٹھ جاتی تھی۔ بعد ازآں جب مجھے یہودیوں کی عبادت گاہ میں جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ نانا یہودیوں کی طرح دعا مانگتا تھا۔

اب سماوار میز پر سنسنانے لگتا تھا اور گرم روٹی کی خوشبو سے کمرا مہک جاتا تھا۔ نانی آنکھیں جھکائے، ناک بھوں چڑھائے کمرے میں ٹہلنے لگتی تھی۔ سورج باغ سے کمرے کے اندر جھانکنے لگتا پتّیوں پر شبنم کی بوندیں موتیوں کی طرح چمکنے لگتیں۔ نسیمِ صبح نسرین و یاسمن میں چھن کر معطّر ہو جاتی۔ مگر نانا کی مجروح و مغموم دعاؤں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔

"مجھ ناری کے دل سے بُری خواہشوں کو نکال دے!"

مجھے یہ ساری دعائیں بر زبان تھیں اور خواب میں بھی میں انھیں حرف بحرف دُہرا سکتا تھا۔ میں بڑے غور سے انھیں سُنا کرتا تاکہ اس کی کوئی بھول چوک پکڑ سکوں۔ اس کا احتمال ہی نہ تھا۔ لیکن اگر کبھی وہ ایک آدھ لفظ چھوڑ جاتا تھا تو مجھے شرارت آمیز مسرّت ہوتی تھی۔

دعاؤں کے بعد نانا ہم دونوں کو سلام کرتا اور اس کا جواب دے کر ہم سب میز پر بیٹھ جاتے۔ میں فوراً یاد دہانی کرتا:

"آپ کو آج صبح ایک غلطی کر گئے!"
"سچ مچ!" اعتبار نہ ہونے کے باوجود نانا بےچین ہو جاتا تھا۔
"جی ہاں آپ کہنا تھا: "میرے ایمان کا بول بالا ہو۔ مگر آپ بول بالا کا لفظ چھوڑ گئے۔"
سخت پریشانی کے عالم میں گویا اس نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہو وہ کہتا تھا: "لاحول ولا قوۃ۔"
غلطی پکڑنے کا انتقام لینا وہ ہرگز نہ بھولتا تھا۔ لیکن گھڑی بھر کے لیے اُسے پریشان دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے کوئی نمبر مار لیا ہو۔
ایک بار نانی نے مذاق مذاق میں کہا: "بڑے میاں، تمھاری روز روز کی ایک ہی رٹ کو سُن کر خدا تھک گیا ہوگا۔"
نانا نے تیور چڑھا کر کہا: "ایں ۔۔۔۔ کیا کہا؟ ۔۔۔ پھر تو کہنا؟"
"میرا منشا یہ ہی کہ کبھی دل سے بھی تو کوئی دعا مانگا کرو۔"
غصّے کے مارے بڑے میاں آگ بگولا ہو گئے اور اُچھل کر ایک تشتری نانی کے سر پر دے ماری اور ایسی آواز نکالی جیسے کوئی رندہ چلا رہا ہو: "اری ڈھڈو، یہ لے!"
خدا کی قدرت کا ذکر کرتے وقت وہ سب سے زیادہ زور اس کے جلال پر دیا کرتا تھا: "انسان نے گناہ کیا تو سیلابِ نوح آیا انسان پھر بھی باز نہ آیا تو خدا نے قحط اور وبا سے اس کی تواضع کی۔ اب بھی عاصیوں کے لیے تلوار تیز ہی۔ جان بوجھ کر جو اس کے احکام کو نہ مانے گا وہ ذلیل و خوار ہو کر رہے گا۔" میز پر گھونسے مار مار کر

وہ اس تنبیہ کو موثر بناتا جاتا تھا۔

مجھے یقین ہی نہ آتا کہ خدا بے رحم ہوگا۔ اور میرے دل میں شبہہ اُٹھتا تھا کہ خدا کا نہیں بلکہ اپنا رعب جمانے کے لیے نانا نے یہ جملہ تراشا ہے۔ اس لیے میں نے بے دھڑک پوچھ لیا:

"کیا آپ یہ سب اس لیے کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کی حکم عدولی نہ کروں؟" اور اس نے بھی اسی صفائی سے جواب دیا: "ممکن ہے۔ کیا تم پھر کبھی میری بات ٹالوگے؟"

"اور نانی جو کہتی ہیں؟"

اس نے ڈانٹ کر کہا: "اس کوڑھ دماغ کی باتوں میں نہ آنا وہ سدا جاہل کی جاہل رہی۔ اسے عقل وعلم سے کیا واسطہ۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ ایسے اہم معاملے پر تم سے گفتگو نہ کرے۔ اچھا اب بتاؤ فرشتوں کی کتنی کمپنیاں (پرے) ہیں؟"

پروں کی تعداد بتلاکر میں نے پوچھا: "کیا ان کی لمیٹڈ کمپنیاں بھی ہیں؟"

قہقہہ مارکر وہ چیخ پڑا: "ابے اُلّو، اللہ میاں کو کسی کمپنی سے کیا کرنا ہے ...... یہ تو دُنیوی چیز ہے ..... قدرت کے آئین کی نافرمانی کے لیے ایسی چیزیں وضع کی گئی ہیں"

"آئین کیا ہیں؟"

بڑے میاں بڑے شوق سے اپنی تیز آنکھیں مٹکا کر سمجھانے لگتے تھے: "آئین! آئین کی بنیاد رسوم پر ہے۔ ایک قبیلے کے لوگ آپس میں طے کر لیتے ہیں کہ فلاں طریقہ، عمل بہترین ہے۔ اسے ہم اپنی

ریت بنا لیں۔ رفتہ رفتہ یہی رواج ان کا قانون بن جاتا ہے۔ مثلاً کھیل سے پہلے بچے یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس کے قواعد کیا ہوں گے آئین بھی ایسے ہی بنتے ہیں۔"

"لیکن کمپنیوں کو قوانین سے کیا تعلق؟"

"یہ کمبخت قانون سازی کے لیے نہیں بلکہ قانون شکنی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔"

"مگر اس کی وجہ؟"

ماتھے پر بل ڈال کر وہ بولا: "یہ تمھاری سمجھ میں نہ آئے گا۔" لیکن لمحہ بھر بعد وہ سمجھانے لگا: "انسان کا ہر عمل خدا کے منصوبے کی تکمیل کے لیے ہے۔ آدمی کی مرضی جو بھی ہو لیکن مولا کا منشا اور ہی کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے اداروں کی بنیاد آنی جانی ہے۔ اللہ کی ایک پھونک ان کی فنا کے لیے بس ہے۔"

تاہم کمپنی کا مسئلہ میرے لیے بہت دلچسپ تھا اور میں یہ پوچھنے سے نہ چوکا: "لیکن ماموں جاکوف جو یہ گیت گاتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟

فرشتے سجیلے . اللہ کے چیلے
قدرت کے بلم ٹیر!
کمپنی والے اندر سے کالے
شیطان کے سالے"

نانا نے ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنا منہ چھپا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن کلّوں کی حرکت سے میں سمجھ گیا کہ وہ دل ہی دل

میں سنس رہا ہے۔ پھر وہ بولا: "جاکوف کے ہاتھ پیر باندھ کر ندی میں ڈال دینا چاہیے۔ اس بدمعاش کو یہ گیت گانے کی اور تجھے اس کے سننے کی کیا ضرورت تھی۔ خدا کی شان میں ایسی گستاخی اس کفرستان کے سوا اور کہاں جائز ہے؟" اور گویا میرے آر پار دیکھتے ہوئے وہ متفکرانہ انداز میں بولا: "ہشت .... دھت ...."

گو اس کا خدا انسانیت کے سر پر قہر و غضب کا عصا لیے کھڑا رہتا تھا، تاہم نانی کی طرح وہ بھی ہر معاملے میں اس کی امداد کا طالب رہتا تھا۔

نانی جن چند ولیوں کے ناموں سے واقف تھی وہ سب ہمدرد و مونس تھے اور انسان کی آبادیوں میں آکر اس کے سکھ دکھ کے شریک بنتے تھے۔ لیکن نانا کے دیوتا یا تو بت شکن تھے یا رومن بادشاہوں کے دشمن جو انھیں زندہ جلا ڈالتے تھے۔ کبھی نانا آپ ہی آپ کہہ اٹھتا تھا: "اگر خدا وہ جھونپڑا بیچنے میں میری مدد کرلے تو میں حضرت نکولس کی نیاز کروں۔" مگر نانی ہنس کر مجھ سے کہتی تھی: "بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں! کیا حضرت نکولس کو اتنی فرصت ہے کہ لوگوں کے مکان نیلام کرتے پھریں۔ کیا وہ کوئی بہتر خدمت انجام نہیں دے سکتے؟"

عرصے تک میں نے اپنے پاس نانا کی ایک جنتری رکھ چھوڑی تھی جس میں اس نے اپنے ہاتھ سے بہت سے ٹونے ٹوٹکے لکھ رکھے تھے۔ "جوکم" اور "انا" نامی دو بزرگوں کی سال گرہ کے سامنے سرخ روشنائی سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا:

"میرے محسن جنھوں نے مجھے ایک آفت سے نجات دلائی!"
مجھے اس آفت کی ساری کہانی یاد ہی۔

اپنے نٹھلّے بیٹوں کا خرچ پورا کرنے کے لیے نانا نے مہاجنی شروع کی اور خفیہ طور پر سامان رہن رکھنے لگے۔ کسی نے رپٹ کردی اور رات کو پولیس نے تلاشی کے لیے ہمارے گھر پر چھاپا مارا۔ بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ لیکن، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ نانا رات بھر دعا مانگتا رہا اور ناشتے سے پہلے میرے سامنے یہ الفاظ جنتری میں ٹانک دیے۔

رات کے کھانے سے پہلے وہ میرے ساتھ کتاب زبور یا کوئی ایسی ہی چیز پڑھتے تھے۔ لیکن کھانا کھاتے ہی وہ دعاؤں کا سلسلہ چھیڑ دیتے تھے اور رات کے سناٹے میں یہ افسردہ الفاظ بھٹکنے لگتے تھے: "ای شہنشاہوں کے شہنشاہ ای پروردگار عالم، میں تجھے کیسے مناؤں، اپنے گناہوں کو کس طرح دھوؤں! ہمیں بدنیتی سے بچا .... آلہی، مجھے کچھ لوگوں سے محفوظ رکھ........ میرے آنسو مینہ کی طرح برستے ہیں۔ اپنے گناہوں کی یاد....."

بیچ میں نانی جماہی لے کر بولتی تھی: "اوفوہ! میں تو بالکل تھک گئی۔ میں بے دعا کہے سو رہوں گی!"

نانا مجھے سنیچر، اتوار اور تیوہاروں کے موقع پر کلیسا لے جاتا تھا۔ وہاں بھی میں مختلف خداؤں میں تمیز کرسکتا تھا۔ پادری کا بھجن نانا کے خدا کے لیے تھا۔ لیکن سرود خوانوں کا نغمہ نانی کے خدا کے لیے ہوتا تھا۔ ان دو خداؤں کے اختلاف کی نوعیت کو

میں اپنے بچپن میں صاف صاف کیوں کر سمجھ سکتا تھا۔ لیکن خوب یاد ہے کہ نانا کا خدا مجھ میں خوف و ہراس کا جذبہ پیدا کرتا تھا اور اس کے تصور سے میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔ وہ کسی سے محبت نہ کرتا تھا۔ ہم سب کی عیب چینی اس کا تنہا مشغلہ تھا اور ہماری بدیوں اور غلط کاریوں کی چھان بین میں اسے لُطف ملتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خدا انسان پر پر اعتماد نہ کرتا تھا۔ وہ کفّارہ مانگتا تھا اور ہمیں سزا دے کر اسے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

اس زمانے میں میری روح کی خاص غذا وہ تصوّرات اور خیالات تھے جو خدا کی ہستی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ میری زندگی کے سب سے پاک دن ہیں اور سب تاثرات اپنے تشدد اور جبر سے مجھ میں کراہت پیدا کرتے تھے اور نفرت و بیزاری کے جذبات کو بیدار کرتے تھے۔ لیکن میرے ماحول کی سب سے روشن ہستی خدا کی ذات تھی —— میری نانی کا خدا جو ساری دنیا کا دوست تھا اور اکثر یہ سوال مجھے بے چین کرتا تھا ——

"ایسے اچھے خدا کو میرا نانا کیوں نہیں پہچانتا؟"

مجھے سڑکوں پر دوڑنے کی اجازت نہیں تھی، کیوں کہ اس سے یک بیک میں مشتعل ہو جاتا تھا۔ اس سے مجھ میں جو تاثرات پیدا ہوتے وہ مجھے باؤلا بنا دیتے تھے اور اس کے بعد اکثر کوئی نہ کوئی فساد ہو جاتا تھا۔

میرا کوئی ساتھی نہ تھا۔ پڑوس کے لڑکے مجھے دشمن گردانتے تھے۔ وہ مجھے "کشرن لونڈا" کہتے اور اس سے مجھے بڑی چڑ تھی۔

یہ جان کر وہ مجھے اور بھی چڑاتے اور مجھے دیکھتے ہی زور سے چلّاتے: "کنسرن کا پوتا —— دن رات روتا! لینا جانے نہ پائے" بس جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ کم عمری کے باوجود میں طاقت ور تھا اور میرے گھونسے ایسے ہلکے نہ تھے۔ اس لیے یہ سب مل کر مجھ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ عموماً میری کندی ہو جاتی تھی اور میں ناک یا منہ پر کوئی زخم لیے ہوئے گھر لوٹتا تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور دھول میں سنے ہوئے۔

نانی مجھے دیکھتے ہی درد اور پریشانی سے چیخ اُٹھتی تھی:

"ارے یہ کیا؟ —— ارے فسادی تو پھر لڑ آیا۔ تیرے سر میں یہ کیا سودا سمایا ہے؟"

میرا مُنہ دھو کر وہ خراشوں کو تانبے کے سکّے سے سینکتی یا بیسے کا بھپارا دیتی: "اس مار کُٹائی سے تجھے کیا ملتا ہے۔ گھر میں تو تو اللہ میاں کی گائے بنا رہتا ہے لیکن باہر نکلتے ہی مُوا سانڈ بن جاتا ہے۔ تجھے شرم بھی نہیں آتی۔ ٹھہر میں بڑے میاں سے کہہ کر تیرا باہر جانا بند کراتی ہوں۔"

نانا ان چوٹوں کو دیکھ کر بھی کچھ نہ کہتا۔ غرّا کر بس یہ حکم دیتا: "یہ تمغے ہیں تمغے!۔ ابے رستم کے بیٹے جب تک تو میرے گھر ہے خبردار جو سڑک پر قدم رکھا۔ سُنتا ہے؟"

سنسان سڑک میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ لیکن بچوں کے شور میں وہ موہنی تھی کہ میں نانا کی تنبیہ پر لات مار کر باہر بھاگ آتا تھا۔ مار دھاڑ اور گالی گلوچ کی میں کوئی پروا نہ کرتا تھا

سڑک کے کھیلوں کی وحشت انگیزی مجھ میں جنون کی سی کیفیت پیدا کردیتی تھی۔ اس کے بعد طبیعت بوجھل اور چور چور ہوجاتی تھی۔ لیکن جب دوسرے لڑکے کتوں اور مرغوں کو کھدیڑ رہے ہوں، بلیوں کو مار رہے ہوں، یہودیوں کی گایوں کو بھگا رہے ہوں۔ متوالوں کو چڑا رہے ہوں اور "اِگوشا کی جیب میں موت کی پڑیا" کا نعرہ لگا رہے ہوں ـــــ تو میں چپ کیسے بیٹھ سکتا تھا۔

اِگوشا اونچا پورا سوکھا ساکھا آدمی تھا۔ اس کے بے گوشت چہرے پر بال اُگے ہوئے تھے اور وہ بھیڑ کی کھال اوڑھے رہتا تھا وہ عجیب طریقے سے ڈگمگاتے ہوئے سر جھکائے زمین پر نظر جمائے سڑکوں کا چکر کاٹا کرتا اور کبھی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ اس کا آہنی رنگ کا چہرا اور چھوٹی چھوٹی اُداس آنکھیں مجھ میں ایک ہراس آگیں احترام کا جذبہ پیدا کرتی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ یہ کسی اہم مسئلہ پر غور کیا کرتا ہے یا کسی چیز کی تلاش میں ہے اور اسے ستانا اچھا نہیں۔

بچّے اس کا پیچھا کرتے اور اس کی چوڑی پیٹھ پر پتھر مارا کرتے تھے۔ وہ کچھ دور یوں چلتا رہتا تھا گویا اُسے اس سنگ باری کی خبر بھی نہیں۔ پھر یک بیک رُک کر اپنی پھٹی ہوئی ٹوپی یوں ہٹا لیتا تھا گویا ابھی نیند سے جاگا ہو۔

بچّے چلّاتے تھے: "اِگوشا کی جیب میں موت کی پُڑیا! اِگوشا کہاں جا رہا ہے؟ وہ دیکھ جیب میں موت سوئی ہوئی ہے!"

پہلے وہ جیب ٹٹولتا تھا۔ پھر جھٹ جُھک کر زمین سے پتھر یا مٹّی کا ڈھیلا اُٹھا کر زور سے ہاتھ گھماتے ہوئے گالیاں بکنے لگتا

تھا۔ اس کی گالیاں بندھی بندھائی تھیں اور وہ ہرگز بچّوں کی بےتھما گالیوں کا مقابلہ نہ کرسکتی تھیں۔ وہ ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کا لنبا کوٹ اسے روک لیتا اور وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتا۔ اس حالت میں وہ کسی پیڑ کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ادھر بچّے اس پر لگاتار سنگ باری کرتے جاتے اور ان میں سے سب سے بڑا پاس آکر اس کے سر پہ خاک جھونک دیتا تھا۔

لیکن سب سے دردناک نظارہ ہمارے پُرانے مستری گری گوری کا تھا جو اب نپٹ اندھا ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی دراز قد اور شکیل تھا اور بھیک مانگتے وقت زبان سے کچھ نہ بولتا تھا۔ ایک ضعیفہ اس کا بازو تھامے رہتی تھی۔ کھڑکی کے قریب رُک کر آنکھیں جُھکائے ہوئے وہ خستہ آواز میں فریاد کرتی تھی:

"لِلّٰہ ایک اندھے پر رحم کرو!"

لیکن گری گوری کبھی کچھ نہ کہتا تھا۔ اس کی سیاہ عینک در و دیوار کو تاکتی یا راہ گیروں کو گھورتی رہتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر گویا مہر لگی ہوئی تھی۔ گھنی ڈاڑھی ہاتھوں پہ مورچھل کرتی رہتی تھی۔ میں اکثر اسے دیکھتا، لیکن اس کے مُنہ سے کبھی کوئی آواز نہ سنتا تھا۔ اس بے زبان بوڑھے کا تصور میرے دل کو چھلنی کردیتا تھا۔ مجھ میں یہ جرأت نہ تھی کہ اس کے قریب جاؤں۔ لیکن جیسے ہی وہ نظر آتا میں دوڑ کر نانی کو اطلاع دیتا: "گری گوری جا رہا ہے۔" وہ پسیجی ہوئی آواز میں پوچھتی: "اچھا؟ جا، دوڑ کر یہ اُسے دے آ۔" لیکن میں غصّے سے انکار کردیتا تھا اور وہ خود اُٹھ کر دروازے

تک جاتی اور دیر تک اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ وہ ہنستا تھا۔ ڈاڑھی سُلجھانے لگتا تھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولتا تھا۔ کبھی کبھی نانی اُسے باورچی خانے میں بُلاکر کھانا کھلاتی اور کھاتے کھاتے وہ ہمیشہ پوچھتا کہ الکسی کہاں ہے۔ نانی مجھے آواز دیتی لیکن میں بھاگ کر آنگن میں چھُپ جاتا۔ میں اس کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ اس کے سامنے میں شرم کے بارسے دب جاتا تھا اور جانتا تھا کہ نانی کو بھی ندامت ہے۔ صرف ایک مرتبہ گری گوری کے معاملے میں ہم میں گفتگو ہوئی۔ اسے باہر پہنچاکر نانی روتی ہوئی اندر آئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے نرمی سے پوچھا: "تم اس سے بھاگتے کیوں ہو۔ وہ بھلا آدمی ہے اور تمھیں چاہتا ہے۔"

"نانا اُسے اپنے ساتھ کیوں نہیں رہنے دیتے؟"

"نانا؟" وہ رُک گئی اور آہستہ آہستہ یہ پیشین گوئی کرنے لگی: "میں جو کہتی ہوں اُسے یاد رکھنا۔ خدا ہمیں اس گناہ کی سزا دیگا یہ سزا عبرتناک ہوگی ——"

اس کا کہا سچ نکلا۔ کیوں کہ دس سال بعد جب وہ مرگئی تو نانا شہر میں بھیک مانگنے لگا۔ وہ پاگل ہوچلا تھا اور دروازوں سے جھانک کر گڑگڑایا کرتا تھا: "اچھے باورچی، راہِ خدا گوشت کا ایک ٹکڑا دے دے۔ .... ہشت، وحت۔"

اِگوشا اور گری گوری کے علاوہ "ورنکا" نامی عورت پر مجھے بڑا ترس آتا تھا۔ وہ بہت بدنام تھی اور اُسے کوئی سڑک پر بھی کھڑے ہونے نہ دیتا تھا۔ یہ لمبی تڑنگی عورت، بال کھولے، میچے

فحش گیت گاتی ہوئی تیوہاروں کے موقع پر نمودار ہوتی تھی۔ اس کی چال ایسی تھی کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ زمین کو چھو رہی ہے یا پانو اٹھا رہی ہے۔ ایک بادل تھا جو اڑا آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگ مکانوں یا دوکانوں میں چھپ جاتے تھے۔ اس کی موجودگی جھاڑو کا کام انجام دیتی اور سڑک بالکل صاف ہوجاتی تھی۔ اس کا چہرا نیلا اور غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں یوں پھٹی پڑتی تھیں کہ ڈر لگتا تھا اور وہ آہ بھر کر چیخ لگاتی تھی: "میرے بچّو، بولو: تم کہاں ہو؟"

میں نے نانی سے اس کے حالات دریافت کیے۔ پہلے تو اس نے بتانے سے انکار کیا مگر بعد میں مختصر واقعہ سنایا: "یہ عورت ورونوف نامی سرکاری ملازم کی بیوی تھی۔ ترقی حاصل کرنے کے لیے اس نے اسے اپنے افسر کی نذر کردیا۔ وہ اسے کہیں لے گیا اور دو سال تک یہ غائب رہی۔ جب وہ لوٹی تو اس کے دونوں بچّے مرچکے تھے اور اس کا شوہر سرکاری رقم کے غبن کے جرم میں قید کاٹ رہا تھا۔ غم بھلانے کے لیے یہ شراب پینے لگی اور ہنگامے برپا کرنے لگی۔ ہر تیوہار کو تم اسے حوالات میں پاؤ گے۔"

سچ ہے کہ گھر میں باہر سے زیادہ سکون تھا۔ سب سے پُرلطف گھڑیاں وہ تھیں جب کھانے کے بعد نانا جاکوف کے کارخانے کی راہ لیتا تھا اور نانی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر مجھے بھانت بھانت کے قصّے اور میرے باپ کے حالات سناتی تھی۔

جب شاما پھپھی کی جان اس نے بلّی سے بچائی تھی، نانی نے

اس کے لیے ایک مصنوعی ٹانگ بنادی تھی اور ٹوٹے ہوئے پروں کو بھی سدھار دیا تھا۔ وہ اسے بول سکھایا کرتی تھی۔ اس کا پنجرا کھڑکی کے اوپر لٹکا رہتا تھا اور نانی اس کے آگے گھنٹوں کسی سید ھے سادے جانور کی طرح کھڑی رہتی تھی۔ پرندے کے پر کوئلے سے بھی کالے تھے۔ نانی بار بار اس سے کہے جاتی تھی:

"اچھی نتاما کھانے کو کچھ مانگ۔"

نتاما اپنی شریر آنکھوں سے اسے ایک ٹک دیکھتی اور اپنی چوبی ٹانگ پنجرے کے اندر ٹیکتی تھی۔ پھر اپنی گردن گھما کر وہ کوئل یا بلبل کی نقل کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ بلّی کی طرح منمناتی یا کتّے کی طرح غرّاتی تھی۔ یہ سب تھا لیکن وہ انسان کی بولی نہ بول سکتی تھی۔ نانی جھنجھلا کر ڈانٹتی تھی: "اری یہ کیا ٹیں ٹیں لگا رکھی ہے میں جو کہتی ہوں وہ بول: بشنکا، نتاما کو کھانا دو۔"

نتاما اگر پہلا بول نکال لیتی تو نانی کا چہرا کِھل جاتا اور وہ اپنے ہاتھ سے اُسے دانا چگاتے ہوئے بولتی:

"اری چڑیل میں تجھے خوب پہچانتی ہوں۔ تو یوں ہی بنتی ہے ورنہ تجھے کیا نہیں آتا۔ تو تو سب کچھ کرسکتی ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ بڑی گھِس گھِس کے بعد نانی کو کامیابی ہوہی گئی وہ نتاما کچھ رٹے ہوئے جملے بولنے لگی اور نانی کے اشارے پر صاف صاف یہ کہنے لگی: "اچھی بی سلام۔"

پہلے اس کا پنجرا نانا کے کمرے میں تھا۔ لیکن بہت جلد نقلِ مکان کرنا پڑا کیوں کہ وہ نانا کی نقل اڑانے لگی۔ جب نانا

زور زور سے دعا مانگنے لگتا تو شاما پنجرے کی تیلیوں سے چونچ نکال کر پکارنے لگتی: " توتو. . . . . تیری، تیری!"

نانا کو یہ بات اکھرنے لگی اور ایک بار دعا کے بیچ میں پاؤں پٹک کر وہ غصّے سے چلّایا:

" اس شیطان کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

اس گھر میں ہنستے کھیلتے دن کٹ رہے تھے۔ لیکن گاہے گاہے میں آپ ہی آپ مغموم ہو جاتا تھا۔ یہ غم مجھے نڈھال کر دیتا تھا اور میں دیر تک کسی اندھیری کھائی میں، ہر قسم کے احساس سے محروم اندھوں اور ادھ موؤں کی طرح پڑا رہتا تھا۔

---

# باب ۸

ایک روز بے وہم و گمان نانا نے یہ مکان بیچ کر ایک نیا گھر خرید لیا۔ یہ خستہ ہو چلا تھا اور اس پر سبزہ اُگنے لگا تھا۔ تاہم وہ صاف ستھرا اور خاموش تھا۔ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی جھونپڑیوں کی قطار کے آخر میں یہ گھر تنہا یوں کھڑا ہوا تھا گویا کھیتوں کے بیچوں بیچ اس کی داغ بیل رکھی گئی ہو۔

اس میں ایک خاص سج دھج اور رکھ رکھاؤ تھا۔ سامنے کے حصّے پر جو قلعی تھی اُس کا رنگ گہرا گلابی تھا، لیکن اس میں کوئی شوخی نہ تھی۔ اس کے مقابل کھڑکیوں کے آسمانی پٹ بہت بھلے لگتے تھے۔ اِملی اور لیمو کی ٹہنیوں نے چھت کے بائیں حصّے پر گھونگھٹ سا ڈال دیا تھا۔ آنگن اور پھلواری میں پگ ڈنڈیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور وہ آنکھ مچولی کے لیے نہایت موزوں تھیں

باغ خوبصورت تھا۔ چھوٹا سہی مگر پھول پتّیوں سے مالا مال تھا ایک کونے میں ذرا سا دھوبی گھر تھا اور دوسری طرف ایک بڑا سا گڑھا جو گھاس سے ڈھنکا ہوا تھا اور اس میں سے دُود کش کی نلکی اس امر کی یاد دہانی کر رہی تھی کہ یہاں کبھی دھوبی گھر کا تندور تھا۔ باغ کا بایاں حصّہ کرنل اسنیکوف کے اصطبل کی دیوار سے

گھرا ہوا تھا۔ داہنی جانب تبلنگا منزل تھی اور آخری جھور پتر ونا
نامی گوالن کے کھیت سے جا ملتا تھا۔ یہ گوالن چقندر سی سُرخ اور
فربہ اندام تھی اور وہ اتنا شور مچاتی تھی کہ مجھے اس پر کسی گھڑیال کا
گمان ہوتا تھا۔ اس کی جھونپڑی نشیب میں تھی۔ خستہ و خراب اور کائی
سے ڈھنکی ہوئی۔ اس کی دونوں کھڑکیاں بڑی ہمدردی سے کھیت
خندق اور اُس جنگل کو تاکا کرتی تھیں جو دور سے نیلے بادل کا ٹکڑا
معلوم ہوتا تھا۔ میدان میں دن بھر سپاہی دوڑتے پھرتے تھے اور
ان کی تلواریں سورج کی کرنوں میں تیز بجلی کی مانند چمک اُٹھتی تھیں
ہمارے مکان میں بھانت بھانت کے کرائے داروں کا مجمع تھا
پہلی منزل میں ایک تاتار سپاہی اپنی پستہ اور گداز بیوی کے ساتھ
رہتا تھا۔ یہ عورت صبح سے شام تک چپڑ چپڑ کرتی اور ہنستی رہتی
تھی۔ ایک مزیّن ستار بجاتی ہوئی وہ بڑی سُریلی آواز میں گایا
کرتی تھی۔ اس کا محبوب گیت یہ تھا۔

تو بھونرے اور ڈال پر جا

یہ سجنی اور کسی کی ہے!

چمن میں پھولوں کا کیا کال

ذرا تو دل کی ڈور لگا!

اور وہ سپاہی گنیش جی کی طرح پالتی مارے کھڑکی کے پاس بیٹھ کر
اپنے نیلے چہرے کو پھلاتا اور کبھی اپنی خونیں آنکھوں کو شرارت سے
مٹکاتا تھا۔ اپنی امراؤ اور اُمل چلم کو پیتے ہوئے وہ کھانس کر کتّے کی
طرح غرّا دیا کرتا تھا: "سبحان . . . . اللہ!"

اصطبل اور کباڑ خانے کے اوپر جو کشادہ کمرا تھا اس میں بوڑھا
پیٹر اپنے گونگے بھتیجے اسٹیپن کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ دونوں شراب کے
پیپلے کھینچنے کا کام کرتے تھے۔ اسٹیپن بڑا آرام طلب تھا اور اس کے
چہرے کو دیکھ کر مجھے تانبے کی تھالی کا خیال آتا تھا۔ ان کے ساتھ
ایک افسر کا تاتاری اردلی "ولی" رہا کرتا تھا۔ اس کا جسم دوہرا مگر
چہرا محرّمی تھا۔ یہ سب لوگ میرے لیے اپنی اپنی جگہ پر انوکھے تھے
لیکن میری سب سے زیادہ توجہ اُس کرائے دار پر تھی جسے لوگوں
نے "دراصل صاحب" کا لقب دے رکھا تھا۔ اس نے گھر کے پچھواڑے
باورچی خانے کے پاس کی کوٹھری لے رکھی تھی۔ خاصی بڑی کوٹھری
تھی جس کی ایک کھڑکی آنگن میں اور دوسری باغ میں کھُلتی تھی۔ وہ
دُبلا تھا اور جُھک کر چلتا تھا۔ چہرے کی رنگت سفید اور کالی داڑھی
دو حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس کی مہربان آنکھیں چشمے سے ڈھکی
رہتی تھیں۔ وہ کم سخن اور شرمیلا تھا۔ جب اسے چائے یا کھانے کا
بُلاوا دیا جاتا تو اس کا تکیہ کلام ہوتا "ایں، دراصل"، چنانچہ نانی نے
اس کا نام "دراصل صاحب" رکھ دیا۔ وہ مجھ سے کہتی: الکسی دراصل
صاحب سے کہو کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ یا: میاں دراصل، تم نے
تو کچھ کھایا ہی نہیں۔

اس کا کمرا صندوقوں اور موٹی موٹی کتابوں سے اٹا ہوا تھا
یہ کتابیں روسی زبان میں تھیں اور انھیں دیکھ کر مجھے سخت حیرت
ہوتی تھی۔ رنگ برنگے عرقوں سے بھری ہوئی بوتلیں، تانبے اور لوہے
کے ڈلے اور سیسے کی چھڑیں الگ جلوہ گر تھیں۔ سُرخ چمڑے کی

صدری اور ایک بھوری پتلون پہنے جس میں ہزاروں قسم کے رنگ لگے ہوئے تھے، بدبو میں سنے ہوئے اور بالکل اول جلول بنے ہوئے وہ صبح سے رات تک کبھی سیسہ گلاتا رہتا، کبھی چھوٹی سی ترازو پر انواع واقسام کی چیزیں تولتا اور کبھی اُنگلی جلاکر چیخ پڑتا اور پھر خاموشی سے اُسے پھونکنے لگتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ دیوار کے ایک نقشے کے قریب جاتا، اپنی عینک صاف کرکے نقشے کو اس غور سے تکنے لگتا کہ اس کی نکیلی پیلی ناک اس سے بھڑ جاتی تھی۔ یا وہ یک بیک کمرے کے بیچ میں یا کھڑکی کے پاس جاکر سر اُٹھائے اور آنکھیں بند کیے کھڑا ہوجاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی محویت کے عالم میں بُت بنا کھڑا رہتا تھا۔

میں دھوبی گھر کی چھت پر چڑھ جاتا تھا تاکہ آنگن کے اُس پار دیکھ سکوں۔ کھُلی ہوئی کھڑکی کے اندر اسپرٹ کا چولھا میز پر جلتا ہوا نظر آتا تھا اور وہ خود ایک میلی ہوئی نوٹ بک میں کچھ لکھتا ہوتا تھا۔ اس کا چشمہ ایک نیل گوں روشنی میں جگمگاتا تھا۔ اس آدمی کی پُراسرار حرکتیں مجھے چھت پر گھنٹوں معلق رکھتی تھیں۔ اور میرا تجسس ناقابلِ بیان ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہاتھ باندھے چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑکی کے پاس یوں کھڑا ہوجاتا تھا گویا اس میں چُن دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے اس احساس سے سخت غصہ آتا تھا کہ اسے میرے وجود کی خبر بھی نہیں۔ یک بیک میز کی طرف مُڑکر وہ پھر کھڑ بڑ شروع کردیتا تھا۔

اگر وہ زرق برق پوشاک میں ملبوس امیر ہوتا تو میں اُس سے

ضرور ڈر جاتا۔ لیکن وہ غریب تھا۔ اس کے کوٹ پر قمیص کا میلا کالر نظر آتا تھا۔ اس کی پتلون میلی تھی اور اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے ننگے پاؤں میں بڑی موٹی چپل گھس گئی تھی۔ غریب نہ خطرناک ہوتے ہیں نہ طاقت ور۔ ان کے تئیں نانا کی نفرت اور نانی کے کرم آمیز التفات نے مجھے یہ بات سکھادی تھی۔

گھر بھر میں دراصل صاحب کی کوئی قدر نہ تھی۔ سب ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ سپاہی کی کھلنڈری بیوی نے اس کا نام سفید ناک رکھا تھا۔ چچا پیٹر اُسے کیمیاگر کہتا تھا اور نانا اُسے جادوگر کے نام سے یاد کرتا تھا۔

میں نے نانی سے پوچھا: "یہ بیچارا کرتا کیا ہے؟"

"یہ تیرے پوچھنے کی بات نہیں ہے۔ زیادہ بک بک نہ کر!"

مگر ایک روز میں ہمت باندھ کر اس کی کھڑکی تک پہنچ گیا اور اپنے ہول کو چھپا کر پوچھ ہی بیٹھا: "آپ کیا کرتے ہیں؟"

وہ چونک پڑا اور عینک سرکا کر دیر تک میرا معائنہ کرتا رہا۔ پھر اپنا ہاتھ پھیلا کر جو چھالوں کے نشانوں سے داغ دار ہو گیا تھا بولا "اوپر چڑھ آؤ۔"

اس کی اس تجویز نے کہ بجائے دروازے کے کھڑکی سے ہی اندر اُتر آؤں، اس کی عزت میرے دل میں بڑھادی۔ وہ ایک صندوق پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ وہاں سے اُٹھ کر وہ میرے پاس آیا اور دھیرے سے پوچھا:

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

مجھے بڑا اچنبھا ہؤا کیوں کہ میں روز چار مرتبہ ایک ہی میز پر اس کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا۔

"میں مالک مکان کا نواسا ہوں۔"

اپنی انگلیوں کو گھماتے ہوئے وہ بولا: "ایں، دراصل"! وہ چپ ہوگیا تھا، اس لیے اُسے سمجھانے کی غرض سے میں نے کہا:

"میں کِشترن نہیں ہوں —— میرا تعلق پشکوف گھرانے سے ہے!"

شُبہہ آمیز لہجے میں وہ دُہرانے لگا: "پشکوف! ہیں، دراصل!" مجھے الگ ہٹاکر وہ میز کی طرف گیا اور حکم دیا: "خاموش بیٹھے رہنا!"

دیر تک میں غور سے اس کی کارروائیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ تانبے کا ایک ڈلا شکنجے میں ڈال کر اس نے دبایا اور اس کے ذرّے سونے کے ریزوں کی طرح ایک کاغذ پر گرنے لگے۔ انھیں اس نے اپنی ہتیلی پر جمع کیا اور ان میں کوئی سفید سفوف ملاکر ایک برتن میں ڈال دیا جس میں کوئی عرق پڑا ہؤا تھا۔ یہ مرکب آن کی آن میں جوش کھاکر دُھنواں دینے لگا اور اس سے ایسی چراند نکلی کہ میں کھانستے کھانستے ہلکان ہوگیا۔

جادوگر نے فخر سے کہا: "بُری بدبو ہے، کیوں بھئی؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

"بہت خوب! صاحب زادے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نسخہ کامیاب رہا۔"

میں نے جی ہی جی میں سوچا کہ یہ اِترانے کی کیا بات ہے اور سختی سے بولا: "جس چیز کی بو بُری وہ اچھی ہو ہی نہیں سکتی!"

اس نے آنکھ مار کر جواب دیا، "میاں، یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ اچھا — کیا تم چوپڑ کھیلتے ہو؟"

"ہاں، ہاں"

"تم چاہتے ہو کہ میں گوٹیاں بنا دوں؟"

"لائیے دیکھوں تو سہی۔"

"مگر میں اس شرط پر گوٹیاں تمھیں دوں گا کہ آئندہ کبھی یہاں نہ آؤ گے"

غصّے کے مارے تن بدن میں آگ لگ گئی: "میری جوتی اب آپ کے ہاں آتی ہے۔" یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا اور باغ میں چلا گیا۔ یہاں نانا سیب کے پیڑوں کو کھاد دے رہا تھا کیوں کہ پت جھڑ کا موسم تھا اور پتیاں گر چکی تھیں۔ مجھے قینچی تھما کر اس نے کہا: "جاؤ بیری کے پودوں کی پتیاں کتر ڈالو۔"

میں نے پوچھا: "در اصل صاحب آخر کرتے کیا رہتے ہیں؟"

"کرتے کیا ہیں — کمرے کا ستیاناس! فرش جلا دیا، پردے پھاڑ دیے۔ میں اُن سے کہہ دوں گا کہ بوریا بدنا اُٹھائیے۔"

قینچی چلاتے ہوئے میں نے بھی ہامی بھری: "ان کی بڑی عنایت ہو گی اگر وہ اپنا ڈیرا اُٹھائے جائیں۔"

لیکن میں نے اپنے فیصلے میں بڑی جلدی کی تھی۔

برسات کی شاموں کو جب نانا باہر ہوتے تھے، نانی تمام کرائے داروں کو باورچی خانے میں چائے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ بھٹّے والے افسر کا اردلی اور بی پتروناکا آنا تو ضروری تھا۔ سپاہی کی چنچل

بیوی بھی کبھی کبھار آجاتی تھی اور کوئی آئے یا نہ آئے، دراصل صاحب
اپنی مخصوص جگہ پر بے حرکت بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ گونگا اسٹیپن
تاتاری کے ساتھ تاش کھیلا کرتا تھا۔ ولی اس کی ناک کے نیچے پتا
پٹک کر چلاتا تھا: "تمھاری چال ہے"

چچا پیٹر ایک شیرمال اور جام کا ڈبا لیے ہوئے آتے تھے۔
شیرمال کاٹ کر اور اس پر جام لگا کر وہ نہایت نفاست سے ہر
مہمان کے سامنے پیش کرتے تھے:

"بڑی عزت افزائی ہوگی اگر آپ یہ حقیر تحفہ قبول فرمائیں!"
جب کبھی کوئی ایک ٹکڑا لے لیتا تو پیٹر بہت غور سے اپنی ہتھیلی کو
دیکھتا اور اس پر جام کی ایک آدھ بوند نظر آتے ہی اُسے جھٹ
چاٹ لیتا تھا۔

پتروناایک بوتل میں شیری کی شراب اور سیاہن میوے
اور مٹھائیاں لاتی تھی۔ اس جشن کو دیکھ کر میری پیاری نانی کی
خوشی کی انتہا نہ رہتی تھی۔

دراصل صاحب سے اس ناگوار ملاقات کے چند روز بعد ایک
ایسی ہی دعوت ہوئی۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا سنسنا رہی تھی اور پیڑ دیواروں
کو اپنی ٹہنیوں سے جھاڑ رہے تھے۔ مگر باورچی خانہ گرم اور
آرام دہ تھا۔ ہم سب مِل جُل کر بیٹھے نانی کی کہانیاں سن رہے
تھے۔ خلافِ عادت نانی کا لطف و کرم دُگنا ہوگیا تھا اور وہ
یکے بعد دیگرے نئے نئے قصے سُناتی جاتی تھی۔ ہم سب میں باہمی ہمدردی

کی لہرسی دوڑ گئی تھی۔ نانی تندور کے کنارے پاؤں لٹکائے ہماری طرف جھک کر بیٹھا کرتی تھی اور ایک جھلملاتا ہوا چراغ اس کے چہرے کو اجال دیتا تھا۔ جب کبھی اُسے داستان گوئی کا شوق اُٹھتا تو وہ اسی آسن پر بیٹھتی تھی۔ وہ کہتی تھی: "میں کسی اونچے مقام پر بیٹھ کر زیادہ اچھی طرح باتیں کر سکتی ہوں۔"

میں تندور کی چوڑی سی سیڑھی پر نانی کے پاؤں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ دراصل صاحب میرے قریب ہی تھے۔ نانی نے "فقیر میرون اور سپاہی ایوان کی داستان چھیڑ دی۔"

"گوردین نامی ایک سورما تھا جس کا قلب سیاہ اور دل پتھر کا تھا۔ اُسے صداقت اور شرافت سے نفرت تھی اور وہ خلقِ خدا پر بڑا ظلم توڑتا رہتا۔ وہ میرون فقیر سے بہت ڈرتا تھا اور اس کی جان کا بیری تھا۔ کیوں کہ یہ اللہ والا انسانوں کا پیارا تھا۔ گوردین نے اسے قتل کرنے کا تہیّہ کیا اور ایوان نامی نامور سپاہی کو بُلا کر حکم دیا کہ اس فقیر کو مار ڈال۔ ایوان اپنی تلوار مانجھ کر فقیر کے پاس پہنچا اور باتیں بنانے لگا کہ میں آپ کی زیارت کو آیا ہوں۔ مگر میرون اس کا منشا سمجھ گیا اور ہنس کر بولا کہ او مکّار، یوں جھوٹ بولنے سے کیا حاصل۔ ایوان یہ سُن کر نادم ہوا اور اقرار کیا کہ سچ ہے میں آپ کی جان لینے آیا ہوں۔ مجبور ہوں کہ میرے مالک کا یہ حکم ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں تلوار کا وار کروں آپ آخری دعا مانگ لیجیے۔ فقیر نے جواب دیا کہ میری دعا میں دیر لگے گی، اس لیے تو اس کا انتظار نہ کر اور اپنا کام کر۔ مگر ایوان اصرار کرنے لگا اور قسم کھائی

کہ دعا میں جتنی بھی دیر لگے گی میں یہاں کھڑا رہوں گا۔
یہ سُن کر میرون فقیر سجدے میں گر پڑا۔ دن ختم ہوا، رات آئی اس طرح سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن میرون بھوکا پیاسا دعا مانگتا رہا۔ اور خدا کی قدرت کہ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ ایوان کی ننگی تلوار میں زنگ لگ گیا اور وہ کھڑے کھڑے پتھرا گیا۔ قدرت نے اُسے ایسی سزا دی کہ وہ اسی جگہ مورت بنا کھڑا ہے نہ چل سکتا ہے نہ ہل سکتا ہے۔"

اور اس مورت کے مُنہ سے ایک یہی آواز آتی ہے
جو ظالم کے غلاموں کے لیے ایک درسِ عبرت ہے۔
جو آقا ظلم کی ترغیب دے تجھ کو تو اے بندے
نہ ہرگز کان دے اس پر یہی آئینِ فطرت ہے۔

اور فقیر میرون اب بھی سجدے میں پڑا ہوا ہمارے لیے دعا کرتا ہے۔"

. . . . . . . . . . .

یہ قصہ جو منظوم تھا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کسی وجہ سے درصل صاحب مشتعل ہوگئے ہیں۔ وہ کبھی اپنی اُنگلیاں چٹخاتا، کبھی چشمہ اِدھر اُدھر گھمانے لگتا۔ اُسے ہلا ہلا کر وہ نظم پر تال دیتا سر ہلا کر اپنی آنکھیں ہتیلی سے ملنے لگتا۔ پھر رومال سے خواہ مخواہ اپنی پیشانی یوں پونچھنے لگتا گویا وہ پسینے سے شرابور ہے۔ اگر کوئی اور کھانستا یا ذرا سی بھی آواز کرتا تو یہ دانت نکال کر "سی . . . ." کہہ اُٹھتا تھا۔ جب نانی خاموش ہوگئی اور آستین سے مُنہ کا پسینہ پونچھنے لگی تو، اصل صاحب اُچھلے اور ہاتھ پھیلا کر چیخ اُٹھے،

"بہت خوب! اس داستان کو تو قلم بند کرنا چاہیے ۔۔۔۔۔۔۔
کس قدر پُر معنی ہے ۔۔۔۔"

ہم نے دیکھا کہ وہ آپ ہی آپ رو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں آب دیدہ تھیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ یہ نظارہ اتنا ہی حیرت ناک تھا جتنا کہ دردناک۔ لیکن ساتھ ساتھ جب وہ اِدھر اُدھر پھُدکنے لگا اور عینک کی کمانی ناک کے آگے نچانے لگا کیوں کہ بڑبڑاہٹ میں وہ کان تک نہیں پہنچ سکتی تھی تو بوڑھا پیٹر اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکا۔ دوسرے لوگ عجب اُلجھن میں پڑ گئے۔ نانی نے بگڑ کر کہا:
"لکھنے میں بُرائی کیا ہے! اور یہ ایک کیا مجھے ایسے ایسے سیکڑوں قصّے یاد ہیں"۔

مگر در اصل صاحب اُسی جوش کے عالم میں بولے: "نہیں نہیں مجھے تو یہی قصّہ چاہیے ۔۔۔۔۔ یہ روسی ہے ۔۔۔ بالکل روسی!"
اور کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر واہی تباہی بکنے لگا۔ اور ایک ہاتھ میں عینک تھامے دوسرے سے گویا نکھا سا جھلنے لگا۔ کچھ دیر وہ اسی مشتعل انداز میں تقریر کرتا گیا۔ اس کی آواز پنچم سُر کو پہنچ گئی اور پیر پٹک کر وہ گرج اُٹھا:

"جو آقا ظلم کی ترغیب دے تجھ کو تو ای بندے
نہ ہرگز کان دے اس پر یہی آئینِ فطرت ہے۔
سچ، بالکل سچ!"

یک بیک وہ چُپ ہو گیا۔ اس کی تقریر کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک بار ہم سب کو دیکھ کر مجرموں کی طرح سر لٹکا کر کمرے سے

باہر چلا گیا۔

سب مہمان قہقہہ مار کر ہنسنے لگے اور ایک دوسرے کی طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔ نانی تندور کے کونے میں دبک کر گہری سانسیں بھرنے لگی۔

اپنے موٹے موٹے سُرخ ہونٹوں کو ہتیلی سے مل کر پترونا نے کہا؛ "اسے مالیخولیا ہی!"

لیکن پیٹر نے جواب دیا: "نہیں، یہ بھی اس کا ایک خبط ہی!"

نانی تندور سے اُٹھ آئی اور چائے کا پانی رکھنے لگی۔ پیٹر نے آہستہ سے یہ رمز سمجھائی: "خدا کی خلقت خبطیوں سے خالی نہیں"

تاتاری والی بات کاٹ کر غرّا پڑا: "سب کنوارے بیوقوف ہوتے ہیں"۔

اس پر ایک فرمایشی قہقہہ پڑا۔ پیڑ کا فلسفہ ختم نہ ہوُا تھا: "وہ سچ مچ رو رہا تھا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی ——"

مجھے یہ لعن طعن بالکل نہ بھائی۔ میرا دل بھر آیا۔ دراصل صاحب کی ان حرکتوں سے مجھے سخت حیرت ہوئی لیکن ان پر بہت ترس بھی آیا۔ میں کسی طرح اُن ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کی یاد نہ بھلا سکا۔

رات بھر وہ باہر رہا اور دوسرے دن دوپہر کو جب گھر لوٹا تو وہ وحشت زدہ بھی تھا اور نادم بھی۔

کسی ایسے بچّے کی طرح جسے اپنی غلطی کا احساس ہو، اس نے نانی سے کہا: "رات کو میں نے بھی کیا تماشا کیا! آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"اس میں ناراضی کی کیا بات ہی"

"میں آپ کی بات کاٹ کر . . . بیچ میں بکنے جھکنے لگا تھا۔"
"نہیں اس کا کسی نے بُرا نہیں مانا۔"
میں سمجھ گیا کہ نانی اس سے ڈرتی ہے۔ وہ اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر باتیں نہیں کر رہی تھی اور خلافِ فطرت اس کی آواز دبی ہوئی تھی۔
وہ نانی کے قریب آیا اور بڑے بھولے پن سے کہنے لگا:
"آپ جانتی ہیں کہ میں کتنا اکیلا ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ لیکن ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ میری روح آپ ہی آپ تڑپ اٹھتی ہے گویا اس میں نشتر لگ گیا ہو۔ ایسے موقعوں پر پیڑ پودوں اور سنگ و خشت سے باتیں کرنے لگتا ہوں ——"
نانی اس کے پاس سے ہٹ گئی اور جواب دیا:
"تمھیں شادی کر لینا چاہیے۔"
"آئیں" —— یہ کہہ کر اور مُنہ بنا کر ہاتھ پھیلائے ہوئے وہ باہر بھاگ گیا۔
نانی نے ناک بھوں چڑھا کر اُسے دیکھا اور ناس سونگھتے ہوئے مجھے یہ ڈانٹ بلائی: "خبردار جو اس سے میل جول بڑھایا۔ سُنا یا نہیں؛ خدا جانے یہ کس قماش کا انسان ہے۔"
لیکن اس سے میری دل چسپی اور بھی بڑھ گئی۔ میں اکیلا ہوں، یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کیسی اُداسی چھا گئی تھی۔ ان الفاظ کا مفہوم کچھ میں ہی سمجھ سکتا تھا اور میرے دل پر چوٹ سی لگی۔

اس کی تلاش میں باہر نکل آیا۔

آنگن سے میں اس کے کمرے میں جھانکنے لگا۔ اس میں کوئی نہ تھا اور وہ ایسا کباڑ خانہ معلوم ہو رہا تھا جس میں دنیا بھر کی غیر ضروری چیزیں جمع کر دی گئی ہوں — اتنی ہی غیر ضروری جتنا کہ ان کا مالک۔ میں باغ کی طرف آیا اور وہاں اُسے کھائی کے پاس بیٹھا پایا۔ وہ ایک ادھ جلے تختے پر سکڑا ہُوا بیٹھا تھا۔ کہنی گھٹنوں پر ہاتھ، سر کے پیچھے بندھے ہوئے جسم آگے جُھکا ہُوا۔ آدھا تختہ زمین میں دھنسا ہُوا تھا اور آدھا کھائی کے اوپر کائی سے ڈھنکا ہُوا تھا۔

اُسے اس عاجزی کی کیفیت میں دیکھ کر مجھے اور بھی ترس آیا کچھ دیر تو اُسے میری موجودگی کی اطلاع بھی نہ ہوئی وہ اپنی مدھم مگر تیز آنکھوں سے میرے پرے کسی نقطے کو گھور رہا تھا۔ پھر یکایک چڑچڑی آواز میں اس نے پوچھا:

"تمھیں کچھ چاہیے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر یہاں کیوں آئے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم۔"

اپنی عینک اُتار کر اور اسے اپنے رنگ برنگے رومال سے پونچھ کر وہ بولا: "اچھا، یہاں چڑھ آؤ۔"

جب میں پاس بیٹھ گیا تو میری گردن میں ہاتھ ڈال کر اس نے مجھے اپنے سے چمٹا لیا۔

"چپ رہنا اور نہ ہلنا جلنا۔ تم اس طرح بیٹھ سکو گے —

تم ضدّی تو نہیں ہو ؟"

"کیوں نہیں "

" ایں ، در اصل "

ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ شام خوش گوار مگر سوگوار تھی ۔ آخری گرمیوں کی ایک شام جب زمین گُل پوش تو ہوتی ہی، لیکن خزاں کے آثار بھی نمایاں ہو جاتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ ایک نہ ایک بوٹا مُرجھا جاتا ہی ۔ تابستان کی جاں نوانہ مہک کی بجائے زمین سے سیلن کی بو آنے لگتی ہی ۔ ہوا میں عجیب سی شفافی آجاتی ہی اور پرندے سُرخ آسمان میں اپنی کھوئی ہوئی منزل کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ہر طرف اُداسی پھیلا دیتے ہیں ۔ سنّاٹا چھایا ہوُا تھا ۔ کوئی بھی آواز ، مثلاً چڑیوں کی پھڑپھڑاہٹ یا گرے ہوئے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ ، ایسا شور پیدا کرتی تھی کہ آدمی چونک پڑتا تھا اور پھر یہ آواز اُس عمیق سکون میں غائب ہو جاتی تھی جو دنیا پر چھایا ہوُا تھا اور دل کو مبہوت کر رہا تھا ۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جن میں معصوم و نزہت افزا خیالات پیدا ہوتے ہیں —— کمال نازک ، تارِ عنکبوت سے زیادہ نرمل ، ناقابلِ بیان ، ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح وہ دم کے دم اوجھل ہو جاتے ہیں اور بُجھتے بُجھتے روح میں ملال کی مشعل سی جلا دیتے ہیں جو تسکین بھی دیتی ہی اور خلش بھی ۔ روح گویا آگ کا مندر ہی ۔ اور وہ اتنی حساس ہی کہ ایک ہلکا سا تاثر بھی رہتی زندگی کے لیے اس پر ثبت ہو جاتا ہی اس انوکھے کرائے دار کے پاس بیٹھے بیٹھے میں اس کے ساتھ

سیب کے پیڑ کی سیاہ ٹہنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ننھے ننھے سے پھول شاخوں پر جھول رہے تھے، بگلے قطار باندھے اُڑ رہے تھے اور اوپر لال آکاس کا شامیانہ تنا ہوُا تھا۔ کالے پیلے بادل، جن کی کناری سُرخ ہوگئی تھی، کھیتوں کے اوپر منڈلا رہے تھے اور کوّے ان کے نیچے ان گھونسلوں کی جانب اُڑ رہے تھے، جو قبرستان میں تھے۔

کتنا نظر فریب تھا یہ منظر۔ خصوصًا آج کی شام کو اس کا حُسن اور بھی بڑھ گیا تھا اور میرے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ایک لمبی سانس لے کر میرا ساتھی کہہ دیتا تھا: "میاں کیا لطف کا سماں ہے۔ ہے یا نہیں؟ تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے"

لیکن جب آسمان پر تاریکی چھا گئی اور جُھٹ پٹے کی سیلن ہر طرف پھیل گئی تو اس نے کہا:

"مجبوری ہے۔ اب تو اندر جانا ہی ہوگا"

باغ کے پھاٹک پر رُک کر وہ دھیرے سے بولا: "تمھاری نانی بڑی اچھی عورت ہے۔ کیا کہتے ہیں!" آنکھیں بند کرکے مسکراتے ہوئے وہ بڑے مزے میں وہ بند گانے لگا:

اور اس مورت کے مُنہ سے ایک یہی آواز آتی ہے
جو ظالم کے غلاموں کے لیے ایک درس عبرت ہے ۔
جو آقا ظلم کی ترغیب دے تجھ کو تو اے بندے
نہ ہرگز کان دے اس پر یہی آئینِ فطرت ہے۔
بڈھے، ان الفاظ کو کبھی نہ بھولنا!

مجھے آگے کر کے اس نے پوچھا: "تمھیں لکھنا آتا ہے؟"

"جی نہیں"

"تمھیں لکھنا ضرور سیکھنا چاہیے۔ جب سیکھ لو تو نانی کی کہانیاں قلم بند کر ڈالو۔ ایک روز تمھیں ان کی قیمت کا اندازہ ہوگا۔"

اس طرح ہم میں دوستی ہوگئی۔ اس کے بعد جب کبھی جی چاہتا میں در اصل صاحب کے یہاں پہنچ جاتا۔ کسی بنچے یا کھٹولے پر بیٹھ کر میں اسے سیسا تانبا گلاتے خوبصورت سی ہتوڑی سے لوہا پیٹتے یا باریک سی آری سے کچھ کاٹتے ہوئے دیکھا کرتا تھا اپنی نازک سی ترازو پر وہ بڑی نفاست سے ہر چیز تولتا تھا سفید پتیلیوں میں ایسے سفوف ڈالتا کہ سارا کمرا دھوئیں اور بدبو سے بھر جاتا تھا۔ پھر ماتھے پر بل ڈال کر وہ ایک موٹی سی کتاب کی چھان بین کرتا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے گنگناتا جاتا تھا:

"گلاب جل دو ـــــ"

"آپ کر کیا رہے ہیں؟"

"میاں میں کوئی چیز تیار کر رہا ہوں۔"

"آخر اس کا نام بھی تو معلوم ہو؟"

"ایں ـــــ میں تمھیں یہ نہ بتاؤں گا۔ تمھاری سمجھ میں بھی نہ آئے گا۔"

"نانا تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شاید آپ جعلی سکّے بنایا کرتے ہیں۔"

"تمھارے نانا؟ ـــ ایں! اماں، انھیں تو زبان چلانے سے

کام ہے۔ ورنہ پیسہ بھی کوئی چیز ہے، یہ تو ہاتھ کا میل ہے۔"

"لیکن پیسہ نہ ہو تو روٹی کہاں سے ملے؟"

"یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔ روٹی کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔"

"اور گوشت کے لیے بھی۔"

"ہاں گوشت کے لیے بھی۔"

وہ اس بھولے پن سے مسکرایا کہ میں حیرت زدہ رہ گیا اور میرے کان کھینچ کر بولا: "ابے تو بھی کیا مجتی ہے! بابا تو جیتا میں ہارا، لیکن میں بحث نہیں کرنے کا۔"

کبھی وہ کام وام بند کر کے میرے پاس بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا تھا کہ پانی کس طرح برس رہا ہے گھاس کیسے اُگ رہی ہے، پتیاں کیسے مرجھا رہی ہیں۔ دراصل بہت کم سخن تھا لیکن کہتا تھا پتے کی۔ اگر وہ کبھی میری توجہ کسی چیز کی طرف منعطف کرنا چاہتا تو زبان سے کچھ کہنے کے بدلے کہنی اور آنکھ سے کام لیتا۔ آنگن میں پہلے میرے لیے کوئی چیز جاذب نظر نہ تھی۔ لیکن اس کا ایک جملہ یا ایک اشارہ چیزوں کی رنگت بدلنے کو کافی تھا اور اب ہر معمولی شی بھی میرے لیے قابلِ غور بن گئی۔ ایک بلی دوڑتے دوڑتے پانی کی باؤلی کے پاس پہنچی اور اس میں اپنی پرچھائیں دیکھ کر اس طریقے سے پنجہ جھاڑا کہ گویا اُسے مارنا چاہتی ہے۔

دراصل نے آہستہ سے کہا: "بلیاں مکار اور خود پسند ہوتی ہیں۔"

ایک اصیل مرغا باغ کی باڑھ کے قریب جا کر یوں پر پھڑپھڑانے لگا گویا ابھی اُڑ جائے گا اور اسی کوشش میں گر پڑا۔ اُٹھ کر وہ

غصّے سے بانگ دینے لگا۔
"گھمنڈی اور بیوقوف سپاہی!"
تاتاری ولی کیچڑ میں کسی بوڑھے ٹٹو کی طرح چل رہا تھا۔ آنکھیں مچمچاتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہاں سے سورج کی پیلی کرنیں اس کے کوٹ کے پیتل کے بٹنوں کو جھل جھلا رہی تھیں۔ تاتاری ایک جگہ رُک کر اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے انھیں یوں گھمانے لگا گویا بقول دراصل صاحب" وہ سونے کے تمغے ہیں"۔
دراصل سے میری دوستی گہری ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ خواہ میں غمگین ہوں یا مسرور، اس کی صحبت میرے لیے ناگزیر ہوگئی۔ وہ خود تو بہت کم بولتا تھا لیکن مجھے اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ جو جی میں آئے بکتا رہوں۔ اس کے برعکس نانا ایسے موقعوں پر فوراً ڈانٹ دیا کرتا تھا:" ابے آدمی ہریا بن چکی! جب دیکھو ٹرٹر کیے جاتا ہے!"
نانی بھی اپنے خیالات میں ایسی مگن رہتی تھی کہ نہ کسی دوسرے کی سنتی تھی اور نہ اس کی باتوں کو ذہن نشین کرتی تھی۔ لیکن دراصل بہت غور سے میری بکواس سنتا تھا اور اکثر مسکرا کر کہتا تھا:" بچّو، یہ تو غلط ہے، تم بے پر کی اُڑا رہے ہو"۔
یہ مختصر جملے بھی وہ اسی وقت استعمال کرتا تھا جب وہ از بس ضروری ہوتے تھے۔ وہ میرے دل و دماغ کے اندر بیٹھ کر سب کچھ دیکھ لیتا تھا اور میرے لب پہ کوئی بیکار کلمہ آنے سے پہلے ہی وہ سمجھ جاتا تھا ــــ اور صرف یہ دو لفظ کہہ کر ان کی جڑ کاٹ دیتا تھا

—— " سفید جھوٹ ! "

کبھی میں اس کی ساحرانہ نکتہ سنجی کا امتحان لینے کے لیے جھوٹ موٹ کوئی قصّہ گھڑ کر یوں سُناتا تھا گویا وہ سچ مُچ پیش آیا ہے۔ لیکن چند جُملے سُنتے ہی وہ سر ہلانے لگتا تھا:

" میاں، یہ تو صریحًا غلط ہے "

" آپ کو کیسے معلوم ؟ "

" میں اندازہ لگا سکتا ہوں "

جب نانی کنوئیں سے پانی لینے جاتی تو مجھے بھی ساتھ لے لیتی تھی۔ وہاں ایک مرتبہ ہم نے دیکھا کہ پانچ شہریے ایک کسان کو پٹک کر یوں پیٹ رہے ہیں گویا کُتّے ایک دوسرے کو بھنبوڑ رہے ہوں۔ یہ دیکھتے ہی نانی نے دونوں گگرے تو پھینک دیے اور جؤے کی لاٹھی لے کر کسان کی مدد کو دوڑی اور پکار کر مجھ سے کہا " تو بھاگ جا ! "

لیکن میں ڈر گیا اور نانی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ شہریوں پر میں پتھر برسانے لگا اور نانی نے ان کی کھوپڑیوں کی خاطر اس لاٹھی سے کی۔ اتنے میں اور لوگ بھی آ گئے اور یہ بدمعاش فرار ہو گئے۔ نانی مجروح کسان کے زخموں کو دھونے لگی۔ جب اس کی کٹی ہوئی اُنگلیوں سے خون کی ایسی دھار نکلی کہ نانی کا چہرا تر بتر ہو گیا اور وہ کبھی کھانسنے اور کبھی کراہنے لگا، تو مجھے شدید کراہت ہوئی۔ نانی بھی چیخ پڑی اور تھر تھر کانپنے لگی۔

گھر لوٹتے ہی میں اپنے دوست کے پاس بھاگا گیا اور اسے یہ واقعہ سُنانے لگا۔ وہ کام بند کر کے میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور

اپنی عینک کے اندر سے مجھے گھورنے لگا۔ یک بیک بات کاٹ کر اس نے ایک خاص مؤثر انداز سے کہا: "بہت خوب — بہت خوب!"

مجھ پر اس واقعہ کا ایسا اثر تھا کہ ان الفاظ کی پروا نہ کر کے اپنی داستان سناتا گیا۔ لیکن میری گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا: "بس — میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میرے بچے، جو کہنے کی بات تھی سو تم کہہ چکے۔ سمجھے؟"

مجھے بہت برا لگا اور میں چپ ہو گیا۔ لیکن بعد میں جب اس واقعہ پر غور کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اس نے عین مناسب موقع پر میری زبان بند کر دی تھی۔ میں وہ سب کچھ کہہ چکا تھا جو ضروری تھا۔

اس نے مجھے یہ رائے دی: "اس واقعہ کا زیادہ ذکر نہ کرو۔ گزشتہ واقعات کی یاد میں کیا رکھا ہے۔"

کبھی جوش میں وہ ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا تھا جنھیں میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں نے اسے اپنے ایک دشمن کا حال سنایا۔ یہ موٹا تازہ لڑکا لڑائی میں نہ مجھ سے ہارتا تھا اور نہ مجھے ہرا سکتا تھا۔ "دراصل" نے میرے شکوے کو غور سے سنا اور پھر یہ نصیحت کی: "اس گاؤزوری سے کیا حاصل! طاقت کا راز پھرتی میں ہے۔ جو سب سے زیادہ تیز ہے وہ سب سے قوی ہے۔"

اگلے اتوار کو میں نے ایسی پھرتی دکھائی کہ میرا رقیب فوراً شکست کھا گیا۔ اب اپنے عجیب دوست کی نصیحتوں کی میں بہت قدر کرنے لگا۔

"تمھیں ہر معاملے کو پکڑ میں لانا چاہیے۔ چیزوں پر عبور حاصل کرنا بہت ہی دقت طلب ہے۔"

اُس وقت میری سمجھ میں یہ معمّہ نہ آیا۔ لیکن بلا ارادہ یہ قول مجھے یاد رہ گیا کیوں کہ اپنی سادگی کے باوجود وہ پُر اسرار معلوم ہوتا تھا۔ چیزوں کو پکڑ میں لانا کیا مشکل تھا! پتھر روٹی یا ہتھوڑی کو گرفت میں لینے کے لیے کیا کسی خصوصیت کی ضرورت تھی۔

لیکن گھر میں دراصل صاحب کی مخالفت بڑھنے لگی۔ سیاہن کی بلّی اور سب کے پاس تو جاتی تھی لیکن میرے دوست سے جی چُراتی تھی اور اس کی پُکار پر کوئی دھیان نہ دیتی تھی۔ اس پر میں نے بلّی کو خوب ٹھونکا اور عاجزی کی کہ اس سے نہ ڈرا کرے۔

دراصل' نے بتلایا کہ بلّی میرے پاس اس لیے نہیں آتی کہ میرے کپڑوں سے بھانت بھانت کی بو آتی ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سب لوگ، نانی تک، اس کی اور ہی تعبیر کرتے تھے اور اس پر نہایت شرم ناک بہتان لگاتے تھے۔

نانی مجھے ڈانٹا کرتی تھی: "تو اس کی دُم کے پیچھے کیوں لگا رہتا ہے! دیکھ لیجیو، وہ تیرا ستیاناس کرکے رہے گا۔" نانا کو یقین کامل تھا کہ یہ کرایہ دار کوئی مُٹھائی گیرا ہے اور جب کبھی میں اُس سے ملتا تو وہ بُری طرح میری گوشمالی کرتا تھا۔

اپنے دوست سے میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے اس سے ملنے کی ممانعت ہے۔ لیکن گھر والے اس کی بابت جو کچھ کہتے تھے وہ سب صفائی سے سُنا دیا۔

"نانی بھی تم سے ڈرتی ہی، سمجھتی ہی کہ تم جادوگر ہو۔ نانا کہتے ہیں کہ تم خدا کے بیری ہو اور تمھیں یہاں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔"

اُس نے یوں ہاتھ ہلایا گویا مکھی اُڑا رہا ہو۔ اس کے سفید چہرے پر مُسکراہٹ آئی لیکن اس کی آنکھوں کے آگے دُھندلکا سا چھا گیا اور یہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔

"کتنے افسوس کی بات ہی۔ کیوں؟"

"اس میں کیا شک ہی۔"

"میرے بیٹے، بڑے افسوس کا مقام ہی"

بالآخر اسے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا گیا۔ ایک صبح ناشتے کے بعد میں اس کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ زمین پر بیٹھا صندوقوں میں اپنا سامان بھر رہا ہی۔ ساتھ ساتھ وہ "گلاب جل" کا گیت بھی گاتا جاتا تھا۔

"میرے یار، یہ ہماری آخری ملاقات ہی۔ میں جا رہا ہوں۔"

"کیوں اور کہاں؟"

مجھے سر سے پیر تک دیکھ کر وہ بولا: "کیا یہ ممکن ہی کہ تمھیں خبر نہیں! یہ کمرا تمھاری ماں کے لیے خالی کیا جا رہا ہی۔"

"آپ سے کس نے کہا؟"

"تمھارے نانا نے"

"وہ جھوٹ بولتا ہی"

کرائے دار نے مجھے اپنے پاس زمین پر بٹھا لیا اور آہستہ سے کہا:

بگڑنے کی بات نہیں۔ میں سمجھا تھا کہ تمھیں یہ سارا قصّہ معلوم ہو لیکن
مجھ سے چھپا رہے ہو اور صفائی نہیں برت رہے ہو۔"
اب میں سمجھا کہ وہ کیوں اتنا تنک مزاج اور اُداس ہو گیا تھا۔
اس نے کان میں کہا: "سنو! تمھیں وہ دن یاد ہے جب میں نے تم سے
یہاں نہ آنے کو کہا تھا؟"
"میں نے ہامی بھری۔"
"تمھیں میری بات ناگوار بھی معلوم ہوئی تھی؟"
"یہ بھی سچ ہے۔"
"میرے بیٹے، میں تمھارے دل کو دُکھ نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر میں
جانتا تھا کہ اگر تم یہاں زیادہ آنے جانے لگے تو گھر والے تمھیں تنگ
کریں گے۔ میرا خدشہ صحیح تھا۔ اب تم سمجھے؟"
وہ مجھ سے میرے ہم جولیوں کی طرح بات کرنے لگا اور اس سے
مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں عرصے سے یہ بات سمجھ گیا تھا
"میں تو اسی زمانے میں آپ کی مصلحت کو تاڑ گیا تھا۔"
"جو بھی ہو۔ میرے دوست، ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے۔"
میرا دل درد سے پھٹا پڑتا تھا۔
"لیکن آپ سے وہ سب کیوں خار کھاتے ہیں؟"
اس نے مجھے گلے لگا لیا: "میں ان سب سے مختلف ہوں —
سمجھے؟ سارا ماجرا یہ ہے۔"
میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا کیوں کہ میرا گلا رندھ گیا تھا اور
رقّت کے مارے کچھ کہتے نہیں بنتی تھی۔

وہ بار بار کہہ رہا تھا: "ناراض نہ ہونا ـــــ اور نہ رونا۔" لیکن اس کی عینک کے اندر سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

اس کے بعد وہ حسب معمول خاموش ہوگیا، بیچ بیچ میں بہت ہوا تو ایک آدھ بات کہہ دی۔ شام کو وہ چلا گیا اور رخصت سے پہلے سب کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا اور مجھے محبّت سے گلے لگایا میں دروازے تک اس کے ساتھ گیا اور دیر تک اس گاڑی کو دیکھتا رہا جو جمی ہوئی کیچڑ کے تودوں پر ڈگمگاتی ہوئی اسے ہچکولے دے رہی تھی۔

نانی فوراً اس گندے کمرے کی صفائی میں لگ گئی اور میں جان بوجھ کر اِدھر اُدھر کودنے لگا تاکہ وہ کام نہ کرسکے۔ ایک بار مجھ سے ٹکرا کر وہ چلاّ اُٹھی: "نکل یہاں سے کل مُنہے!"

"تم نے اُسے نکالا کیا سمجھ کر!"

"جو باتیں تیری سمجھ میں نہ آئیں ان میں دخل نہ دے۔"

"تم سب کا دماغ خراب ہوگیا ہے ـــــ" میں نے چیخ کر کہا۔

اُس نے بھیگا ہوا چیتھڑا مجھے دے مارا۔

"ارے بُھتنے، تو پاگل تو نہیں ہوگیا۔"

میں نے اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا: "میں تمھیں نہیں، دوسروں کو کہہ رہا ہوں"۔ لیکن بات نہ بنی۔

کھانے وقت نانا بولنے لگا: "خدا کا شکر کہ وہ دفان ہوا! اگر وہ خودکشی بھی کرلیتا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوتا۔ اچھا ہوا جو وہ چلا گیا۔"

اس کے انتقام میں میں نے ایک دو برتن توڑ دیے اور مجبوراً ـــــ

پھر مرتا کیا نہ کرتا، کی حالت پر آگیا۔

اس طرح ان بے شمار دوستوں میں سب سے پہلے سے میرا تعلق ختم ہوگیا —— وہ لوگ جو میرے ملک کے بہترین باشندے ہیں۔

---

# باب ۹

میرا بچپن گویا شہد کا چھتّا تھا۔ جس طرح مدھ مکھیاں وہاں شہد لے لے کر آتی ہیں، سیدھے سادے اور گم نام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لیے میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کر گئے۔ یہ شہد عموماً کڑوا اور کسیلا ہوتا تھا۔ تاہم وہ بھی علم تھا — اور ہر قسم کا علم شہد ہے۔

دراصل صاحب کی روانگی کے بعد بوڑھے پیٹر سے میری دوستی ہوگئی۔ دیکھنے میں وہ نانا سے ملتا جلتا تھا — وہی ستھراپن اور چہرے کی جھرّیاں۔ لیکن قد و جسم میں وہ نانا سے چھوٹا تھا گمان ہوتا تھا کہ یہ کوئی لڑکا ہے جس نے بوڑھوں کا بھیس لے لیا ہے اس کے چہرے پر ویسی ہی ہلکی ہلکی شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا جیسا پکے ہوئے اچھے سے چمڑے کے ٹکڑے پر۔ اس کی شریر اور پُرحیات آنکھیں ان جھرّیوں کے بیچ میں یوں ناچتی رہتی تھیں گویا پرندوں کا ایک جوڑا پنجرے کے اندر پھدک رہا ہو۔ اس کے سیاہ و سفید بال گھنگھرالے تھے داڑھی میں بھی چھلّے پڑے ہوئے تھے اور وہ پائپ پیتا تھا تو اس کے دھوئیں کی بھی کمانی بن جاتی تھی۔ اس کی بات چیت بڑے مزے کی ہوتی تھی اور اس میں کہاوتوں

اور مثلوں کی بھرمار رہتی تھی۔ اس کی آواز گونج دار تھی۔ اس میں کبھی کبھی ہمدردی کا جذبہ آجاتا تھا۔ مگر عموماً مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کا مذاق اُڑا رہا ہے۔

"جب میں کاؤنٹس کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا کہ تم ہمارے محل میں لوہار کا کام کرو۔ مگر گھڑی بھر بعد اس نے مجھے مالی کا ہاتھ بٹانے کا حکم دیا۔ میں نے عرض کیا کہ سرکار کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن مجھے پھاوڑا چلانے کی مشق نہیں۔ تب وہ کہنے لگی کہ اچھا تم مچھلی پکڑ کر لایا کرو۔ مچھلی پکڑو یا مکھی مارو بات ایک ہی ہے۔ سو میں نے بی صاحبہ کو سلام کیا اور شہر میں آکر ٹھیلا بانی کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے آج تک اپنا پیشہ نہیں بدلا۔ اس سے میرے پلّے تو کچھ پڑا نہیں، ایک گھوڑی کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں اور اس گھوڑی کی شکل اس کاؤنٹس سے ملتی ہوئی ہے۔"

یہ سفید گھوڑی بوڑھی ہوگئی تھی۔ ایک روز کسی رنگ ساز نے نشے میں اسے رنگنا شروع کیا اور اپنا کام ادھورا چھوڑ گیا۔ اس کی ٹانگیں اُکھڑی اُکھڑی سی تھیں اور فی الجملہ اس پر کاٹھ کی گھوڑی کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا سوکھا سوکھا سر بے نور آنکھوں کے ساتھ اُبھری ہوئی رگوں اور پھٹی پُرانی چمڑی کی مدد سے دھڑ سے چپکا ہوا تھا۔ پیٹر اس کی بڑی خاطر کرتا تھا اور اسے "تانکو" کہہ کر پکارتا تھا۔

نانا نے ایک مرتبہ سوال کیا: "تم اسے عیسائی نام سے کیوں پُکارتے ہو؟"

"بڑے میاں' میں نے تو پیار کے مارے اسے یہ نام دیا ہے۔
اور 'تنکا' بھی بھلا کوئی عیسائی نام ہے؟"

پیٹر خاصا پڑھا لکھا تھا۔ اس میں اور نانا میں اکثر اس مسئلے
پر بحث ہوا کرتی تھی کہ کون کون سے ولی سب سے مقدس ہیں
وہ دونوں پرانے زمانے کے گنہگاروں پر فتوے بھی دیا کرتے تھے۔
کبھی وہ محاوروں کے استعمال پر محبّت کرتے تھے۔ نانا کہتا تھا کہ "لنبا
سانس" اور "ملائی" صحیح ہے۔ لیکن پیٹر "لمبی سانس" اور "بالائی" کو ترجیح دیتا تھا
نانا غصّے سے بپھر کر کہتا: "تمھارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔" منہ
چڑھا کر: "آیا ہے بڑا بالائی والا!"

لیکن پیٹر دھوئیں کے بادل اڑاتے ہوئے یہ پھبتی کسنے سے نہ چوکتا تھا۔
"اور آپ کی ع غ میں کیا رکھا ہے؟ کیا خدا اس کی کوئی پروا کرتا ہے؟
خدا کا حکم تو یہ ہے کہ جیسے جی چاہے دعا مانگو۔"

نانا نے غصّے کے مارے آنکھیں نکال کر کہا: "الکسی چل ہٹ
یہاں سے!"

پیٹر کو صفائی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آنگن میں اگر وہ کوئی کوڑا
کرکٹ دیکھتا تو اسے چن کر الگ پھینک دیتا اور آپ ہی آپ
بھنبھناتا جاتا: "یہ بیکار چیزیں راستے میں کیوں پڑی ہیں۔"

یوں وہ ملنسار اور یار باش تھا۔ لیکن لبا اوقات اس کی
آنکھیں کسی مردے کی آنکھوں کی طرح خونیں اور بے نور ہوجاتی تھیں۔
ایک کونے میں وہ اپنے بھتیجے کی طرح خاموش اور اداس بیٹھ جاتا
تھا۔ درشت لہجے میں وہ کہتا تھا: "مجھے میری حالت پہ چھوڑ دو۔"

ہماری سڑک کے ایک مکان میں ایک عجیب الخلقت انسان رہتا تھا۔ ہر اتوار کو وہ کھڑکی پر بیٹھ کر کتوں، بلیوں، مرغیوں غرض کہ ہر اُس چیز پر جس سے اُسے چڑ تھی، گولیاں چلایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے دراصل صاحب کی پسلیوں کو نشانہ بنایا۔ خیر ہوئی کہ چھرے اُس کے موٹے کوٹ کو چھید نہ سکے اور اس کی جیب میں گر پڑے۔ میں کبھی اُس متحیر انداز کو نہ بھولوں گا جس سے وہ ان چھرّوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ نانا نے اسے بہت اُکسایا کہ رپٹ کر دے، لیکن اس نے چھرّوں کو ایک طرف پھینک کر جواب دیا؛ "اجی اتنی سی بات پر یہ طومار کون باندھے؟"

دوسری مرتبہ اس شکاری نے نانا کی ٹانگ میں دو چار چھرے دے مارے۔ یہ حضرت سخت برہم ہوئے۔ اس کے خلاف ایک رپٹ تیار کی اور دوسرے مجرموں اور گواہوں کے دستخط لینے لگے۔ لیکن اس دوران میں وہ دیوانہ غائب ہوگیا۔

بندوق کی آواز سنتے ہی پیٹر کنٹوپ پہن کر فوراً باہر لپکتا تھا کوٹ کے پیچھے سے اپنا ہاتھ مرغے کی دُم کی طرح نکال کر وہ اکڑتا ہوا شکاری کے قریب جاتا تھا اور پھر لوٹ آتا تھا۔ وہ بار بار یہی حرکت کرتا تھا اور ہمارے گھر کے سب لوگ پھاٹک کے سامنے جمع ہوجاتے تھے۔ اُدھر اُس بندوق باز کا لال گلال چہرا کھڑکی کی آڑ سے نظر آتا تھا اور اس کی بیوی کی کھوپڑی اس کے کاندھے پہ دھری ہوتی تھی۔ سڑک پر پڑوسیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی کبھی تو پیٹر کی یہ مہم ناکام رہتی تھی۔ کیوں کہ وہ بگڑے دل اُس شکار کو قابل اعتنا ہی نہ سمجھتا تھا۔ لیکن اکثر

اس کی دونالی بندوق دندنانے لگتی تھی۔
چہل قدمی کرتے ہوئے پیٹر ہمارے پاس لوٹ کر خوشی کا ایک نعرہ لگاتا تھا: "اس کے سارے چھرے کھیت میں گئے۔"
ایک بار کوئی چھرا اس کی گردن میں آ لگا۔ نانی سوئی سے اُسے نکالتی ہوئی پیٹر کو پھٹکار بتاتی جاتی تھی: "تم اس جانور کو شہ کیوں دیتے ہو؟ آنکھ وانکھ پھوٹ گئی تو عمر بھر رو یا کرو گے۔"
پیٹر نے حقارت سے منہ بنایا: "بڑی بی، یہ ممکن ہی نہیں! وہ بھی کوئی نشانہ باز ہے؟"
"تاہم تم اُسے شہ کیوں دیتے ہو؟"
"خوب رہی! میں بھلا اُسے شہ کیوں دینے لگا، البتہ اُسے چڑانے میں مزا ملتا ہے۔"
چھرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا: "اُسے نشانہ لگانا تو آتا نہیں۔ ہاں میری مالکہ کاؤنٹس کے محل میں ایک سپاہی تھا — جس کا نام تھا 'مارمون ایلچ'۔ وہ ہمیشہ کاؤنٹس کی خدمت میں مستعد رہتا تھا کیوں کہ اس کی نگاہ میں شوہر اور دربان میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن وہ اول نمبر کا نشانہ باز تھا۔ ہاں وہ صرف گولی استعمال کرتا تھا۔ ایک بار اس نے کسی کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں بوتل باندھ کر چالیس ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا کیا اور ایک بار میں اُسے چور چور کر دیا۔ مگر خدا جانے اُسی آن اس گھاٹر کو مچھر نے کاٹا یا کیا ہوا کہ وہ اُچھل پڑا اور گولی اس کے گھٹنے کی کٹوری میں گھس گئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا اور اس نے منٹ بھر میں ٹانگ

کاٹ کر زمین میں دفنا دی ــــــ"

"مگر اس بیچارے گھامڑ کا کیا حشر ہوا؟"

"اجی اس کا کیا بگڑنا تھا! اور پھر گھامڑوں کو ہاتھ پاؤں کی ضرورت بھی کیا ہو؛ انھیں اپنی حماقتوں سے بیٹھے بٹھائے پیٹ بھر روٹی مل ہی جاتی ہو۔ ساری دُنیا گھامڑوں کو پسند کرتی ہو کیوں کہ وہ بے خطر ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہی: "سب غریب احمق ہو جائیں تو نقصان نہ پہنچا سکیں"

ان باتوں سے نانی کو کوئی تعجب نہ ہوتا تھا کیوں کہ وہ بارہا ایسے واقعات سُن چکی تھی۔ لیکن میں بہت حیز بز ہوتا اور پیٹر سے پوچھتا تھا: "کیا یہ سپاہی انسانوں کی جان بھی لے سکتا تھا؟"

"کیوں نہیں؟ بہت آسانی سے! . . . اسے ڈوئل لڑنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ ایک مہمان سے کسی بات پر اس کی تکرار ہو گئی۔ دونوں پستول لیے ہوئے باغ میں گئے۔ مہمان نے وہ گولی ماری کہ اس سپاہی کے جگر کے آر پار ہو گئی۔ وہ قبرستان بھیج دیا گیا اور مہمان قید خانہ۔ ذرا دیر میں سب اس واقعہ کو بھول گئے۔ وہ لوگ اس طریقے سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کر لیا کرتے تھے۔ اب کسان بھول کر اس کا نام بھی نہیں لیتے۔ کسی نے اس کا سوگ نہیں منایا . . . . صرف ایک بار اس کی جائداد کی خاطر لوگوں نے اس کا غم کیا۔"

نانی نے کہا: "یہ کہو کہ کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی۔"

پیٹر نے بھی سر ہلایا: "سچ ہو . . . . . جائداد کی بساط ہی کیا؟"

وہ ہمیشہ مجھ سے مہربانی سے پیش آتا تھا۔ مجھ سے اس طرح باتیں کرتا تھا گویا میں اس کا ہم عمر ہوں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اس میں کوئی ایسی بات تھی جس سے مجھے نفرت تھی۔ مجھے وہ خوب "جام" کھلاتا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ جھاڑ پونچھ کر سارا جام میری روٹی پر لگا دیتا تھا اور میرے لیے بازار سے نان خطائی لاتا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے وہ مجھ سے یہ سوال کیا کرتا: "کیوں میاں، بڑے ہو کر کیا کرنے کا خیال ہے۔ فوج یا نوکری؟"

"میں تو فوج میں جاؤں گا۔"

"شاباش! آج کل سپاہی کو بڑا آرام ملتا ہے۔ پادری بھی مزے میں رہتا ہے.... اسے دعا مانگنے اور تسبیح پڑھنے کے سوا کام ہی کیا ہے اور اس میں دیر بھی کیا لگتی ہے۔ سچ پوچھو تو سپاہی سے زیادہ پادری مزے میں ہے.... ان دونوں سے آرام دہ پیشہ ماہی گیر کا ہے۔ اس کے لیے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں، صرف عادت ڈالنے کا سوال ہے۔"

مچھلی کس طرح چارہ نگلتی ہے اور پھر کس طرح تڑپتی ہے، پیٹر ان سب باتوں کو تفصیل سے سنانے لگا۔

وہ تسلی دینے کے لیے کہا کرتا تھا: "جب نانا تمھاری ٹھکائی کرتے ہیں تو تم ناراض ہو جاتے ہو۔ لیکن تمھاری خفگی بے محل ہے۔ یہ تمھاری تعلیم کا ایک جزو ہے اور پھر تمھیں جو مار پڑتی ہے وہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ کاش تم دیکھ سکتے کہ میری مالکہ کاؤنٹس کا ہاتھ کیا چلتا تھا

واللہ وہ اس فن میں بڑی ماہر تھی!۔ اس خدمت کے لیے اس نے ایک خاص ملازم رکھ چھوڑا تھا جس کا نام کرستوفر تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسا ہوشیار تھا کہ پاس پڑوس کے زمیندار اپنے نوکروں کی سرزنش کے لیے اُسے بُلوا بھیجتے تھے!"

بڑی سادگی سے پیٹر اس نظّارے کی تصویر کھینچنے لگتا تھا جب کاؤنٹس ململ کی کُرتی میں ملبوس سر پہ ایک آسمانی رومال باندھے ہوئے برآمدے میں آرام کرسی پہ بیٹھ جاتی تھی اور کرستوفر کسانوں اور ان کی عورتوں پہ کوڑے برسانے لگتا تھا۔

"کرستوفر کی شکل جپسیوں سے مِلتی جُلتی تھی۔ اس کی مونچھ کی نوکیں کان کی لَو کو چھوتی تھیں اور اس کا مہیب چہرا اُس جگہ نیلا پڑگیا تھا جہاں ڈاڑھی مُنڈی ہوئی تھی۔ یا تو وہ واقعی احمق تھا یا بنتا تھا کیوں کہ کسی فضول سوال کا جواب وہ ہرگز نہ دیتا تھا ایک پیالی میں پانی بھر کر وہ مکھیوں اور تِل چٹوں کو اس میں گراتا تھا اور پھر یہ پانی آگ پر اُبالا کرتا تھا۔"

مجھے نانا نانی نے ایسے بہتیرے قصّے سُنائے تھے۔ مختلف ہوتے ہوئے بھی ان سب میں ایک عجیب مشابہت تھی۔ یہ سُنتے سُنتے میں تھک گیا تھا کہ انسانوں پر مظالم ہوتے ہیں، ان کی ہتک کی جاتی ہے اور وہ مصیبتیں سہتے رہتے ہیں۔ اب میں اس قسم کا کوئی واقعہ سُننے کا متحمل نہ تھا۔ چنانچہ بڈھے پیٹر سے فرمایش کی کہ مجھے کوئی اور کہانی سناؤ۔

ایک پل کے لیے اس کی جُھرّیاں باچھوں کے پاس جمع ہوگئیں

اور پھر آنکھوں کی طرف لوٹ گئیں۔ اس نے احسان جتانے کے انداز میں کہا:

"اچھا بے چپوڑرے!...... ہمارے گھر ایک باورچی تھا"

"کس کے گھر؟"

"کاؤنٹس، ٹشپن کے گھر اور کہاں"

"لیکن تم اُسے ٹشپن کیوں کہتے ہو؟ کیا وہ مرد تھی؟"

پیٹر ہنستے ہنستے لوٹ گیا، "مرد تو نہ تھی۔ پھر بھی اس کی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ جرمن نسل کی تھی... یہ لوگ حبشیوں کی اولاد ہیں۔ اچھا تو میں تمھیں باورچی کا قصّہ سُنا رہا تھا — میاں بڑے مزے کی کہانی ہے"

مزے کی کہانی یہ تھی کہ باورچی نے مچھلی جلا دی اور اسے حکم دیا گیا کہ ساری ہنڈیا خود کھائے۔ جلی مچھلی کھانے سے وہ بیمار ہوگیا۔

میں نے بگڑ کر کہا: "یہ بھی کوئی کہانی میں کہانی ہے"

"اچھا تو تمھیں کس قصّے میں لطف آتا ہے۔ زرا مجھے بھی تو معلوم ہو"

"میں نہیں جانتا —"

"تو پھر بک بک نہ کرو!" یہ کہہ کر اس نے کوئی ایسا ہی نامعقول قصّہ چھیڑ دیا۔

اتواروں اور تیوہاروں کو میرے دونوں ماموں زاد بھائی — کاہل اور اُداس ساشا نمبر ایک اور تیز و طرارہ ساشا

نمبر دو —— ہمارے گھر آتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم سب چھت پر چڑھ گئے تو کیا دیکھا کہ 'ہتلنگا منزل' کے آنگن میں ایک گنجا لکڑی کے گھٹنوں پر بیٹھا کتّے کے پلّوں سے کھیل رہا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ایک پلّا چُرانا چاہیے۔ دونوں بھائیوں نے فوراً ایک اسکیم تیار کرڈالی۔ وہ یہ کہ یہ دونوں آنگن کے پھاٹک کے پاس چھپ رہیں اور میں کوئی ایسی ترکیب کروں کہ گنجا ہڑ بڑا جائے۔ اس کے ہٹتے ہی دونوں ساشا کتّے کا بچّہ لے بھاگیں۔

"لیکن میں اسے کس ترکیب سے ہڑ بڑاؤں؟"

ایک نے یہ ترکیب سمجھائی: "اس کی کھوپڑی پر تھوک دو۔"
لیکن کیا کسی آدمی کے سر پر تھوکنا گناہِ کبیرہ نہ تھا؟ مگر میرے بھائیوں نے اپنی ایسی ایسی شرارتوں کا حال سُنایا کہ میں مان گیا اور اپنا فرض بڑی حُسن و خوبی سے ادا کردیا۔ مگر کسی کی قسمت ہی پھوٹی ہو تو کیا علاج۔

وہ ہنگامہ برپا ہوُا کہ خدا کی پناہ۔ 'ہتلنگا منزل' سے نرماداؤں کا ایک لشکر نمودار ہوُا جس کی سرداری ایک جوان افسر کر رہا تھا۔ میرے دونوں بھائیوں کو اس سانحہ کی اطلاع بھی نہ ہوئی کیونکہ وہ سیٹی بجاتے ہوئے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ اس لیے نانا جان نے سارا بخار مجھ اکیلی جان پر نکالا اور ان کی اس مستعدی کی داد پوری ہتلنگا منزل نے دی۔

میں باورچی خانے میں گٹا گٹا یا پڑا ہوُا تھا کہ پیٹر صاف ستھرے کپڑے پہنے، ہنستے ہنستے وہاں داخل ہوُا۔

"بھئی قربان جاؤں تیری چھیڑ خانی کے! اس بڈھے بکرے سے یہی برتاؤ کرنا تھا — بہت خوب سر پر تھوک مارا! آیندہ اس کی گنجی کھوپڑی پر پتھر مارنا۔"

میرے آگے اس غریب بوڑھے کی تصویر آگئی۔ اور یاد آیا کہ تھوک پونچھتے ہوئے وہ کُتّے کے پلّوں کی طرح بلبلانے لگا تھا۔ میں دل میں بہت نادم ہؤا اور اپنے بھائیوں پر مجھے سخت غصّہ آیا لیکن جب میں نے پیٹر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر حقارت اور ہیبت کے وہی آثار تھے جو مجھے پیٹتے وقت نانا کے منہ پر ہویدا ہوجاتے تھے تو میں سب کچھ بھول گیا۔ "نکل یہاں سے!" میں چیخ پڑا اور اس پر گھونسے لات رسید کرنے لگا۔

وہ کھِل کھِلاکر ہنسا اور مجھے آنکھ مار کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد میرا جی اس سے اُچٹ گیا اور میں اس سے کترانے لگا۔ اس کی ہر حرکت کو میں شک و شُبہ سے دیکھا کرتا تھا اس خیال سے کہ شاید اس کی اصلیت میری سمجھ میں آجائے گی۔

اس واقعہ کے بعد ہی ایک نیا حادثہ پیش آیا۔ کچھ عرصے سے مجھے 'اسنیکوف منزل' سے دلچسپی ہوگئی تھی کیوں کہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر کوئی خفیہ راز چھپا ہؤا ہے۔

'تبلنگا منزل' میں ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی۔ وہاں کئی حسین عورتیں رہتی تھیں۔ ان سے ملنے کے لیے طلبا اور افسر آیا کرتے تھے۔ نغمہ و سرود اور قہقہوں اور نعروں کا ایک لا متناہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس حویلی کی صورت میں بھی مسرت کا پہلو تھا جس کی شہادت

چمکتی ہوئی کھڑکیاں دے رہی تھیں۔

نانا کو یہ پڑوس ناپسند تھا۔ اس کے مکینوں کے بارے میں نانا کا فیصلہ یہ تھا کہ "یہ سب کافر اور مُرتد ہیں!"۔ وہاں کی عورتوں کے متعلق اس نے کوئی خاص فحش لفظ استعمال کیا جس کے معنے سمجھانے میں پیٹر نے کچھ کم بلاغت سے کام نہیں لیا۔

لیکن بے آواز اور بے حرکت 'اسٹیکوف منزل' نانا کے دل میں احترام کے جذبات پیدا کرتی تھی۔

یہ مکان ایک منزلہ ہوتے ہوئے بھی خاصا بلند تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک ہرا بھرا آنگن تھا جس کے بیچوں بیچ ایک کنوّاں تھا اور اس کے اوپر دو کھمبوں کے سہارے ایک چھت کھڑی ہوئی تھی۔ مکان سڑک سے کچھ یوں الگ تھلگ ہوگیا تھا گویا اس سے چشم پوشی کررہا ہو۔ اس کی دو کمانی دار کھڑکیاں زمین سے کچھ اونچائی پر تھیں اور ان کے خاک آلودہ شیشوں پر سورج کی کرنیں قوس قزح کا رنگ پیدا کردیتی تھیں۔ پھاٹک کے مقابل ایک گودام تھا اور اس کی قطع ایسی تھی کہ بجائے خود کوئی مکان معلوم ہوتا تھا اور اسی انداز پر اس کے سامنے تین نقلی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے چوکھٹے اور پٹ دیوار میں چُنے ہوئے تھے اور ان پر سفید قلعی کی ہوئی تھی۔ ان نقلی جھروکوں کی کج رُخی اور گودام کی پوری ہیئت اس مکان کے دُزدیدہ انداز کو اور بھی شبہ دے رہی تھیں۔ سارے مکان کی فضا سے ایک پوشیدہ تپاک یا خاموش غصّے کی بات نکلتی تھی۔ اس کے اصطبل خالی تھے اور چوڑے چوڑے دروازوں پر بھی

ہُو کا عالم رہتا تھا۔

کبھی کبھار ایک بوڑھا جس کی داڑھی مُنڈھی ہوئی اور سفید مونچھ کے بال کانٹوں کی طرح تنے ہوئے تھے آنگن میں ٹہلتا ہوا نظر آتا تھا۔ بعض اوقات ٹیڑھی ناک اور گل مُچھّوں والا ایک دوسرا بوڑھا اصطبل سے ایک بھوری گھوڑی کو آنگن میں لاتا تھا۔ گھوڑی کی گردن لمبی، سینہ تنگ اور ٹانگیں پتلی تھیں۔ باہر نکلتے ہی وہ کسی چاپلوس راہبہ کی طرح سُم مارنے لگتی تھی۔ یہ بُڈھا سیٹی بجاتے ہوئے اسے تھپتھپاتا اور اس دوران میں برابر ہانپتا رہتا تھا۔ گھڑی بھر بعد وہ گھوڑی پھر اس ویران اصطبل میں چُھپ جاتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہو نہ ہو یہ بُڈھا ساحر ہے ورنہ اس بھوت بھون میں کیوں رہتا۔

ہر روز دوپہر سے شام تک تین لڑکے آنگن میں کھیلا کرتے تھے وہ تینوں ایک سا لباس پہنے رہتے تھے اور تینوں کی آنکھیں بھوری اور چہرے گول تھے۔ ان کی شباہت اس قدر ملتی جُلتی تھی کہ میں صرف قد کے فرق سے ان میں تمیز کرسکتا تھا۔

دیوار کے سوراخ سے میں انھیں دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکتے تھے گو میرا جی بہت چاہتا تھا کہ ان کی نظر مجھ پر پڑے۔ وہ جس طریقے سے ہنسی خوشی عجیب و غریب کھیل کھیلا کرتے تھے وہ مجھے بہت بھاتا تھا۔ ان کے لباس بھی مجھے پسند تھے۔ ایک دوسرے کا وہ بہت خیال رکھتے تھے خصوصاً اپنے چھوٹے بھائی کا یہ ننھا سا مسخرہ گویا بجلی کا ٹکڑا تھا۔ اگر وہ گر پڑتا تو دونوں بڑے بھائی

ہنس پڑتے تھے ـــــ کیوں کہ یہ ایک عام رسم ہے! - لیکن ان کی ہنسی معصوم ہوتی تھی اور وہ دوڑ کر اسے اُٹھا لیتے تھے۔ اگر اس کے ہاتھ پاؤں گندے ہوجاتے تو وہ رومال یا پتّوں سے اسے جھاڑ دیتے اور منجھلا بھائی محبت سے کہتا: "کیوں بے گندے!"

وہ کبھی آپس میں نہ لڑتے تھے اور نہ ایک دوسرے کو دھوکا دیتے تھے۔ تینوں مضبوط ہمّت ور اور ہوشیار تھے۔

ایک روز میں درخت پر چڑھ کر ان کی طرف سیٹی بجانے لگا وہ لوگ بھوچکے ہو گئے اور مجھے دیکھ دیکھ کر آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔ اس ڈر سے کہ وہ مجھ پر سنگ باری کا منصوبہ گانٹھ رہے ہیں میں نیچے کودا اور اپنی جیب ڈھیلوں سے بھر کر پھر پیڑ پر چڑھ گیا لیکن اب وہ مجھ سے دور آنگن کے دوسرے کونے میں کھیل رہے تھے اور بظاہر مجھے بالکل بھول گئے تھے۔ مجھے سخت افسوس ہُوا کیوں کہ ایک تو میں ان سے لڑنا نہ چاہتا تھا، دوسرے اسی وقت کسی نے انھیں اندر سے آواز دی: "لڑکو چلو اندر!"

وہ بڑی سعادت مندی سے بطخوں کی طرح قطار باندھے ہوئے اندر چلے گئے۔

اکثر میں دیوار کے اوپر درخت پر اس امید سے بیٹھنے لگا کہ وہ مجھے ساتھ کھیلنے کی دعوت دیں گے، لیکن انھیں اس کی توفیق نہ ہوئی۔ تاہم اپنے تصور میں ان کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی ان کے کھیلوں سے میں اتنا متاثر ہوجاتا کہ زور سے پکار اُٹھتا یا ہنس پڑتا تھا۔ یہ سُن کر وہ تینوں مجھے تکنے لگتے اور آپس میں مشورہ کرنے

مجھے یقین نہ آیا کہ میری طرح ان پر بھی بید پڑتے ہیں اور مجھے ان پر رحم آیا۔

چھوٹے نے پوچھا: "تم چلیا پکڑا کرتے ہو؟"

"ہاں مجھے پرندوں کے گیت بہت پسند ہیں۔"

"یہ بُری بات ہے۔ اُنھیں اُڑنے کیوں نہیں دیتے۔"

"یہ میری خوشی۔ تم نصیحت کرنے والے کون ہو؟"

"اچھا مجھے ایک چلیا پکڑ دو گے؟"

"اوہو... اچھا، کس قسم کی چڑیا؟"

"بہت خوبصورت سی ... ایک پنجلے کے اندر ل ـــ"

"ننا سا... کیوں، تمھیں یہی چاہیے نا؟"

چھوٹے نے کہا: "اسے بلّی کھا جائے گی، اول ابّا بھی خفا ہوں گے۔"

بڑے نے بھی سر ہلا کر کہا: "ابّا ہرگز اس کی اجازت نہ دیں گے۔"

"تمھاری امّاں بھی ہیں؟"

بڑے نے جواب دیا: "نہیں۔" مگر منجھلے نے ٹوک کر کہا: "ہیں تو لیکن وہ ہماری سگی ماں نہیں۔ ہماری ماں مرگئیں۔"

میں نے کہا: "وہ تو سوتیلی ماں ہوئیں۔"

تینوں کے چہرے پر اُداسی چھاگئی اور وہ سوچ میں پڑگئے۔ نانی کے قصّوں سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سوتیلی ماں کیا چیز ہے؟ اس لیے میں اُن کے تفکّر کی وجہ سمجھ گیا۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر وہ یوں بیٹھ گئے گویا پرندے قفس میں ایک ٹہنی پر ہوں۔ مجھے اُس جادوگرنی سوتیلی ماں کا قصہ یاد آیا جو شعبدے کے زور سے سگی ماں

بن گئی تھی۔

میں نے دلاسا دینے کے خیال سے کہا: "تمھاری سگی ماں ایک نہ ایک روز ضرور آئے گی۔ میں شرط لگاکر کہہ سکتا ہوں"

لیکن بڑے بھائی نے بے اعتباری سے شانہ ہلایا۔

"مُردہ بھی کبھی واپس آیا ہی؟ ایسا نہیں ہوا کرتا"

"کیا ایسا نہیں ہوتا! اجی اللہ کا نام لو! آبِ حیات چھڑکنے کی دیر ہی، کتنے مُردے جن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے، دوبارہ زندہ ہوگئے۔ صدہا مرتبہ ایسا ہوا کہ موت اللہ میاں نے نہیں بھیجی بلکہ جادو ٹونے کی وجہ سے موت کا گمان ہوگیا"

پھر میں بڑے جوش سے انھیں نانی کی کہانیاں سُنانے لگا لیکن بڑا ہنستے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑا نے لگا:

"یہ طلسم ہوش ربا ہم پہلے بھی سُن چکے ہیں"

باقی دونوں بھائی چپ چاپ میری داستان سُننے لگے۔ چھوٹے کی تھوتھنی باہر نکلی ہوئی تھی اور منجھلا اس کے ہاتھ اپنی گردن میں ڈالے گھٹنوں پر کُہنی ٹیکے ہوئے تھا۔

اندھیرا ہو چلا تھا اور سُرخ بادل ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اتنے میں وہ سفید موچھوں والا بڈھا پادریوں کی سی ڈھیلی ڈھالی قبا پہنے باہر نکلا۔ میری طرف اشارہ کرکے اس نے پوچھا: "یہ چھوکرا کون ہی؟"

بڑا لڑکا ادب سے کھڑا ہوگیا اور نانا کا گھر دکھا کر بولا: "یہ وہاں رہتا ہی"

"اسے یہاں کس نے بُلایا؟"

تینوں لڑکے گاڑی سے اُتر کر دُم دبائے ہوئے بھیڑوں کی طرح گھر میں گھس گئے۔

بڈھے نے میرے کاندھے کو گویا چمٹے سے پکڑ لیا اور مجھے پھاٹک کی طرف کھینچنے لگا۔ میں دہشت کے مارے یقیناً چیخ پڑتا، لیکن وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، ہم سڑک پر تھے۔ اور مجھے گھونسا دکھا کر ڈانٹنے لگا۔

"خبردار جو میرے قریب بھی پھٹکا۔"

اب تو میں غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا:

"ابے بڈھے کھوسٹ، میں تیرے قریب کیوں آنے لگا تھا!"

اس نے پھر مجھے پکڑ لیا اور یوں کڑک کر بولا گویا میرے سر پر ہتوڑی کا وار کر رہا ہو:

"تیرا نانا گھر پر ہے؟"

افسوس کہ یہ بزرگوار گھر میں تشریف فرما تھے۔ نانا اس بڈھے کو اپنی بے نور مگر چنچل آنکھوں سے گھورتے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی بولا: "اس کی ماں یہاں نہیں ہے اور میں بھی مصروف رہتا ہوں اس لیے اس لونڈے کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں کرنل صاحب، اس مرتبہ اسے معاف کر دیجیے۔"

کرنل پاگل کتّے کی طرح دیر تک بکتا جھکتا رہا۔ اس کی پیٹھ پھرتے ہی نانا نے مجھے پیٹر چچا کی گاڑی میں پٹک دیا۔ گھوڑے کی زین اُتارتے ہوئے اس نے پوچھا:

"ابے گُچّے تو نے اس مرتبہ کیا گُل کھلایا؟"

میں نے سارا قصّہ سنایا تو اس کے غصّے کی انتہا نہ رہی "آخر ان سانپ کے بچّوں پر تیرا دم فدا کیوں ہی؟ دیکھ، انھوں نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا بدلا تو اُن سے لیجیو! بھولے گا تو نہیں؟"

دیر تک پیٹر پھنکاریں مارتا رہا اور مار سے چور چور ہونے کے باوجود میں توجّہ سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ لیکن اس کے جھرّی دار چہرے کا اُتار چڑھاؤ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا اور مجھے اُن لڑکوں کا بھی خیال آیا جو میری رائے میں بلا وجہ پٹ رہے ہوں گے۔

"وہ تینوں بڑے نیک ہیں اور اُنھیں ہرگز نہ مارنا چاہیے۔ اور تم تو پرلے درجے کے جھوٹے ہو۔"

وہ یک بیک چیخ پڑا: "نکل میری گاڑی سے!"

میں یہ کہتے ہوئے نیچے کود پڑا: "لے بے اُلّو!"

وہ میرے پیچھے جھپٹا اور مجھے پکڑنے کی بیکار کوشش کرتے ہوئے گلا پھاڑ کر رینگنے لگا: "اس لونڈے کی باتیں سنو! کیا میں اُلّو ہوں؟ کیا میں جھوٹا ہوں؟"

یہ شور سن کر نانی باورچی خانے سے نکل آئی اور میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔

"اس لڑکے نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہی! میں اس کے نانا کا ہم عمر ہوں، مگر یہ مجھے گالیاں دیتا ہی . . . میری ماں کو میرے سہارے گھرانے کو!"

اتنا بڑا جھوٹ سن کر میں تو بھونچکّا رہ گیا اور اُسے آنکھیں

پھاڑ کر تکنے لگا۔ لیکن نانی نے ڈانٹ کر جواب دیا:

"پیٹر، تمھارے جھوٹے ہونے میں کیا شبہ ہے۔ یہ لڑکا تمھیں یا کسی اور کو ہرگز گالی نہیں دے سکتا!"

لیکن اگر نانا ہوتے تو فوراً پیٹر پر اعتبار کر لیتے!

اب ہم دونوں میں ایک خاموش مگر سخت تناتنی رہنے لگی۔ وہ گویا دھوکے میں مجھے لگام سے مار دیتا، میرے پرندوں کو پنجرے سے اُڑا دیتا اور کبھی بلّی اُنھیں کھا جاتی تھی۔ موقع بے موقع وہ نانا سے میری شکایت کرتا اور یہ حضرت تو اُدھار کھائے بیٹھے ہی رہتے تھے۔ اب میرے اُس خیال کی تصدیق ہو گئی — کہ پیٹر بوڑھے کے بھیس میں مجھ جیسا ایک لڑکا ہے! میں اُس کے جوتوں کا تلا اس طریقے سے کاٹ دیتا تھا کہ پیر ڈالتے ہی جوتا دو ٹکڑے ہو جاتا تھا ایک مرتبہ میں نے اس کی ٹوپی میں مرچ کی بُکنی رکھ دی اور وہ گھنٹا بھر چھینکتا رہا۔

سارا اتوار وہ میری مخبری میں گزارتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے مجھے پڑوسی لڑکوں سے ملتے دیکھ لیا اور اس گناہِ کبیرہ کی خبر نانا کو دے دی۔

تاہم ان لڑکوں سے میری دوستی گہری ہوتی گئی اور مجھے اس میں نیا مزا ملنے لگا۔ دیوار کا جو کونا پیڑ پودوں سے ڈھنکا ہوا تھا اس میں میں نے ایک سوراخ بنایا۔ تینوں بھائی باری باری سے یا دو دو کر کے وہاں آتے اور سوراخ سے مُنہ بھڑا کر ہم لوگ دیر تک دھیرے دھیرے باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک

پہرے پر مستعد رہتا تھا تاکہ کرنل کے آنے کی اطلاع دے دے۔
وہ کہا کرتے تھے کہ ان کی زندگی کتنی تلخ ہے۔ اور مجھے سن کر دلی افسوس ہوتا تھا۔ وہ پہرے پرندوں یا دوسرے طفلانہ معاملات کا ذکر کرتے تھے لیکن بھول کر بھی اپنی سوتیلی ماں یا باپ کا نام نہ لیتے تھے۔ اکثر وہ مجھ سے کوئی قصہ سنانے کی فرمائش کرتے اور میں ایمانداری سے نانی کی کوئی داستان سنانے لگتا تھا۔ اگر میں کچھ بھول جاتا تو دوڑ کر نانی سے پوچھ آتا تھا۔ اس سے نانی کو بڑی خوشی ہوتی تھی۔
میں اپنی نانی کا چرچا بہت کیا کرتا تھا۔ ایک بار بڑے بھائی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "تمھاری نانی کتنی اچھی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ کبھی ہماری بھی ایک نانی تھیں۔"
اس کا لہجہ غم میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ گزشتہ واقعات کا ذکر یوں کرتا تھا گویا اس کی عمر گیارہ نہیں بلکہ سو سال ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی کلائی پتلی اور انگلیاں نازک تھیں۔ اس کی آنکھوں میں مہر تھی اور وہ گرجا کے چراغوں کی طرح جگمگاتی تھیں۔ اس کے بھائی بھی بڑے اچھے تھے اور ان کی خاطر میں سب کچھ کر سکتا تھا لیکن مجھے محبت بڑے بھائی سے تھی۔
اکثر میں گپ شپ میں ایسا مگن ہوتا کہ پیٹر چچا کی آمد کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، حتیٰ کہ وہ سر پر آکر اپنی ڈراؤنی آواز میں "پ۔۔۔۔
۔ ۔ ۔ ۔ ھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ر ا" کا نعرہ لگاتا اور ہم سب سر پر پیر رکھ کر بھاگ جاتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ پیٹر کی اُداسی اور خاموش پسندی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ جب وہ کام سے لوٹتا تو میں ایک نظر میں بھانپ جاتا کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔ عموماً وہ پھاٹک کو آہستہ سے کھولتا تھا اور اُس کی چول دیر تک چرچرایا کرتی تھی۔ لیکن جب وہ غصّے میں ہوتا تو چول یوں چیخ پڑتی گویا درد سے کرّاہ رہی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے اس کے گونگے بھتیجے کی شادی ہوگئی تھی اور وہ دیہات میں رہنے لگا تھا۔ چنانچہ اب پیٹر تن تنہا اصطبل کی ایک تنگ کوٹھری میں رہا کرتا تھا۔ اس سے لگاتار چمڑے، پسینے، تارکول اور تمباکو کی بو آیا کرتی تھی اور یہ بدبو اس قدر ناگوار تھی کہ میں اس میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اب وہ سرہانے چراغ جلاکر سویا کرتا تھا اور نانا اس عادت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

"امان پیٹر، تم گھر میں آگ لگائے بغیر نہ مانو گے!"

"اجی نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں لیمپ پانی کے طشت میں رکھ کر سوتا ہوں۔"

اب وہ ہر آدمی سے جھجکتا تھا۔ نہ نانی کی پارٹی میں شامل ہوتا نہ اس کے لیے جام لاتا تھا۔ اس کے چہرے کی جھرّیاں گہری ہونے لگیں اور چلتے وقت وہ کسی بیمار کی طرح لڑکھڑانے لگا۔

ایک صبح میں نانا کے ساتھ آنگن کی برف صاف کررہا تھا کہ یک بیک پھاٹک کھُلا اور ایک پولیس مین نمودار ہوا۔ اس نے پیٹھ سے دھکیل کر پھاٹک بند کردیا اور موٹی سی اُنگلی کے

اشارے سے نانا کو طلب کیا۔ نانا کے پاس آتے ہی اپنی لمبی سی ناک سے نانا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے وہ کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس کی بات میں بالکل نہ سُن سکا، مگر نانا نے چونک کر جواب دیا:

"یہاں؟ کب؟ خدا میرے!"

اچانک مٹک مٹک کر وہ چلّانے لگا:

"خدا رحم کرے! کیا یہ ممکن ہی؟"

پولیس والے نے ڈانٹ کر کہا: "اتنا شور نہ مچاؤ۔"

نانا نے چاروں طرف دیکھ کر مجھ سے کہا: "پھاوڑا رکھ کر اندر چلے جاؤ۔"

ایک کونے میں دبکے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ دونوں پیڑ کی گپھا کی طرف گئے۔ جمعدار نے داہنا دستانہ بائیں ہتیلی پہ مار کر کہا: "اسے معلوم ہی کہ ہم اس کی تاک میں ہیں۔ گھوڑا باہر چھوڑ کر وہ کہیں چھپ گیا ہی۔"

میں نانی کو یہ ماجرا سُنانے باورچی خانے میں لپکا۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی اور اس کا سر ایک خاص گت سے متحرک رہا تھا سب کچھ سن کر اس نے اطمینان سے کہا:

"میرا قیاس ہی کہ اس نے چوری کی ہی۔ چل بھاگ یہاں سے۔ ان باتوں سے تجھے کیا؟"

آنگن میں لوٹ کر میں نے دیکھا کہ نانا جان پھاٹک کے پاس ٹوپی اُتارے کھڑے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر صلیب

کے نشان بنا رہے تھے۔ غصّے کے مارے ان کا بُرا حال تھا
اور ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ پہلے تو اس نے گرج کر کہا:
"میں نے تجھ سے اندر جانے کو کہا تھا یا نہیں؟" مگر پھر میرے
ساتھ باورچی خانے میں جاکر اس نے آواز دی: "بڑی بی، یہاں
تو آنا!"

بغل کے کمرے میں جاکر وہ دیر تک کانا پھوسی کرتے رہے۔
جب نانی باہر آئی تو اس کے چہرے کی رنگت سے میں سمجھ گیا
کہ کوئی خوفناک حادثہ ہوگیا ہے۔

میں نے پوچھا: "تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟"
اس نے دھیرے سے کہا: "تو تو اپنی زبان کو لگام لگا!"
دن بھر گھر کی فضا بوجھل سی رہی۔ نانا اور نانی برابر
بے چینی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور اُکھڑے اُکھڑے جملوں
میں کچھ کہتے تھے جس سے میری وحشت بڑھتی جاتی تھی۔
نانا نے کھاتے ہوئے حکم دیا: "بڑی بی، گھر بھر میں
چراغاں کردو!"

ہم میں سے کسی کو بھوک نہ تھی، تاہم ہم نے جلدی جلدی
کھانا ختم کیا جیسے کسی کا انتظار ہو۔ نانا بڑبڑانے لگا: "شیطان
کی قدرت تو دیکھو . . . . . . . ہر جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے . . .
دین دار ہوں یا پادری . . . کوئی اس سے محفوظ نہیں . . . . .
آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"
نانی نے ایک لمبی سانس لی۔

جاڑے کا یہ دُھندلا دن ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا اور مکان کی فضا زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاتی تھی۔ شام کو ایک دوسرا جمعدار جو لال گلال اور فربہ اندام تھا، آدھمکا اور تندور کے پاس بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ جب نانا نے پوچھا کہ آپ پر یہ بھید کیسے کھلا، تو وہ غرّا کر بولا: "اجی تم اپنا کام کرو۔ ہم سے بھی کوئی بات چھپی رہ سکتی ہے؟"

کھڑکی کے پاس بیٹھ کر میں مُنہ کی بھاپ سے ایک پیسہ گرم کر رہا تھا تاکہ شیشہ پر جمی ہوئی برف پر اس کی مُہر لگاؤں۔ اتنے میں غلام گردش سے ایک بھیانک آواز آئی، دروازہ دھڑ سے کھلا اور پترونا، پاگلوں کی طرح چلّائی:

"دیکھو تو سہی کہ یہ کیا ہے!"

پولیس مین کو دیکھتے ہی وہ بھاگی مگر اُس نے اس کا دامن پکڑ کر ڈانٹ بتلائی: "ٹھہر! تو کون ہے؟ وہاں کیا ہے؟"

وہ چوکھٹ پر گھٹنوں کے بل گر پڑی اور ڈر کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی: "میں دودھ دوہنے جا رہی تھی کہ اس پر نظر پڑی... میں نے سوچا کہ کشرن بابا کے باغ میں یہ بوٹ کہاں سے آیا —"

یہ سُنتے ہی نانا جان اُچھل پڑے: "اری بے حیا، جھوٹ کیوں بولتی ہے؟ دیوار اتنی اونچی ہے کہ باغ کے اندر کی چیز تجھے دکھائی نہیں دے سکتی۔ تو مکر رہی ہے، باغ میں کچھ نہ تھا۔"

مگر پتروانا نے ایک ہاتھ سے اس کے پانو اور دوسرے سے

اپنا سر تھام کر کہا: "بڑے میاں قسمیہ میں سچ کہہ رہی ہوں ۔۔۔۔ تمھاری دیوار تک پیر کے نشان بنے تھے اور ایک جگہ برف کیچڑ بن گئی تھی ۔۔۔۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ ۔۔۔۔۔ وہاں پڑا ہے ــــــ"

"ارے کون ؟"

بار ہا یہ سوال پوچھنے کے باوجود ہم اس سے کچھ نہ معلوم کر سکے۔ یکایک وہ سب ایک دوسرے کو دھکیاتے ہوئے باغ کی طرف جھپٹے۔ وہاں پیٹر کھائی کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس پر برف کی ہلکی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہ جلے ہوئے شہتیر کے سہارے پڑا تھا اور اس کا سر سینے تک جھک آیا تھا۔ اس کی داہنی کنپٹی پر ایک بہت بڑا زخم تھا اور اس سے گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔

خوف کے مارے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پیٹر کے داہنے ہاتھ کی سیاہ انگلیوں میں ایک بڑا سا چھرا تھا جسے میں خوب پہچانتا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ کٹ کر برف میں دب گیا تھا۔ اس کے تلے کی برف دھنس گئی تھی اور وہ اس میں دبک کر اور بھی زرا سا معلوم ہو رہا تھا۔ لاش کے داہنے پہلو پر برف میں ایک سرخ خاکہ سا بن گیا تھا جو کسی چڑیا کی شکل سے ملتا جلتا تھا لیکن بائیں پہلو کی برف جوں کی توں چکنی اور چمک دار تھی۔ سر گویا سجدے میں گر پڑا تھا اور ٹھڈی سینے پر یوں رک گئی تھی کہ داڑھی بیچ میں کچل کر رہ گئی تھی۔ سینے میں جمے ہوئے خون کے

سُرخ تکیوں میں پیتل کی بڑی سی صلیب صاف جھلک رہی تھی۔
تماشائیوں کے شور و غوغا سے میرا سر پھٹنے لگا۔ پڑونا کی فریاد کا سلسلہ جاری تھا۔ جمعدار گلا پھاڑ کر دلی کو کوئی حکم دے رہا تھا اور نانا جان پھیری والے کی طرح ہدایت دے رہے تھے:
"پانو کے نشان نہ مٹنے پائیں!"
لیکن بڑے میاں نے یک بیک بھوں تان کر کڑک کر جمعدار سے کہا: "اے میاں پگڑی والے! تم نے یہ کیا پنچایت لگا رکھی ہے؟ یہ خدا کا معاملہ ہے۔۔۔ یہ قدرت کی سزا ہے۔۔۔ مگر تم اپنے کو دیکھو کہ ہر بات میں ٹانگ اڑاتے پھرتے ہو۔"
سب لوگ سناٹے میں آگئے۔ ایک لمبی سانس لے کر سب نے صلیب کا نشان بنایا۔ اتنے میں باہر سے کئی لوگ باغ میں آئے کچھ تو جلدی میں دیوار سے نیچے گر پڑے۔ نانا نے بگڑ کر اُنھیں للکارا: "پڑوسیو، تم میری پھلواری کا ستیاناس کیوں کر رہے ہو؟ کیا تمھاری مت ماری گئی ہے؟" یہ سُن کر وہ سب رعب میں آگئے۔
نانی نے سسکی بھرتے ہوتے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر کے اندر چلی آئی۔
میں نے پوچھا: "آخر اس نے کیا کیا تھا؟"
"تو نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا؟"
رات بھر اجنبیوں کی آمد و رفت اور غل غپاڑے کا سلسلہ جاری رہا۔ پولیس کا پہرا برابر موجود رہا اور ایک شخص جو بڑے

پادری کی طرح اینٹھو تھا، ڈائری لکھنے لگا۔ بیچ بیچ میں بطخ کی طرح وہ بول اُٹھتا تھا۔

"کیا...... کیا......؟"

نانی نے ان سب کو باورچی خانے میں چائے پلائی۔ میز پر ایک موٹے تازے ڈھیل ڈھول اور چیچک رو آدمی نے سارا قصہ سنایا:

"اس کا اصلی نام ہمیں نہیں معلوم...... بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ "التاما" کا باشندہ تھا۔... اس کا بھتیجا نہ گونگا تھا نہ بہرا، یہ سب جھوٹ موٹ کا سوانگ تھا.... اسے اس جرم کی خبر تھی۔... ایک تیسرا آدمی بھی ان کا شریک تھا لیکن اب تک اس کا پتہ نہ چل سکا.... عرصے سے وہ گرجا گھروں میں چوری کرتے تھے۔ یہی ان کا پیشہ تھا۔"

پتروونا پسینے سے شرابور ہوگئی اور اس نے "ہائے میرے مولا" کی صدا لگائی۔

میں تندور پر بیٹھ کر ان سب کا جائزہ لے رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیسے بدنما اور وحشی ہیں۔

---
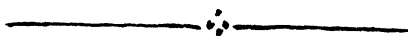
# باب ۱۰

ایک سنیچر کو نور کے "تڑکے میں "روبن" چڑیا پکڑنے کے لیے
پترونا کی باڑی میں گھسا۔ مجھے وہاں دیر تک رہنا پڑا کیوں کہ یہ
چڑیاں مشکل سے دام میں آتی ہیں۔ ان کا روپ میرے من کو لبھا
رہا تھا۔ روپہلی برف پر پھدک کردہ برف پوش ٹہنیوں پہ جھولنے
لگتی تھیں اور اپنے پروں سے چاندی سی لٹانے لگتی تھیں۔ یہ
نظارہ ایسا دل رُبا تھا کہ ناکامی کا غم میرے دل سے دُھل گیا
اور سچ تو یہ ہے کہ میں پکّا شکاری نہ تھا۔ شکار سے زیادہ اس کا
تماشا مجھے لطف دیتا تھا اور سب سے زیادہ دلچسپی پرندوں کے
طور طریقوں کے مطالعہ سے ہوتی تھی۔ لہٰذا میں برف کی ایک
چٹان پر بیٹھ کر پنچھیوں کے ان نغموں کو خوش خوش سُن رہا تھا
جو اس خنک دن کے روپہلے سنّاٹے میں خلل ڈال دیتے تھے
اتنے میں مجھے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی گھنٹی سُنائی دی گویا
روسی زمستان میں کوئی بلبل ایک افسردہ گیت گا رہا ہے۔

برف میں بیٹھے بیٹھے میں اکڑ گیا تھا اور میرے کان گویا ٹھٹھر گئے
تھے۔ لاچار جال اور پنجرے سمیٹ کر میں دیوار سے اپنے باغ میں
کودا اور گھر کی راہ لی۔

سڑک کا پھاٹک کھلا ہوا تھا اور ایک دیو قامت انسان سیٹی بجاتے ہوئے تین گھوڑوں کو آنگن سے نکال کر ایک بند گاڑی میں جوت رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا:
"کس کی سواری آئی ہے؟"

اس نے ایک نظر مجھے دیکھ کر گھوڑے پر اُچکتے ہوئے جواب دیا:
" پادری صاحب کی!"

مجھے یقین نہ آیا۔ بفرضِ محال، پادری صاحب نازل بھی ہوئے تو وہ کسی کرائے دار کے مہمان ہوں گے۔

گاڑی بان نے لگام سے گھوڑوں پر گویا مورچھل جھلتے ہوئے آواز دی: " آجاؤ میرے بیٹو!"

گھوڑے میدان میں ہوا ہوگئے۔ دیر تک انھیں دیکھنے کے بعد میں نے دروازہ بند کردیا۔ باورچی خانے میں قدم رکھتے ہی میں نے بغل کے کمرے سے اپنی ماں کی گرج دار آواز سُنی جو بڑی تیزی سے کہہ رہی تھی: " تو آپ لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟ کیا میری جان لینا چاہتے ہیں؟"

شکار کی پوشاک اُتارے بغیر پنجرے ایک کونے میں پھینک کر میں غلام گردش کی طرف لپکا اور وہاں نانا سے مڈ بھیڑ ہوگئی۔ اس نے میرا کاندھا پکڑ کر اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: " تیری ماں آئی ہے . . . . اس کے پاس جا . . . ٹھہر!" اس نے مجھے اس زور سے جھنجھوڑا کہ میں گرتے گرتے بچا اور چکّر کھا کر دروازے سے جا لگا: " اچھا جا . . . دفان ہو . . .!"

میں نے دروازے پر دستک دی جس پر موم جامہ چڑھا ہوا تھا لیکن ہاتھ ٹھنڈ سے ایسے سن ہو گئے تھے کہ ہتا بہ مشکل پکڑ میں آیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں چوکھٹ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

اماں نے کہا "لو، وہ اب آیا ہے! ماشاءاللہ، کتنا بڑا ہو گیا! ..... کیوں، کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ ....... اور اس نے یہ کیا دھج بنا رکھی ہے.... ارے اس کے کان تو سپید ہوئے جا رہے ہیں! امی دوڑ کر ذرا سی چربی تو لانا"

کمرے کے بیچ میں آکر وہ میرے کپڑے اتارنے لگی اور مجھے یوں گھمانے لگی گویا میں ایک چھوٹا سا گیند تھا۔ اس کا شان دار جسم ایک نرم و گرم اور خوبصورت لبادے میں ملبوس تھا جو کاندھے سے اتر کر زانو تک لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اس وضع کا لبادہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس کا چہرا پچک گیا تھا، آنکھیں دراز تر ہو کر اندر دھنس گئی تھیں اور بالوں کا رنگ گہرا سنہرا ہو گیا تھا۔ میرے پرانے کپڑے باہر پھینک کر وہ حقارت سے ہونٹ چبا رہی تھی اور بار بار اپنی سُریلی آواز میں کہتی جاتی تھی: "آخر یہ چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ کیا مجھے دیکھ کر تجھے خوشی نہیں ہوئی؟ توبہ، کیا میلا کرتا ہے"

پھر اس نے چربی سے میرے کانوں کی ایسی مالش کی کہ میں بلبلا اٹھا۔ لیکن اس کے بدن سے ایسی اچھی مہک آ رہی تھی کہ میرا درد کم ہو گیا۔

میں اس سے چمٹ گیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے

دیکھنے لگا کیوں کہ رقّت کے مارے میرا گلا رندھ گیا تھا۔ نانی کو میں نے اُداسی سے یہ کہتے سُنا:

"یہ بڑا سرکش ہی۔۔۔۔ کسی کو پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا اب تو اپنے نانا کی بھی نہیں سنتا۔۔۔ آہ واریا۔۔۔ واریا!"

"امّاں لِلّٰہ یہ رونا دھونا بند کرو۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل"

میری ماں کے سامنے ہر چیز نحیف و ضعیف معلوم ہونے لگی۔ اور میں بھی اپنے کو نانا کی طرح بوڑھا محسوس کرنے لگا۔

مجھے زانو پر بٹھا کر اپنے وزنی ہاتھوں سے کنگھی کرتے ہوئے، امّاں نے کہا: "اس کی تربیت ہونا چاہیے اور اب تو اسے اسکول بھی جانا چاہیے۔۔۔ کیوں تمھیں پڑھنا لکھنا پسند ہی یا نہیں؟"

"مجھے حسبِ ضرورت پڑھنا آگیا ہی!"

"نہیں، ابھی تمھیں تھوڑی سی تعلیم اور حاصل کرنا ہی۔۔۔ اوہو یہ کتنا طاقت ور ہوگیا ہی!" یوں مجھ سے کھیلتے ہوئے وہ جی کھول کر اپنی دل کش آواز میں ہنسنے لگی۔

جب نانا اندر آیا تو وہ غصّے سے کھول رہا تھا، اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور چہرا زرد پڑگیا تھا۔ مگر امّاں نے بے خوف و خطر پوچھا: "ابّا، آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا میں چلی جاؤں!"

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر ناخن سے برف کھُرچتا رہا اور دیر تک خاموش رہا۔ عجب کشمکش کا عالم تھا، اور جیسی کہ میری فطرت تھی میں اس گھڑی ہمہ تن گوش ہوگیا اور میرے سینے میں کوئی شَے پیچ و تاب کھانے لگی اور مجھے زور سے چیخ پڑنے کو

بے تاب کرنے لگی۔

نانا نے ڈانٹ کر کہا: "الکسی، یہاں سے ہٹ جا!" مگر اماں نے مجھے اپنے آغوش میں کھینچ کر کہا: "کیوں؟ تو یہاں سے نہ جائے گا یہ میرا حکم ہے!" وہ اٹھی اور گلابی بادل کی طرح اڑتی ہوئی نانا کے قریب گئی:

"سنیے ابا جان ——"

وہ پلٹ کر گرج اٹھا: "چپ رہتی ہے یا نہیں؟"

اماں نے سرد مہری سے کہا: "آپ مجھے یوں ڈانٹ ڈپٹ نہیں سکتے۔"

نانی کوچ سے اٹھی اور انگلی دکھا کر بولی: "ورشکا، یہ کیا؟"

نانا بیٹھ کر بڑبڑانے لگا: "زرا ٹھہرو! مجھے بھی تو معلوم ہو کہ وہ کون تھا —؟ ایں .... آخر یہ سب کیسے ہوا؟"

یکایک وہ ایک غیر فطری آواز میں چیخ اٹھا:

"ورشکا، تو نے مجھے زمانے بھر میں رسوا کر دیا!"

نانی نے مجھے باہر جانے کا حکم دیا۔ میں باورچی خانے میں جا کر تندور پر بیٹھ گیا جہاں سے میں ان کی بات چیت بخوبی سن سکتا تھا۔ میرا تو دم گھٹنے لگا۔ یا تو وہ سب بیک وقت بولنا شروع کر دیتے تھے اور ایک دوسرے کی بات کاٹنے لگتے تھے اور یا یوں خاموش ہو جاتے تھے گویا سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس مباحثے کا موضوع ایک بچّے کی ذات تھی جو حال ہی میں میری ماں کے پیدا ہوا تھا اور فی الحال کہیں اور پل رہا تھا۔ مگر میری

سمجھ میں یہ امر مطلق نہ آیا کہ نانا جان اس بات پر خفا ہیں کہ امّاں نے بلا اُن کی اجازت یہ بچّہ کیوں جنا، یا اس بات پر کہ وہ بچّے کو ساتھ کیوں نہ لائی۔

جب نانا باورچی خانے میں آیا تو وہ سخت حیران اور پریشان تھا۔ پیچھے پیچھے نانی آستین سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی آئی۔ نانا ایک بنچ پر جُھک کر بیٹھ گیا اور اپنے ہونٹوں کو برابر کاٹنے لگا۔ نانی اس کے آگے دوزانو بیٹھ کر یہ التجا کرنے لگی:

"بڑے میاں، خدا کے لیے اسے معاف کردو! اسے یوں نکالنا اچھا نہیں۔ بڑے بڑے شریفوں اور سیٹھوں کے گھر آئے دن ایسے واقعات ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو عورت کی فطرت ہے۔ خدارا اسے بخش دو۔ جانتے ہو کہ دنیا میں کوئی فرشتہ نہیں"

نانا دیوار کا سہارا لے کر اسے ٹکرٹکر دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ تلخی سے ہنسا تو گمان ہوا کہ ان کا قلب پھٹا جا رہا ہے۔

"اور بھی تو کچھ کہو؟ واللہ اعلم، تم کسے معاف کرنے سے انکار کروگی؟ تمھارا بس چلے تو کسی گناہ کی کوئی سزا نہ ہو...... ہشت...... دھت!"

نانی کا شانہ پکڑکر اس نے بُری طرح ہلایا اور تیزی سے زیرِ لب یہ کہنے لگا:

"مگر خدا کی قسم تمھاری چاپلوسی کسی کام نہ آئے گی۔ میرا دل ایسا کمزور نہیں۔ ہمیں دیکھو کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور مصیبت کا یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے...... ہمارے لیے نہ مسرت ہے

نہ اطمینان ـــــ اور نہ کبھی یہ نصیب ہوگا..... اور یہ سُن رکھو کہ مرتے مرتے ہمیں بھیک کا ٹھیکرا تھامنا ہوگا ـــــ ہم بھِک منگوں کی موت مریں گے!"

نانی اس کا ہاتھ تھام کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور ہنستی ہوئی بولی: "تم بھی ایک ہی بُدّھو ہو! اور کچھ نہیں تو بھیک کے ڈر سے دُبلے ہوئے جا رہے ہو۔ خدا نخواستہ ایسا ہُوا بھی تو کیا؟ تم گھر کی رکھوالی کرنا میں بھیک مانگ لایا کروں گی.... اور سارا شہر میری جھولی بھر دے گا..... ہمیں کھانے بھر کو مل جائے گا تم ادھر سے مطمئن رہو۔"

یک بیک نانا بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بوڑھے بکروں کی طرح اپنا سر ہلانے لگا۔ نانی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ اس سے چپک گیا اور اس کی بغل میں عجب ہیچ پوچ معلوم ہونے لگا

"اری پھوہڑ خانم!..... تیرے سوا دنیا میں میرا اور کون ہے ـــــ تجھے کسی چیز کی پروا نہیں کیوں کہ تو تو عقل و شعور سے محروم ہے۔ لیکن زرا پچھلے دنوں کو یاد کر اور سوچ کہ ہم دونوں نے ان بدکاروں کے لیے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں..... میں نے کیسے کیسے گناہ کیے...... اور اس کا انجام یہ ہونا تھا ـــــ"

اب میں اپنے کو ضبط نہ کر سکا اور نہ اپنے آنسوؤں کو روک سکا۔ میں تندور سے کود کر ان کی طرف لپکا۔ میں خوشی کے مارے رو رہا تھا کیوں کہ وہ آپس میں اس اخلاص سے باتیں کر رہے تھے اور میرا دل ان کے غم کا شریک حال تھا

نیز اس لیے کہ میری ماں واپس لوٹ آئی تھی۔ نانا اور نانی مجھے گلے لگاکر روتے رہے اور دیر تک مجھے بھینچتے رہے۔ مگر نانا نے آہستہ سے کہا:

" ابے بھتنے تو یہیں چھپا ہوا تھا! اب تو تیری ماں آگئی ہے اور غالباً تو ہمیشہ اسی کے ساتھ رہے گا۔ اب اپنے بوڑھے نانا سے تجھے کوئی واسطہ نہ رہے گا کیوں؟ ـــــ اور بیچاری بڑھیا نانی کی بات بھی تو نہ پوچھے گا جس نے لاڈ میں تجھے سر چڑھا لیا ہے۔ کیوں ـــــ ہشت ..... دھت!"

ہم دونوں کو الگ ہٹاکر وہ غصّے سے بولا:

" یہ سب یکے بعد دیگرے ہمیں چھوڑ رہے ہیں .... خیر اسے بلا لاؤ۔ بڑی بی، جلدی کرو، دیکھ کیا رہی ہو؟"

جب نانی باہر چلی گئی تو وہ سر جھکاکر کونے میں جا کھڑا ہوا۔

" خدائے کریم" ـــــ اس نے اپنی طوطا کہانی شروع کی:" تو دیکھتا ہے کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے؟" اور اپنا سینہ پیٹنے لگا۔

مجھے اس کی یہ حرکت سخت ناگوار تھی۔ وہ خدا سے جس انداز سے باتیں کرتا تھا وہ مجھے بالکل ناپسند تھا۔ وہ تو اپنے خالق کے آگے بھی لن ترانی ہانکنے سے نہ چوکتا تھا۔

جب امّاں اندر داخل ہوئی تو اس کی سُرخ پوشاک سے کمرا جھل جھلا اُٹھا۔ وہ میز پر جب نانا نانی کے بیچ میں بیٹھی تو اس کے لبادے کی کشادہ آستینیں شانوں سے ڈھلک پڑیں۔ وہ سنجیدگی سے ہولے ہولے کوئی واقعہ بیان کرنے لگی اور وہ دونوں اس

ادب سے اسے سننے لگے گویا وہ دونوں بچّے ہیں اور وہ اُن کی ماں۔

اشتعال کی تھکن ایسی تھی کہ مجھے کوچ پر ہی نیند آگئی۔ جھٹپٹے کے سمے بڈھوں کا جوڑا بن ٹھن کر گرجا گھر چلا۔ نانا نے برادری کے چودھری کی وردی ڈانٹ لی تھی اور اس پر ایک فیتہ بھی لگا رکھا تھا۔ اپنی توند نکالے ہوئے وہ اس دھج میں بڑا رعب دار معلوم ہوتا تھا۔ نانی نے اس کی طرف آنکھ مار کر امّاں سے کہا: "زرا بڑے میاں کے ٹھاٹ تو ملاحظہ ہوں! کیا بانکے چھیلا بنے ہوئے ہیں...... معلوم ہوتا ہی کہ کوئی جوان پٹھا ہی" اس پر امّاں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے تو وہ کوچ پر دونوں پیر اُٹھا کر بیٹھ گئی اور خالی جگہ کی طرف اشارہ کرکے کہا: "آؤ یہاں بیٹھو۔ اب بتاؤ کہ تمھیں یہ گھر پسند ہی یا نہیں؟"

"زیادہ نہیں"

"کیوں؟"

مجھے خود اس کی خبر نہ تھی۔

"مجھے نہیں معلوم"

"نانا اب بھی تمھیں ٹھونکتے ہیں؟"

"اب زیادہ نہیں"

"اچھا؟...... خیر مجھے اپنی سب باتیں سناؤ"

میں نانا کا ذکر نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے در اصل صاحب کا

قصّہ سنانے لگا جس غریب سے سب لوگ چڑتے تھے اور جسے نانا نے نکال دیا تھا۔ مگر میں سمجھ گیا کہ اماں کو یہ کہانی نہ بھائی۔ اس نے کہا: "اور کچھ سناؤ۔"

میں نے اُسے تین بھائیوں کا حال سُنایا اور بتایا کہ کرنل نے کس طرح مجھے احاطے سے نکال دیا تھا۔ یہ سُنتے سُنتے اُس نے میرا ہاتھ زور سے بھینچا۔ "کیا ظلم ہے!" یہ کہتے وقت اس کی آنکھ چمک اُٹھی اور وہ ایک لمحے کے لیے چُپ چاپ فرش کی طرف تاکنے لگی۔

اب میں نے دریافت کیا: "نانا تم سے خفا کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ اُن کے اُصول کے مطابق میں گناہ گار ہوں۔"

"وہ بچّہ یہاں نہ لانے کی وجہ سے ——؟"

وہ چونک پڑی، اُس کے ماتھے پر بل آگئے اور وہ ہونٹ چبانے لگی۔ پھر زور سے ہنس کر اس نے مجھے لپٹا لیا اور کہا: "ارے شیطان! آیندہ کبھی اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا، سنتا ہے یا نہیں؟ ان باتوں کو ہمیشہ کے لیے بھول جا۔"

تھوڑی دیر وہ مجھ سے رُکاوٹ اور سختی سے بولتی رہی۔ لیکن ان جُملوں کی طرف میری کوئی توجّہ نہ تھی۔ اپنی ٹھوڑی کو اُنگلی سے ٹھوکے دیتے ہوئے اور گھنی بھوؤں کو چڑھاتے اُتارتے ہوئے وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

میز پر ایک موم بتّی روشن تھی اور آئینہ میں اس کا عکس جھلملا رہا تھا۔ فرش پر دُھندلی پرچھائیاں ہل رہی تھیں۔ شہ نشین

کے آگے ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا اور برف پوش کھڑکیوں کو چاندنی منوّر کر رہی تھی۔ ماں در و دیوار کو یوں دیکھنے لگی گویا کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔

"تم کس وقت سویا کرتے ہو؟"

"مجھے کچھ دیر یہیں رہنے دیجیے۔"

"ارے ہاں، تم تو دن میں سو بھی چکے ہو" اسے یہ یاد آیا۔

"کیا آپ جانا چاہتی ہیں؟"

"کہاں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اور میرا سر اٹھا کر دیر تک مجھے اس انداز سے تکتی رہی کہ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

"تمھیں کیا ہوگیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"میری ناک چرچرا رہی ہے۔"

دراصل میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کیوں کہ خود بخود یہ خیال میرے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہ رہے گی اور جلد رخصت ہو جائے گی۔

ایک چٹائی کو پیر سے ٹھکراتے ہوئے وہ بولی: "ہرادا اپنے باپ کی سی ہے۔ ۔ ۔ نانی نے تمھیں ان کا حال کبھی سنایا تھا؟"

"ہاں ہاں"

"امّی جان کو ان سے بڑی محبت تھی اور وہ بھی انھیں چاہتے ——"

"مجھے یہ بات معلوم ہے۔"

امّاں نے چیں بجبیں ہو کر موم بتّی کو دیکھا اور اسے بجھا کر

کہا: "اب ٹھیک ہی ا!"

واقعی فضا زیادہ خوش گوار ہوگئی اور وہ مہیب سائے معدوم ہوگئے۔ ان کی جگہ فرش پر روشنی کی کرنیں چمکنے لگیں اور جھروکوں پر گویا نور پارے بکھر گئے۔

"لیکن اتنے عرصے آپ کہاں رہیں؟"

اس نے بہت سوچ سوچ کر گو یا کسی بھولے ہوئے واقعہ کو یاد کر رہی ہو، بہتیرے شہروں کے نام گنائے۔ اس اثنا میں برابر وہ ایک شاہین کی طرح کمرے میں بے آواز گشت لگاتی رہی۔

"یہ لبادہ آپ کو کہاں ملا؟"

"میں نے خود بنایا تھا۔ اپنے تمام کپڑے میں خود سیتی ہوں!"

یہ تصور میرے لیے راحت بخش تھا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہی مگر وہ بہت کم سخن تھی۔ جب تک میں چھیڑتا نہ تھا وہ بولتی نہ تھی۔

وہ پھر میرے قریب کوچ پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چپ چاپ چمٹے رہے تا وقتیکہ نانی نانا موم بتی اور لوبان کی مہک میں بسے ہوئے لوٹ نہ آئے۔ اس وقت ان دونوں کی چال ڈھال بہت نیک و معصوم ہوگئی تھی۔

یہ کھانا ہم نے اس طرح کھایا جیسے تیوہار کا کھانا ہوتا ہی۔ یعنی بہت کم بات چیت کی اور جو چند الفاظ کہے بھی تو ایسی دبی زبان سے جیسے کسی سونے والے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ ہو۔

اماں نے فوراً مجھے باقاعدگی سے روسی پڑھائی شروع کردی

وہ کئی کتابیں خرید لائی جن کی مدد سے چند روز میں میں فرفر پڑھنے لگ گیا۔ مگر اس نے مجھے نظمیں رٹانی شروع کیں اور یہ ہم دونوں کے لیے ایک جنجال ہوگئی۔

مثلاً اگر نظم کا ایک بند یہ ہوتا:

مالی آوت دیکھ کر کلیاں اٹھیں پکار
پھولی پھولی چن لیو، کال ہماری بار

تو میں 'کلیاں' کو 'کلیا' یا 'پھولی' کو 'پھلی' پڑھ جاتا۔ اماں خفا ہوتی: "ہوش میں تو ہو! ارے کولھو کے بیل، یہ 'کلیا' کیسے بن گئی؟ ..... کل — یاں ..... اب سمجھ میں آیا؟"

سمجھنے کے باوجود میں دوبارا یہی غلطی کرتا تھا اور اس سے ہم دونوں کو یکساں تعجب ہوتا تھا۔

وہ ناراض ہوکر کہتی کہ میں غبی اور ضدّی ہوں۔ یہ الزام صحیح نہ تھا کیوں کہ ان بیہودہ نظموں کو یاد کرنے میں میں نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ طرفہ یہ کہ دل ہی دل میں میں انھیں حرف بحرف دہرا سکتا تھا لیکن زور سے پڑھتے وقت وہ غلط ہوجاتی تھیں۔ مجھے ان زریب کار اشعار سے چڑ ہوگئی اور میں جان بوجھ کر انھیں خلط ملط کرنے لگا اور ایک ردیف و قافیہ کے تمام الفاظ کو جمع کرنے لگا۔ اپنی یہ کاوش مجھے پسند آئی کیوں کہ اس طرح — خود بخود اشعار بن جاتے تھے گو وہ بالکل بے معنی ہوتے تھے۔

لیکن یہ جدت زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ ایک روز جب میں نے

اپنا سبق حسن و خوبی سے سُنا دیا تو امّاں پوچھ بیٹھی کہ نظم یاد کی یا نہیں۔ بلا ارادہ میں نے یہ غزل خوانی شروع کی:

"تلخ ہی چقندر اور سُرخ ہی قلندر ــــ"

بہت دیر میں مجھے ہوش آیا۔ امّاں نے میز پر ہاتھ پٹک کر پوچھا: "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہی؟"

میں نے لاپرواہی سے کہا: "مجھے نہیں معلوم"

"نہیں، تم خوب جانتے ہو!"

"یہ بڑا مزیدار ــــ"

"مزیدار کیا؟"

"مزیدار چٹکلا ہی"

"چلو مرغا بنو"

"کیوں؟"

"کونے میں جاتا ہی یا نہیں؟" اس کا چہرا تمتما اُٹھا۔

"کون سا کونا"

اس نے مجھے یوں گھور کر دیکھا کہ میں ساری سٹّی بھول گیا میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس کونے میں جاؤں، کیوں کہ ایک میں پلنگ تھا، دوسرے میں شہ نشین تیسرے میں صندوق اور چوتھے میں دروازہ۔

بوکھلا کر میں نے جواب دیا: "میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا"

وہ کچھ ٹھنڈی پڑی اور اپنے گال اور ماتھے کو پونچھتے ہوئے پوچھا:

"نانا نے تمھیں کبھی مُرغا نہیں بنایا؟"

"کب؟"

"کب کے بچّے! میں جو پوچھتی ہوں اس کا جواب دے۔" میز پر گھونسا مار کر وہ چلاّ پڑی۔

"نہیں — مجھے تو یاد نہیں ہے۔"

اس نے ایک لمبی سانس لی: "توبہ ہے توبہ! ذرا یہاں تو آنا۔" میں یہ کہتے ہوئے اس کے پاس گیا: "آپ مجھ سے خفا کیوں ہیں؟"

"کیوں کہ تم نے جان بوجھ کر اُس نظم کا ایسا ستیاناس کیا۔"

میں نے حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں دل میں یہی نظم صحیح صحیح دہرا سکتا ہوں لیکن زبان کھولتے ہی الفاظ آپ ہی آپ یہاں سے وہاں بھاگ جاتے ہیں۔

"تم بَن تو نہیں رہے ہو؟"

اس کا جواب میں نے نفی میں دیا۔ مگر لمحہ بھر بعد میں نے یہی نظم لفظ بہ لفظ سُنا دی اور یہ کارنامہ میری خفّت اور ندامت کا باعث ہُوا۔ شرم کے مارے میں امّاں کے آگے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ چہرا جلنے لگا، کان بھائیں بھائیں کرنے لگے اور بھیجا اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ اپنی اشک فشاں آنکھوں سے دیکھا کہ امّاں کا چہرا غضب آلودہ ہے اور وہ بھوں چڑھائے ہونٹ چبا رہی ہے۔

بدلی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا: "اس سوانگ کا مطلب کیا ہے؟ تم نے دانستہ یہ شرارت کی تھی؟"

"میں نہیں جانتا۔ انجان پنے میں ایسا ہو گیا۔"

سر جھکا کر وہ بولی: "تم بھی اپنی قسم کے ایک ہی ہو! ہٹو یہاں سے۔"

امّاں نظم پر جتنا زور دیتی تھی میرا حافظہ اتنا ہی بغاوت کی طرف مائل ہوتا جاتا تھا اور ان لطیف و ہموار بحروں کو یاد کرنے سے انکار کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ اشعار کو مسخ کرنے کی خواہش زور پکڑتی گئی اور اس نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اب میں نئے نئے الفاظ تراشنے لگا اور مجھے خود اپنی صلاحیت پر رشک آیا۔ کیوں کہ خدا جانے کہاں سے نئے نئے اور بے تکے بول میرے دماغ میں آ جمتے اور نظم کی صحیح ترکیبوں کو نکال باہر کرتے تھے۔ اکثر نظم کا ایک آدھ بند میں بھول جاتا تھا اور لاکھ سر مارنے پر بھی یاد نہ آتا تھا۔ خصوصاً ایک مشہور نظم نے مجھے بہت دق کیا جس کا پہلا بند میں کسی طرح یاد نہ کر سکا:

صبح ہو یا شام ہو
ایک ضعیف ایک یتیم۔
جھولیاں لیے ہوئے۔
"دے خدا کی راہ پر"
چشم نم، دل میں غم
آدمی پہ یہ الم۔ ای خدا یہ کیا ستم!

مگر دوسری کڑی مجھے خوب یاد رہتی تھی:

پھر رہے ہیں در بدر روٹیوں کی چاہ میں
یہ بھی کیسا ظلم ہے آدمی کی جان پر

امّاں کی سمجھ میں نہ آیا کہ میرے دماغ کا کون سا پرزہ ڈھیلا ہے۔ جب اس نے نانا سے میری حرکتوں کا ذکر کیا تو ان حضرت نے تیوری چڑھا کر کہا: "یہ سب اس کی ڈھٹائی ہے!۔ اس کی یاد داشت بہت اچھی ہے۔ توتے کی طرح دُعائیں سُنایا کرتا تھا..... شرارت کر رہا ہے، ورنہ جو سُنتا ہے اس کے دماغ پر نقش ہو جاتا ہے..... کندی کرد کندی! لات کا دیو کہیں بات سے مانتا ہے!"

نانی نے بھی صلواتیں سُنائیں: "گیت اور کہانی کیسے یاد رکھتا ہے — اور نظم گیت نہیں ہے تو کیا ہے؟"

ان کے طعنے تشنے ٹھیک تھے۔ لیکن اسے کیا کروں کہ نظم پڑھنے بیٹھتا ہی تھا کہ کہیں سے الفاظ کا لشکر آکر آپ ہی آپ یوں پریڈ کرنے لگتا تھا:

ہمارے گھر کے سامنے بھکاریوں کی بھیڑ ہے
گڑگڑا رہا ہے ایک بڑبڑا رہا ہے ایک
"دے خدا کے نام پر" ایک یہی حدیث ہے
ہیں مگر یہ بد معاش روٹیوں کو بیچ کر
جامِ مے پیے ہوئے نالیوں میں ہیں پڑے

رات کو نانی کے پاس لیٹے لیٹے میں اسے دن بھر کا سبق اور اپنی تُک بندی سُنایا کرتا تھا۔ کبھی تو وہ ہنس پڑتی تھی

لیکن بلبشیر یہ نصیحت کرتی تھی: "بہت ہوا!۔ اچھا تو بڑا ملک الشعرا ہی۔ مگر بھکاریوں کا مذاق اُڑانا گناہ ہی۔ خدا ان کی مشکلیں آسان کرے!۔ کیا عیسیٰ اور سب پیر پیغمبر غربت میں نہیں رہے؟"

میں گنگنانے لگتا تھا:

"بھک منگوں کا دشمن ہوں میں — نانا جان کا بیری ہوں
جب دیکھو تب تاک دھنا دھن — روئی کی کیا ڈھیری ہوں"

اب تو نانی بپھر پڑتی تھی: "ارے بھڑوے! پھر تو کہہ کر دیکھ۔ اگر بڑے میاں یہ سن لیں تو ——"

"سن لیں میری بلا سے!"

اب نانی نے سنجیدگی اور محبت سے کہا: "مجھے ضد نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے تیری ماں کا مزاج اور بھی خراب ہوتا ہی اس بیچاری کے ساتھ یوں ہی کچھ کم مصیبتیں لگی ہوئی ہیں"

"کون سی مصیبتیں؟"

"یہ باتیں تیری سمجھ میں نہ آئیں گی"

"اجی میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ سب نانا کی ——"

"چُپ رہتا ہی یا نہیں!"

میں بھی عجب مخمصے میں تھا۔ مجھے کسی ہم درد کی ضرورت تھی لیکن یہ بات کسی سے کہتے بھی نہ بنتی تھی۔ لا محالہ میں چڑچڑا اور ضدی ہو گیا۔ امّاں کا درس میرے لیے سخت بے لطفی اور کوفت کا باعث ہو گیا۔ حساب تو میں آسانی سے سیکھ گیا لیکن

املا لکھنے کی سکت نہ تھی اور گرامر تو میرے لیے کالے اکھر سے بھی بدتر تھی۔

ان باتوں سے زیادہ غم انگیز یہ احساس تھا کہ اس گھر میں رہنا اماں کے لیے قطعاً ناممکن تھا۔ ہر روز اُس کے چہرے پر اُداسی کی ایک نئی تہہ چڑھتی جاتی تھی اور وہ ہر شے کو اجنبی کی نظر سے دیکھنے لگی وہ کھڑکی کی سِل پر بیٹھ کر دیر تک باغ کو تکتی رہتی اور کسی سے کچھ نہ کہتی تھی۔ اس کا کُندن سا رنگ پھیکا پڑتا جاتا تھا۔

درس کے وقت اس کی آنکھیں گویا میرے آر پار در و دیوار کو دیکھا کرتی تھیں اور وہ تھکی ہوئی آواز میں کوئی سوال پوچھ کر آن کی آن میں اس کا جواب بھول جاتی تھی۔ اب وہ زرا زرا سی باتوں پر مجھ سے ناراض رہنے لگی۔ اور مجھے اس کا بڑا صدمہ تھا کیوں کہ راوی کا بیان تھا کہ ہر ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ کبھی میں اُس سے پوچھ بیٹھتا تھا: "آپ کو ہمارے ساتھ رہنا پسند نہیں ہے؟" وہ غصّے سے پیر پٹکنے لگتی: "تو ان باتوں میں دخل دینے والا کون ہے؟"

مجھے شبہ ہونے لگا کہ نانا کوئی ایسا منصوبہ گانٹھ رہا ہے جس کی وجہ سے نانی اور اماں دونوں پریشان ہیں۔ وہ اکثر اماں کے ساتھ کوٹھری میں بند ہوکر اس کانے گڈریے کی بانسری کی طرح پیں پیں کرنے لگتا تھا جس سے مجھے انتہائی نفرت تھی۔ ایک مرتبہ اسی قسم کی مجلس مشاورت کے درمیان اماں گلا پھاڑ کر چلّا پڑی:

"میں ہرگز نہ مانوں گی — ہرگز ہرگز نہیں!"

دروازہ دھڑ سے کھلا اور بڑے میاں نے قیامت برپا کردی
شام کا وقت تھا۔ نانی اپنے میاں کے لیے کرتا سیتی ہوئی جی
ہی جی میں بڑ بڑا رہی تھی۔ دروازے کا دھڑاکا سن کر وہ بولی:
"خدا خیر کرے! لڑکی کرایے داروں کے ہاں کیوں گئی؟"
اسی وقت نانا باورچی خانے میں دوڑا ہوا آیا اور اس کے
سر پر گھونسا مار کر پھنکارنے لگا:" اری چڑیل! تیری زبان کبھی بند
ہوگی یا نہیں؟"
نانی نے اپنا جوڑا باندھتے ہوئے آہستگی سے کہا:" تمھاری
عقل ماری گئی ہے! میں ہرگز خاموش نہ رہوں گی! تمھاری ہر سازش
کا حال میں اسے سناؤں گی!"
بڈھا اس پر ٹوٹ پڑا اور تابڑ توڑ لات گھونسے مارنے لگا۔
نانی نے مدافعت کی کوئی کوشش نہ کی اور نہ اس پر ہاتھ اٹھایا
اس کی ایک یہی رٹ تھی:" ٹھیک ہے! رک کیوں گیا ...... قسم
ہے جو مجھے زندہ چھوڑا۔"
میرے ہاتھ تکیے، جوتے، غرض کہ جو چیز سامنے نظر آئی، نانا کی
طرف پھینک ماری۔ لیکن وہ غصے میں ایسا اندھا تھا کہ مطلق اثر
نہ ہوا۔ نانی زمین پر گر پڑی تو وہ اس کے سر پر ٹھوکر مارنے لگا
تا وقتیکہ وہ خود پھسل کر پانی کی بالٹی پر نہ گر پڑا۔ وہ ہانپتا کانپتا
اٹھا۔ اور پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر اوپر بھاگ گیا۔
نانی آہ بھر کر اٹھی اور تخت پر بیٹھ کر اپنے بکھرے ہوئے بال
ٹھیک کرنے لگی۔ میں کوچ سے نیچے اترا تو وہ غصے سے بولی:

"تکیوں وکیوں کو اپنی جگہ پر رکھ دے! آیا ہی بڑا تکیے پھینکنے والا..... اور مجھے دخل دینے کی کیا پڑی تھی! اس بوڑھے کا تو دماغ خراب ہوگیا ہی ــــ خبطی کہیں کا۔"

پھر سانس بھر کر اس نے ناک بھوں چڑھائی اور مجھے بُلا کر سر نیچے جُھکایا: "دیکھنا تو سہی، مجھے کس وجہ سے یہ درد ہو رہا ہی؟"

اس کا جوڑا ہٹا کر دیکھا تو ایک ہیر پن اس کے سر میں چبھ گئی ہی۔ میں نے اسے تو کھینچ لیا مگر ایک دوسری پن دیکھ کر میری اُنگلیاں کانپنے لگیں اور میں نے کہا: "مجھے تو وحشت ہو رہی ہی۔ میں امّاں کو بُلا لاتا ہوں۔"

اس نے مجھے ایک دھکّا دیا: "ایسی کیا آفت آگئی!...... چلے ہیں امّاں کو بلانے..... شکر اللہ کہ وہ یہاں نہ تھی اور تو ـــ ارے تو اپنا مُنھ کالا کر!"

یہ کہہ کر وہ اپنی اُنگلیوں سے بالوں کو ٹٹولنے لگی۔ ہمّت باندھ کر میں نے دو چُبھی ہوئی پنیں باہر نکالیں: "بہت درد ہی نانی؟"

"نہیں بیٹا۔ کل میں سر دھوؤں گی تو ٹھیک ہوجائے گا۔"

پھر وہ چکنی چپڑی آواز میں بولی: "گُڈّے، اپنی ماں سے اس مار پٹائی کا ذکر نہ کرنا۔ ان دونوں میں ایسے ہی کیا کم کُٹا چھنی ہی۔ کہے گا تو نہیں؟

دیکھ، بھول نہ جانا۔ اچھا، آ۔ اب سب چیزیں ٹھکانے سے رکھ دیں ــــ میرے منھ پر کوئی نشان تو نہیں ہی؟ یہ خیریت ہوی ورنہ بھید کھل جاتا۔"

وہ فرش دھونے لگی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں تہِ دل سے چیخ اُٹھا: "نانی تم فرشتہ ہو ــــ یہ سب تم پر کیا ظلم کرتے ہیں اور تم ہو کہ اُف بھی نہیں کرتیں!"

"چپ رہ رے بڑبولے! فرشتہ ــــ دیکھا بھی ہے کوئی فرشتہ؟" اکڑوں بیٹھ کر وہ زیرِ لب کچھ کہنے لگی اور میں تندور پر چڑھ کر نانا سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پہلی مرتبہ اس نے میرے سامنے نانی پر ایسا سنگین حملہ کیا تھا۔

شفق کی سُرخی میں اس کے بکھرے ہوئے لال بال اور تمتمایا ہُوا چہرا میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ میرا دل غصّے سے کھولنے لگا اور مجھے اس خیال سے اور بھی چڑ ہوئی کہ میں بدلا لینے کی کوئی ترکیب نہ سوچ سکا تھا۔

ایک دو روز بعد نانا کے نام کوئی پیغام لیے ہوئے میں اوپر اُس کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھا کہ وہ فرش پر ایک کھُلے ہوئے صندوق کے سامنے بیٹھا کچھ کاغذات دیکھ رہا ہے۔ پیچھے کرسی پر اس کی محبوب جنتری رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بارہ موٹے موٹے ورق تھے اور ہر صفحہ مہینے اور تاریخ کے حساب سے خانوں میں بٹا ہُوا تھا اور ہر خانے میں ایک ولی کی تصویر تھی۔ یہ جنتری نانا کو جان سے زیادہ عزیز تھی اور صرف میں وہ خوش قسمت تھا جسے اس کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا تھا، یہ بھی ان مبارک ساعتوں میں جب پھٹے چھما ہے نانا جان مجھ سے بہت خوش ہو جاتے تھے۔ ان دل چسپ تصویروں کو دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہو جاتا تھا

ان میں سے کئی کی زندگی کے احوال مجھے معلوم تھے۔ لیکن سب سے زیادہ میں حضرت الکسی رحمت اللہ علیہ کی عزت کرتا تھا اور ان سے منسوب قطعات بھی مجھے پسند تھے۔ نانا اکثر بڑے احترام سے انھیں مجھے سُنایا کرتا تھا۔ ایسے ایسے سیکڑوں بندے گزر چکے ہیں اور یہ خیال تسکین کو کیا کم تھا کہ ان سب نے جامِ شہادت پیا ہے!۔

لیکن اس وقت میں نے اس جنتری کو پھاڑ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب نانا کھڑکی کے پاس جاکر ایک نیلا خریطہ پڑھنے لگا تو میں جنتری کے کئی ورق چُراکر نیچے بھاگ آیا اور نانی کی قینچی چپکے سے لے کر کوچ پر بیٹھ گیا اور ولیوں کے سر قلم کرنے لگا۔

جب میں ایک قطار کا کام تمام کرچکا تو یہ خیال آیا کہ ایسی اچھی جنتری کا ستیاناس نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ صرف خالی خانوں کو تراشنا چاہیے۔ ابھی میں نے اس نئے دستور پر عمل شروع کیا ہی تھا کہ نانا دروازہ پر برآمد ہُوا اور آواز دی:

"تجھے میری جنتری یہاں لانے کی اجازت کس نے دی؟"

میز پر کاغذ کے پھیلے ہوئے ٹکڑوں پر نظر پڑتے ہی وہ انھیں یکے بعد دیگرے اُٹھا اُٹھاکر سونگھنے لگا۔ اس کے جبڑے ہلنے لگے ڈاڑھی بل کھانے لگی اور اس نے ایسی پھنکار ماری کہ تراشے سارے کمرے میں بکھر گئے۔

"ارے تو نے یہ کیا کیا؟" بالآخر اس کے مُنہ سے یہ صدا نکلی اور اس نے ٹانگ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ میں سر کے بل گر پڑا۔ نانی

مجھے بچانے کو دوڑی تو نانا نے اس پر بھی دو ہتّڑ رسید کی اور چیخا کہ میں اس کا خون پی کر رہوں گا۔

اسی گھڑی امّاں اندر آئی اور میں بھاگ کر تندور کے کونے میں کھڑا ہوگیا۔ امّاں نے نانا کا ہاتھ پکڑ کر اسے الگ ڈھکیل دیا:

"آپ کی یہ حرکت بالکل نازیبا ہے! آپ ہوش میں ہیں یا نہیں؟"

نانا تخت پر لوٹ لوٹ کر بلبلانے لگا: "تم لوگ میری جان لے کر رہو گے۔ تم سب ایک ایک کرکے میرے دشمن ہو!"

میری ماں نے جواب دیا: "آپ کو شرم نہیں آتی۔ اس ڈھکوسلے بازی سے کیا فائدہ؟"

نانا نے چلّا کر بینچ کے لات ماری اور اس کی ڈاڑھی مضحکہ خیز انداز سے چھت کی طرف اٹھ گئی اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ وہ دراصل امّاں کے آگے شرما رہا ہے اور بن رہا ہے اور اسی لیے اس نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔

امّاں نے ان پھٹے ہوئے ورقوں اور تراشوں کو دیکھ رکھا:

"میں انھیں اطلس پر چپکا دوں گی اور یہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوجائیں گے۔ یہ پہلے سے پھٹے ہوئے تھے، ان میں کتنی شکنیں آگئی ہیں!"

جب کوئی سبق میری سمجھ میں نہ آتا تھا تو وہ عین اسی انداز سے مجھ سے گفتگو کرتی تھی۔ یہ سنتے ہی وہ کھڑا ہوگیا اور اپنے کپڑے ٹھیک کرکے بولا: "آج ہی ٹھیک کردینا۔ میں دوسرے ورق بھی لاتا ہوں۔"

وہ دروازے تک گیا وہاں رُک کر اور مجھے اُنگلی دکھاکر بولا "اس کی مرمّت ابھی باقی ہے"

امّاں نے میری طرف جھک کر کہا: "اس میں کوئی کسر نہ ہوگی۔ تونے یہ حرکت کیوں کی؟"

میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ اگر آیندہ اُنھوں نے نانی کے ہاتھ لگایا تو میں ان کی ڈارھی نوچ لوں گا"

نانی نے اپنی پھٹی ہوئی صدری اُتارتے ہوئے کہا:

"بھول گیا اپنا وعدہ" زمین پر تھوک کر وہ بولی "زیادہ بات کی تو تیری زبان جھڑجائے"

اماں ایک نظر اسے دیکھ کر پھر میرے قریب آئی:

"ابّا نے کس وجہ سے امّی کو مارا؟"

نانی کو اب غصّہ آگیا: "اری ورشکار بچّے سے ایسے سوال کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟۔ تجھے ان معاملوں سے کیا واسطہ؟"

امّاں نانی سے لپٹ گئی! "اری میری دُکھیا ماں!"

"چل ہٹ میرے پاس سے! تیری ماں کوئی اور ہوگی"

ایک دوسرے کو اُنھوں نے خاموشی سے دیکھا۔ ادھر نانا جان غلام گردش میں سٹرگشت کر رہے تھے۔

——— × ——— × ——— × ———

اپنی آمد کے چند روز بعد ہی امّاں نے اس ہنسوڑ سپاہی سے دوستی کر لی تھی ہر شام کو وہ اس کے کمرے میں جاتی تھی جہاں محلے کے افسروں اور حسین عورتوں کا مجمع رہتا تھا۔ نانا کو اس کی

یہ بات پسند نہ تھی۔ ایک روز باورچی خانے میں اس نے پنچ ہلاتے ہوئے یہ ڈانٹ بتائی: "بے حیا، آ گئی پھر اپنی اصلیت پر! رات بھر وہ اودھم چوکڑی رہتی ہے کہ سونا حرام ہو گیا ہے۔"

اس نے فوراً کرایے داروں کو نکال باہر کیا۔ جب وہ چلے گئے تو وہ کہیں سے دو چھکڑے بھر پرانا فرنیچر لایا اور اُن سے سامنے کے کمرے کو سجا کر اُسے بڑے سے تالے سے بند کر دیا۔

"کرایے داروں کی ضرورت نہیں۔ آیندہ میں خود لوگوں کو مدعو کیا کروں گا۔"

چنانچہ اتوار اور تیوہاروں کے موقعے پر مہمانوں کی بھیڑ رہنے لگی۔ نانی کی بہن بی متریانا جو ایک لڑاکا دھوبن تھی۔ اپنی چپٹی سی ناک لیے ہوئے پیش پیش ہوتی تھی۔ وہ بالوں میں سنہرا خضاب لگاتی اور دھاری دار ریشمی لباس پہنتی تھی۔ اس کے دونوں لڑکے بھی آتے تھے۔ نقشہ نویس واسلی جو جھبرا اور خوش مزاج تھا، سرتاپا بھورے کپڑے پہنتا تھا۔ وکٹر گویا اینڈر دھنش میں ملبوس ہوتا تھا۔ اس کا سر گھوڑے کا سا اور مُنھ تِلوں سے بھرا ہوا تھا۔ غلام گردش میں دستانے اُتارتے ہوئے بھی وہ نہایت بے سُری آواز میں کوئی دُھرپد الاپا کرتا تھا جسے سُن کر میں چونک پڑتا اور سہم جاتا تھا۔

ماموں جاکوف ستار لیے ہوئے آتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک گنجا گھڑی ساز ہوتا تھا جس کے طور طریقے ایسے سُگھڑ تھے کہ مجھے پادری کا خیال آجاتا تھا۔ ایک کونے میں ایک طرف سر ڈھلکا کر

وہ بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ مسکراتا اور اپنی مُنڈی ہوئی ٹھوڑی کو ناخون سے کریدتا رہتا تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور وہ ایک آنکھ سے عجیب انداز سے ہم سب کو گھورا کرتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور اس کا تکیہ کلام یہ تھا "تکلّف نہ کیجیے، کوئی بات نہیں"

پہلی مرتبہ اُسے دیکھتے ہی مجھے بے اختیار ایک پُرانے واقعہ کی یاد آئی۔ دروازے کے باہر نقارے پر چوب پڑ رہی تھی اور ایک گاڑی جسے پولیس والا اور سیاہ پوش لوگ گھیرے ہوئے تھے قید خانے سے نکل کر چوک کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی میں ایک منجھولے قد کا آدمی بڑا سا کنٹوپ پہنے بیٹھا تھا۔ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے پر ایک کالی تختی لٹک رہی تھی جس پر بڑے بڑے سفید حرفوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ غریب یوں سر جُھکائے ہوئے تھا گویا اس تحریر کو پڑھ رہا ہو۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور زنجیریں جھنجھنا رہی تھیں۔ لہذا جب اماں نے گھڑی ساز سے مجھے ملایا تو میں ڈر کے مارے ہٹ گیا اور ہاتھ پیچھے چھپا لیے۔

"کوئی بات نہیں" یہ کہہ کر اس نے کمربند پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور اِدھر اُدھر گھما کر چھوڑ دیا۔ اس کی باچھیں کھوپڑی کی طرح کھل گئیں اور اس نے کہا:

"مضبوط لڑکا ہے"

میں کونے میں جا کر اس آرام کرسی پر دراز ہوگیا جسے نانا جان

بڑے فخر سے کسی شہزادے سے منسوب کیا کرتے تھے۔ اس میں لیٹ کر میں سب کی حرکتوں کو دیکھنے اور سوچنے لگا کہ معمّر لوگوں کی ہنسی خوشی بھی کس قدر باعثِ کوفت ہوتی ہے۔ اس اثنا میں گھڑی ساز کا چہرا بھانت بھانت کے رنگ بدلتا جاتا تھا اور میری ہراس بڑھتی جاتی تھی۔

یہ چہرا بہت لچیلا اور چکنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پگھل رہا ہے اور آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ مسکرانے میں اس کے موٹے موٹے ہونٹ اور ذراسی ناک داہنے کلّوں میں گھس جاتی تھی اور گمان ہوتا تھا کہ برتن میں کوفتہ رکھا ہوا ہے! اس کے بڑے بڑے کان بھی حرکت کرتے تھے۔ ایک کان تو بھوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا اور دوسرا گال کی ہڈّی کے ساتھ ہلتا تھا۔ جب وہ چھینکتا تھا تو دونوں کان ناک کو یوں چھپا لیتے تھے گویا اس پر ہتھیلی رکھ دی گئی ہو۔ کبھی وہ گہری سانس لے کر اپنی جیب کو ہونٹوں کے ارد گرد اس خوبی سے گردش دیتا تھا کہ میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جاتی تھیں۔

مہمان چائے میں "رم" شراب ملاتے تھے جس سے جلی ہوئی پیاز کی سی بو آتی تھی۔ نانی کی بنائی ہوئی مختلف شرابوں کا دور چلنے لگتا تھا جن میں سے کوئی سونے کی طرح پیلی، کوئی تارکول کی طرح کالی اور کوئی سبز ہوتی تھی۔ وہ شہد، انڈے اور کیک بھی کھاتے تھے اور اس دوران میں سب پسینے میں شرابور ہوکر ہانپتے ہانپتے نانی کی تعریف کے پُل باندھ دیتے تھے۔ کھاپی کر

وہ دھرنا دے کر کرسیوں پر پڑ جاتے تھے اور اونگھتی ہوئی آواز میں جاکوف سے کچھ بجانے کی فرمایش کرتے تھے۔

وہ فوراً ستار بجا بجا کر یہ بیہودہ اور بے تُکا گیت گانے لگا:

چنگ بجے، مردنگ بجے، کچھ راگ رنگ کی باتیں ہوں

دھوم مچائی ایسی ہم نے

جاگ اُٹھے سب بھائی برادر

ایک رنڈی کو پیار کیا

ہم سب نے جامِ مے پی پی کر

کالی کالی راتوں میں کچھ راگ رنگ کی باتیں ہوں!

یہ گیت مجھے نہایت نامعقول معلوم ہوا اور نانی نے بھی ٹوکا: "لڑکے گانے کو ایک یہی چیز رہ گئی ہے؟ بہن تمھیں وہ گیت یاد ہیں جو ہم گایا کرتی تھیں؟"

اپنا لہنگا جھٹک کر بی دھوبن فرمانے لگیں: "بہن، ہر چیز کی طرح اب گیتوں کا فیشن بھی بدل گیا"

جاکوف نے آنکھ مل کر نانی کو یوں دیکھا گویا وہ سوگز کی دوری پر ہے اور پھر حسب سابق اپنی ٹیں ٹیں شروع کر دی۔

نانا گھڑی ساز سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔ گھڑی ساز بھوں اُٹھا کر اماں کی طرف دیکھتا تھا اور اس کا متحرک چہرا ایک عجیب و غریب انداز اختیار کر لیتا تھا۔

نانی ہمیشہ اپنے بھانجوں کے بیچ میں بیٹھتی تھی۔ وسلی سے بڑی سنجیدگی سے کچھ کہہ کر وہ آہ بھرتی تھی:

"ہاں —— اس معاملہ پر غور کرنا ہوگا"
وکٹر کسی اگھائے ہوئے کبوتر کی طرح مسکرا کر اپنے پانو پٹکنے لگتا تھا۔ اور یکایک زور شور سے وہی دُھرپد چھیڑ دیتا تھا:
"کالی بلی کبوتر کھا گئی رے!"
سب لوگ چونک کر دم بھر کے لیے چپ ہو گئے اور اس کی طرف گھورنے لگے۔ مگر دھوبن نے بڑے گھمنڈ سے یہ بات سمجھائی:
"اس نے ناٹک میں یہ گیت سیکھا ہے۔ وہاں سب لوگ یہی گاتے ہیں"
اس قسم کی دو تین شامیں گزریں اور ان کی تھکن اب تک میرے دماغ میں باقی ہے۔ اس کے بعد ایک اتوار کو وہ گھڑی ساز دن کے وقت نمودار ہوا۔ میں اماں کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھا ایک پھٹی ہوئی کوٹ کو سدھار رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور نانی حیران و پریشان اندر آئی اور "وار یا، وہ آگیا!" یہ کہہ کر فوراً غائب ہوگئی۔
اماں بُت بنی بیٹھی رہی۔ لیکن دروازہ دوبارہ کھلا اور چوکھٹ پر نانا کا بھوت نظر آیا: "بیٹی کپڑے پہن کر آجا!"
اس نے سر بھی نہ اُٹھایا: "کہاں چلنے کو کہہ رہے ہیں"
"لِلّٰہ ضد نہ کرو، آجاؤ۔ وہ بڑا نیک آدمی ہے اور خوش حال بھی ہے۔ وہ الکسی سے سگے باپ کا سا سلوک کرے گا"
خلافِ معمول وہ بڑے رُعب داب سے باتیں کر رہا تھا اور اپنے سینے پر ہتھیلی سے طبلہ سا بجا رہا تھا۔ لیکن اس کی

کہنیاں کانپ رہی تھیں گویا اس کے ہاتھ زبردستی آگے پھیلنے کو مچل رہے تھے۔
امّاں نے اپنے فطری صابرانہ انداز میں کہا: "کہہ دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔"
نانا یوں ہاتھ پھیلائے ہوئے اس کے قریب آیا گویا اندھا ہو گیا ہے اور غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:
"آتی ہے یا نہیں ــــ ورنہ بال پکڑ کر کھینچ لے جاؤں گا۔" امّاں نے سُن کر کہا: "مجھے کھینچ لے جاؤ گے، ایں؟" اس کے چہرے پر مُردنی چھاگئی۔ اس نے اپنی کرتی اور سایہ اُتار پھینکا۔ جب اس کے تن پر صرف زیر جامہ رہ گیا تو اس نے للکارا:
"چلو اب میں تیّار ہوں۔"
نانا دانت پیس کر اُسے مکّا دکھانے لگا: "دا رنگا، پھر کہتا ہوں کہ کپڑے پہن لے۔"
امّاں اُسے دھکّا دے کر دروازے تک گئی: "کیوں آتے کیوں نہیں؟"
نانا نے چیخ کر کہا: "تجھ پر خدا کی لعنت!"
"مجھے کس کی پروا ہے ــــ آؤ نا اب!"
اس نے دروازہ پورا کھول دیا مگر نانا نے زیر جامہ پکڑ کر اسے روکا اور گھٹنوں کے بل گر پڑا۔
"اری چڑیل تو ہمیں غارت کرکے رہے گی۔ تیری شرم و حیا کو کیا ہوا؟" اور وہ بکرے کی طرح منمنانے لگا: "بڑی بی!"

نانی، امّاں کی راہ روک کر کھڑی ہو گئی اور اسے یوں کھدیڑنے لگی گویا وہ مرغی ہو۔ وہ یوں سسکارنے لگی:

"دُر شکا، تجھے کیا ہو گیا ہے۔ دیوانی کہیں کی، ہٹ، منہ کالا کر۔"

اسے کمرے کے اندر کر کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر نانا کو ایک ہاتھ کا سہارا دے کر اور دوسرے سے دھکا دے کر وہ بولی:

"ارے بُڈّھے کھوسٹ!"

نانی نے اُسے کوچ پر پٹک دیا اور وہ روئی کے گُڈّے کی طرح مُنہ کھولے اور سر ہلاتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا۔

نانی نے کڑک کر امّاں سے کہا: "کپڑے پہنتی ہے یا نہیں؟"

زمین سے کپڑے اُٹھا کر امّاں نے کہا: "لیکن میں کہہ چکی کہ میں ہرگز اس کے پاس نہ جاؤں گی!"

نانی نے مجھے کوچ سے اُٹھا کر کہا: "دوڑ کر بالٹی بھر پانی لے آ!"

میں غلام گردش کی جانب جھپٹا۔ دیوان خانے میں ایک گت سے کسی کا جوتا چرچرا رہا تھا۔ اِدھر امّاں کی آواز سُنائی دی:

"کل میں اس گھر کو چھوڑ دوں گی!"

میں باورچی خانے میں جا کر محویت کے عالم میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

نانا کراہنے لگا، نانی بڑبڑانے لگی۔ پھر کوئی دروازہ بند ہوا اور ہر طرف موت کا سا سنّاٹا چھا گیا۔

اتنے میں مجھے ہوش آیا اور میں لوٹا بھر پانی لے کر غلام گردش کی طرف گیا۔ دیوان خانے سے کھڑنی ساز باہر نکلا۔

ہتھیلی سے اپنے کنٹوپ کو سہلاتے ہوئے وہ خود بخود کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ نانی ہاتھ باندھے ہوئے اُس کے پیچھے کھڑی خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہی تھی: "آپ خود خیال کیجیے —— محبّت زبردستی نہیں کی جاتی۔"

وہ چوکھٹ پر ایک لمحہ رُک کر آنگن میں نکل گیا۔ نانی کے جسم میں لرزہ آگیا اور وہ صلیب کے نشان بناتی ہوئی اس دُبدھا میں پڑگئی کہ ہنسے یا روئے۔ لپک کر میں نے پوچھا:

"نانی کیا بات ہوئی؟"

اُس نے لوٹا چھین لیا اور پانی اُس کے پیروں پر اچھل پڑا:

"ارے سر پھرے، تو یہاں پانی لینے آیا ہے۔ بند کردے دروازہ!"

وہ امّاں کے کمرے میں چلی گئی اور میں نے باورچی خانے سے سُنا کہ وہ دونوں یوں ہانپ رہی ہیں جیسے بہت بڑا بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ سرکا رہی ہیں۔

× —— × —— × ——

بڑا سُہانا دن تھا۔ برف پوش شیشوں سے سورج کی ترچھی کرنیں اندر جھانک رہی تھیں۔ میز پر کھانے کے برتن چُنے ہوئے تھے۔ دو ساغروں میں شراب جھلک رہی تھی۔ چھتوں اور دیواروں پر برف کی چادر کسی چاندی کے سمندر کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ پنجروں میں میرے پرندے دھوپ میں نہا رہے تھے اور بھانت بھانت کی کلولیں کر رہے تھے۔

لیکن ایسا حسین و جمیل دن جس میں ہر آواز گیت معلوم ہو رہی تھی، میرے دل کو خوش نہ کرسکا۔ ہر چیز مجھے بے موقع و بے محل معلوم ہو رہی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ اپنے پرندوں کو آزاد کردوں۔ اس خیال سے میں پنجروں کے پاس گیا ہی تھا کہ نانی چوتڑ پیٹتی ہوئی اندر دوڑی اور تندور کے پاس جاکر آپ اپنے کو کوسنے لگی:

"ارے اکولینا، تجھ پر ہزار پھٹکار! پاگل کہیں کی!"

تندور سے دم پخت نکال کر اس نے انگلی سے چھوا اور غصے کے مارے تھوک دیا: "کم بخت اکڑ کر پتھر ہوگیا!۔ توبہ آج مجھے کیا ہوگیا ہے۔ اری چڑیل، تیری عقل چرنے گئی ہے یا آنکھیں پٹ ہوگئی ہیں۔۔۔ ہائے اللہ اب کیا کروں؟"

دم پخت کو پھونکتے ہوئے وہ رونے لگی اور جب اسے ادھر ادھر لوٹانے لگی تو اس پر اس کے آنسو ٹپا ٹپ گرنے لگے۔

جب اماں اور نانا باورچی خانے میں آئے تو نانی نے میز پر جلا ہوا مرغ اس زور سے ٹپکا کہ تمام برتن اچھل پڑے۔

"دیکھ لو اپنے کرتوت۔۔۔ سارا گوشت جل کر کوئلا ہوگیا!"

مگر اماں کی مسرت اور اطمینان میں فرق نہ آیا۔ اس نے نانی کو پیار کرکے کہا کہ دل برداشتہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نانا پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میز پر بیٹھ کر دست پاک کھولتے ہوئے وہ آنکھیں جھپکانے لگا جو دھوپ کے مارے چندھیا گئی تھیں: "کوئی بات نہیں۔ سیکڑوں بار اچھے سے اچھا دم پخت

کھایا ایک بار جل گیا تو کیا ہُوا...... خدا۔ لاکھ مرتبہ زرا زرا سی تکلیف دیتا ہی لیکن ایک بار رحمت کی ایسی بارش کرتا ہی کہ گھر آنگن نہال ہو جاتے ہیں۔ ورشکا، آؤ بیٹھو...... مارو گولی"

وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگا اور متواتر خدا و ابلیس کا ذکر کرتا رہا۔ وہ شکایت کرنے لگا کہ اباؤں کی زندگی بھی کیسی اجیرن ہی۔ آخرش نانی نے ڈانٹ کر کہا:

"اگر تم چُپکے سے کھانا کھاؤ تو خدا پر بڑی مہربانی ہوگی!" امّاں برابر ٹھٹھول کر رہی تھی اور اُس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مجھے دھکّا دے کر بولی:" تو ابھی ڈر کیوں گیا تھا؟"

تب تو نہیں لیکن اب در اصل میں کچھ بے چینی اور بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ ہر تیوہار اور اتوار کی طرح آج بھی خورد نوش کا سلسلہ دیر تک جاری رہا اور مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو دم بھر پہلے ایک دوسرے پر دیدے نکال رہے تھے اور شکوہ و فریاد سے گھر سر پہ اُٹھا رہے تھے۔ یعنی مجھے یقین نہ آیا کہ ان کی یہ خوشی سچّی ہی اور وہ از سر نو رونا پیٹنا نہ شروع کر دیں گے۔ لیکن وہ اکثر اسی طرح لڑ جھگڑ اور رو پیٹ کر پھر آپس میں مل جاتے تھے اور میں رفتہ رفتہ ان منظروں کا ایسا عادی ہو گیا کہ اس کا مجھ پر مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔

بہت دنوں بعد مجھے خبر ہوئی کہ روسی لوگوں کی زندگی ایسی غربت اور جہالت میں بسر ہوتی ہی کہ غم ان کی تفریح کا ایک بہانا ہو جاتا ہی۔ وہ رنج و محن سے بچّوں کی طرح کھیلتے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ کام سے تھک کر وہ بدنصیبی کے تکیے پر آرام کرتے ہیں۔ آگ ان کے لیے کھلونا ہی۔ اور زخم ان کے جسم کا زیور۔

# باب ۱۱

اس واقعہ کے بعد امّاں نے یک بیک ایسا رعب جمایا، ایسی دھاک باندھی کہ وہ گھر کی مالکن بن بیٹھی اور نانا جو خلاف فطرت متفکر اور خاموش رہنے لگا تھا، اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھا۔

اب وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتا تھا دن بھر اپنی کوٹھڑی میں گھسے ہوئے چھپ چھپ کر ایک کتاب پڑھا کرتا تھا جس کا نام تھا: "آسمانی باپ کی تحریریں"۔ اس کتاب کو وہ صندوق میں بند رکھتا تھا اور ایک بار میں نے دیکھا کہ اسے نکالتے ہوئے وضو کر رہا ہے۔ اس موٹی سی کتاب پر سُرخ جلد چڑھی ہوئی تھی۔ نیلے سرورق پر رنگ برنگی روشنائیوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "وسیلی کشرن کو — نذر خلوص و محبت"۔ اس کے نیچے عجیب سا نام لکھا تھا اور جلد کے اوپر ایک اُڑتے ہوئے پرندے کی تصویر تھی۔

میں نے کئی بار پوچھا کہ وہ کون سی کتاب ہے۔ لیکن نانا نے ہمیشہ نہایت پُر اسرار انداز میں ایک ہی جواب دیا: "ٹھہر جا . . . . انتظار کر۔ میرے بعد یہ تجھے ہی ملے گی۔ اور تیرے لیے میں وہ چمڑے کی جاکٹ بھی چھوڑ جاؤں گا"۔

امّاں سے اب وہ ملائمت سے بات کرتا تھا گو بہت کم اس کی

گفتگو کو وہ غور سے سُنتا تھا اور اس کی آنکھیں پیٹر کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتی تھیں اسے الگ ہٹا کر وہ بڑبڑانے لگتا تھا:

"اچھا، بہت ہوا۔ تو تو آپ اپنی مختار ہے، جو جی چاہے کرے۔"

نانا کے اس صندوق میں بہت خوبصورت کپڑے رکھے ہوئے تھے - ریشمی لہنگے، ساٹن کی صدریاں، زردوزی کے کام کے لبادے، موتی جڑے ہوئے سرپوش، رنگین رومال اور رنگ برنگ کے ہار۔ ایک روز وہ ان سب کو لے کر ہانپتے ہوئے اماں کے کمرے میں گیا ۔اماں کپڑوں کے پیچھے دیوانی تھی — اور انھیں میزوں اور کرسیوں پر ٹھیک کر کہا:

"ہمارے زمانے میں کپڑے اب سے زیادہ امیرانہ اور خوبصورت ہوتے تھے۔اب وہ دن گئے اور کبھی نہ آئیں گے —لو، یہ تمھارے لیے ہیں، انھیں اپنے مصرف میں لاؤ۔"

ایک دن اماں زردوزی کا لبادہ اور موتیوں کا سرپوش پہنے ہوئے نانا کے آگے آئی اور جھک کر آداب بجا لائی:

"آسمانی باپ، یہ لباس آپ کو پسند آیا؟"

نانا کا چہرا کھِل گیا اور اس کے اردگرد جاکر دھیمی آواز میں بولا گویا وہ خواب میں بڑبڑا رہا تھا: "اوہو... ورشکا!... اگر تو امیر ہوتی تو بڑے بڑے تیرے آگے پانی بھرتے۔

اماں اب سامنے کے دونوں کمروں میں رہتی تھی اور اس سے ملنے کو بہتیرے مہمانوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ اکثر آنے والوں میں دونوں میکسموف برادران تھے: پیٹر ایک گٹھیلا، سجیلا افسر تھا جس کی آنکھیں نیلی اور ڈاڑھی گھنیری تھی۔ یہ وہی تھا جس کے سامنے نانا نے ایک بوڑھے

کی چندیا پر تھوکنے کے جرم میں مجھے پیٹا تھا۔ دوسرا بھائی یوجین، اونچا اور دُبلا تھا۔ اس کا چہرا پیلا اور داڑھی چھوٹی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بادام کی سی تھیں۔ وہ ایک سبز کوٹ پہنتا تھا جس میں سونے کے بٹن ٹنکے تھے اور جس کے کاندھوں پر سنہرے فیتے لگے تھے۔ وہ اپنے سر کو جنبش دے کر گھنگھرالی لٹوں کو ماتھے پر سے ہٹا کر پیچھے پھینک دیتا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں لطافت کا پہلو ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کوئی قصّہ سُناتا تو سب سے پہلے یہ جملے کہتا:

"آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟"

اس کی باتیں سُنتے وقت امّاں کی آنکھیں ہنسنے لگتی تھیں اور وہ اکثر بات کاٹ کر کھکھلا پڑتی تھی: "یوجین صاحب، معاف کیجیے گا، ابھی آپ بچّے ہیں۔" اور وہ افسر ران پر ہاتھ مار کر کہہ اُٹھتا تھا:

"جی ہاں، ابھی دودھ پیتے ہیں!"

بڑے دن کی چھٹیوں میں بڑی دھوم دھام رہتی تھی۔ لوگ زرق برق لباس پہنے امّاں سے ملنے آتے تھے۔ وہ خود جو پوشاک پہنتی وہ ان سب سے بہتر ہوتی تھی اور وہ مہمانوں کے ساتھ سیر کو جایا کرتی تھی۔

جب کبھی وہ ان رنگیلے مہمانوں کے ساتھ چلی جاتی تو گھر میں موت کا سا سنّاٹا چھا جاتا تھا۔ ہر طرف قبر کی سی خاموشی پھیل جاتی تھی۔ نانی کسی بوڑھی بطخ کی طرح کمرا ٹھیک کرنے لگتی تھی۔ نانا گرم تندور سے پیٹھ لگا کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا تھا: "ہوں.... ہوں.... ٹھیک ہے! دیکھنا ہے کہ گھرانے کا ـــــ"

بڑے دن کے بعد امّاں نے مجھے اور ماموں مائیکل کے بیٹے ساشا

کو اسکول بھیج دیا۔ ساشا کے باپ نے نئی شادی رچالی تھی اور سوتیلی ماں نے قدم رکھتے ہی اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ، نانی کی منت سماجت پر نانا اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ ہم مہینے بھر اسکول گئے اور اس مدت میں میرے پلے صرف یہ پڑا کہ اگر میرا خاندانی نام پوچھا جائے تو بجائے "پیشکوف" کہنے کے مجھے پورا جملہ کہنا چاہیے: "خاکسار کو پیشکوف کہتے ہیں!" اور مجھے اُستاد سے یہ نہ کہنا چاہیے کہ "بڑے میاں" یوں آنکھیں نہ دکھائیے۔ آپ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے!"

پہلے تو مجھے اسکول بالکل نہ بھایا۔ اس کے برعکس ساشا کا جی وہاں بہت بہلا اور اس نے سب سے دوستی پیدا کر لی۔ مگر ایک روز سبق کے دوران میں اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند میں چلّا اٹھا:

"میں یہ نہ کروں گا!"

وہ چونک پڑا اور بے کہے سُنے کلاس سے بھاگ گیا۔ سب لوگ اس کی اس حرکت پر بہت ہنسے۔ دوسرے دن اسکول کے قریب وہ رُک گیا اور بولا: "تم جاؤ ——— میں نہ آؤں گا — میں تو آج چھٹی مناؤں گا۔"

وہ پالتی مار کر بیٹھ گیا اور برف کے اندر بستہ چھپا کر چلتا ہوا۔ آسمان دمک رہا تھا اور ہر طرف دھوپ ہی دھوپ تھی۔ میرا بھی جی بہت مچلا مگر میں پتّا مار کر اسکول چلا ہی گیا کیوں کہ امّاں کو میں ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔ ساشا کی وہ کتابیں پھر نہ ملیں اور اس بہانے اس نے دوسرے دن بھی چھٹی منائی۔ مگر تیسرے دن اس کی غیر حاضری کی رپورٹ نانا جان کو ملی۔ ہم دونوں کی طلبی ہوئی۔ نانا نانی اور

امّاں باورچی خانے کی میز پر ہم دونوں سے جرح کرنے لگے۔ مجھے ساشا کے پُر لطف جواب کبھی نہ بھولیں گے۔

"تو اسکول سے کیوں بھاگا؟"

"مجھے اُس کا راستہ یاد نہ رہا۔"

"کیا کہا؟"

"واقعی میں راستہ بھول گیا۔ بہت ڈھونڈا ــــ"

"لیکن الکسی تیرے ساتھ تھا۔ اسے تو راستہ یاد تھا۔"

"لیکن اس سے میرا ساتھ چھوٹ گیا۔"

"یہ کیسے؟"

پل بھر سوچ کر ساشا نے کہا: "وہ برفانی طوفان تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔"

اس پر سب مسکرا پڑے اور میری جان میں جان آئی۔ ساشا نے بھی ڈرتے ڈرتے دانت نکال دیے۔ لیکن نانا نے تیوری چڑھاکر پوچھا: "لیکن تو نے الکسی کا ہاتھ کیوں نہ پکڑا؟"

"پکڑا تو تھا لیکن ہوا کا وہ جھونکا آیا کہ ــــ"

وہ سُست اور دھیمی آواز میں بول رہا تھا اور اس کی اس دیدہ دلیری اور سفید جھوٹ کو سُن کر میں دنگ رہ گیا۔

ہم دونوں کی خوب ٹھکائی ہوئی اور ایک کُنجا آگ بُجھیّا اس خدمت پر معمور ہوا کہ ہمیں اسکول لے جائے اور ساشا کو علم کی راہ سے نہ بھٹکنے دے۔ لیکن یہ تدبیر بھی لاحاصل ثابت ہوئی۔ دوسرے دن پُلیا کے پاس پہنچتے ہی ساشا ٹھٹک گیا۔ اس نے ایک جوتا

اِدھر اور دوسرا اُدھر پھینک دیا اور ننگے پانْو بگ ٹُٹ بھاگ گیا۔ بیچارے بوڑھے سے کچھ نہ بن پڑا اور وہ دونوں جوتے لیے ہوئے ہانپتے کانپتے میرے ساتھ گھر لوٹ آیا۔

نانا، نانی اور امّاں دن بھر اس بھگوڑے کو شہر بھر میں ڈھونڈتے پھرے۔ شام کو وہ شراب کی ایک بھٹّی میں ناچتا ہوا ملا۔ وہ لوگ اسے گھر پکڑ لائے، مگر اس گُھنّے اور ہٹّی لڑکے کی مرمّت بیکار تھی۔ تندور پر میرے پاس اس طرح لیٹے ہوتے کہ اس کی ٹانگیں چھت پر اٹکی ہوئی تھیں، اس نے آہستہ سے کہا: "دنیا میں کوئی مجھ سے محبّت نہیں کرتا — نہ ابّا، نہ سوتیلی ماں اور نہ نانا۔ پھر میں اُن کے ساتھ کیوں رہوں؟ میں نانی سے ڈاکوؤں کا پتا پوچھوں گا اور اُنھیں کے پاس چلا جاؤں گا۔ ....... تب تم سب کو ہوش آئے گا... تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں بھاگ چلتے؟"

یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ کیوں کہ ان دنوں میں بہت مصروف تھا — میں نے افسر بننے کا فیصلہ کر لیا تھا، گھنی ڈاڑھی والا افسر — اور اس کے لیے تعلیم ازبس ضروری تھی۔ جب میں نے ساشا کو یہ بات بتائی تو وہ بھی سوچ بچار کے بعد میرا ہم خیال ہو گیا۔

"اچھا خیال ہے۔ جب تک تم افسر بنوگے میں ڈاکوؤں کا سردار ہو جاؤں گا۔ اگر تم مجھے پکڑنے آئے تو یا تو دونوں میں سے ایک کی جان جائے گی یا وہ قید ہوگا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمھیں قتل نہ کروں گا۔"

"میں بھی تمھاری جان نہ لوں گا۔"

اس معاملے میں ہم میں اختلاف نہ تھا۔

اتنے میں نانی تندور پر چڑھ آئی اور ہم دونوں کو دیکھ کر کہا:
"کیوں رے چپ ہو؟ ایں! — اللہ کے دُلارے بیٹو! —"

یوں ہم پر رحم جتا کر اس نے ساشا کی سوتیلی ماں کو خوب کوسا جو ایک بھٹیاری کی بیٹی تھی۔ جوش میں آکر اس نے سب سوتیلی ماؤں کو کوسنا شروع کیا اور ہمیں حضرت ایونا ولی اللہ اور ان کی سوتیلی ماں کا قصّہ سنایا۔ ان کا باپ ایک ماہی گیر تھا:

"یہ عورت در اصل ایک چڑیل تھی۔ اس نے بھانت بھانت کی زہریلی جڑی بوٹیوں کی شراب بنائی اور جنتر منتر پھونک کر اسے اپنے شوہر کو پلا دیا۔ جب وہ ابد کی نیند سو گیا تو اس نے اُسے پانی میں ڈال دیا اور بال کھول کر سینہ پیٹنے لگی کہ ہے ہے! میرا سہاگ لُٹ گیا، میرا گھر اُجڑ گیا! — یہ ماتم سُن کر پڑوسی دوڑے اور جادوگرنی کو دلاسا دینے لگے کہ خدا تجھے تیری وفا کا صِلہ دے گا۔ سب کو یقین آگیا کہ ماہی گیر بھنور میں پھنس کر ڈوب مرا۔ مگر اس کے بیٹے ایونا، کو اس چڑیل کی باتوں پر اعتبار نہ ہُوا۔ اس نے للکار کر کہا کہ اری فریب کار، دغا باز! دیکھ، ابھی میرا خدا تیرا بھرم کھولتا ہے۔ کوئی شخص چھُری اوپر اُچھالے، اگر تو بے گناہ ہے تو چھُری مجھے لگے اور اگر تو قاتل ہے تو اپنی سزا کو پہنچے۔ یہ سُن کر سب تماشائی گُم سُم رہ گئے۔ مگر ایک گیانی نے ہمّت باندھ کر اس کے کہے پر عمل کیا اور چھُری آسمان کی طرف اُچھالی۔ دیر تک یہ چھُری ہوا میں پیچ و

تاب کھاتی رہی اور پھر یک بیک نیچے آکر جادوگرنی کے کلیجے میں دھنس گئی۔

یہ دیکھ کر سب نے اس ننھے ولی کا جی جی کار کیا اور اس کے لیے پہاڑ میں ایک حجرہ بنایا جہاں اس نے مرتے دم تک عبادت کی'

اس واقعہ کے دوسرے دن میں نیند سے جاگا تو میرے جسم بھر میں لال چتیاں اُبھر آئی تھیں۔ یہ چیچک کا آغاز تھا۔

میں پچھواڑے کی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا اور وہاں کئی روز بے حرکت پڑا رہا۔ کیوں کہ میرے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ دیے گئے تھے۔ ہر رات کو بھیانک سپنے دکھائی دیتے تھے اور ان میں سے ایک میں تو میں مر ہی گیا۔ نانی کے سوا کوئی میرے پاس نہ آتا تھا وہ مجھے چمچے سے کھلاتی تھی اور ہر روز اپنے بے پایاں ذخیرے سے ایک نئی داستان لے کر آتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں بحال ہونے لگا۔ ایک شام کو میں نانی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کیوں کہ یہ اس کے آنے کا وقت تھا۔ میرے جسم کے بندھن کھل گئے تھے۔ بجز ہاتھ کے تاکہ میں اپنا منھ نہ کھجا ڈالوں۔ نانی کی تاخیر مجھے سراسیمہ کر رہی تھی کہ اچانک اس پر میری نظر پڑی وہ دروازے کے باہر زمین پر منھ کے بل پڑی ہوئی تھی اور چھجا پیڑ کی طرح اس کی آدھی گردن ایک گڑھے میں دھنس گئی تھی۔ شفق کے دھندلکے میں میں نے ایک بلّے کو دیکھا جو اپنی للچائی ہوئی ہری آنکھوں سے اُسے تاکتا ہوا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں پلنگ سے یوں ہڑبڑا کر باہر آنگن میں برف کی

نالی میں کودا کہ میرے ہاتھ پانو کھڑکی کے شیشے سے کٹ گئے۔
اُس روز اماں کے یہاں بہت سے مہمان آئے تھے اس لیے
کسی نے کھڑکی ٹوٹنے کی آواز نہ سُنی۔ مجھے کچھ دیر برف میں یوں
ہی پڑا رہنا پڑا۔ کوئی ہڈی تو نہ ٹوٹی تھی مگر میرا شانہ اُتر گیا تھا
جسم بھر میں کانچ کی کرچیں اُتر گئی تھیں اور ٹانگیں بھی بیکار ہو گئی
تھیں۔ چنانچہ تین مہینے تک میں اپاہج بنا صاحبِ فراش رہا۔
بے حرکت پڑے پڑے میں محسوس کرتا تھا کہ مکان بہت شور فشاں
ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم ہی
نہیں ہوتا اور دروازے ہمیشہ کھلتے بند ہوتے رہتے تھے۔

ہماری چھت پر برفانی طوفان شور مچاتے تھے۔ دروازے کے
باہر ہوا کے جھکڑ سنسناتے تھے اور چمنی کے اندر کوئی اس جوش
سے نوحہ سُناتا تھا کہ دیواریں کانپ جاتی تھیں۔ دن کو کوّے کائیں
کائیں کرتے تھے اور رات کو بھیڑیوں کی ہولناک دہاڑ سُنائی
دیتی تھی۔ یہ تھی وہ موسیقی جس میں میرے دل کو نشو و نما ملی۔ پھر
وہ دن بھی آئے جب مارچ کے سورج کی تابانی کے ساتھ بہار نے
شرماتے شرماتے دالان میں جھانکا۔ بلّیاں ہر طرف شادمانی کے
نعرے بلند کرنے لگیں۔ بہار کی انی دیوار کے ایک ایک پتھر میں
جا چبھی۔ سنگین برف ریزے بھی پانی ہو کر بہ گئے۔ اور گرجا کے
گھنٹوں کی آواز اب ویسی صاف نہ رہی جیسی جاڑوں میں تھی۔

اب نانی جب کبھی میرے پاس آتی تو اس کی تقریر ووڈکا
شراب کی بو میں بسی ہوتی تھی۔ یہ بو روز بروز تیز ہوتی گئی،

اس حد تک کہ وہ ایک بڑی سی کیتلی لاکر میرے پلنگ کے نیچے چھپا دیتی اور منت کرتی:

"بیٹے اپنے نانا سے نہ کہیو۔ اچھا؟"

"لیکن تم شراب کیوں پیتی ہو؟"

"اس سے تجھے کیا بحث؟ ان باتوں کو تو بڑا ہوکر سمجھ سکے گا:

کیتلی کھول کر، اپنے ہونٹوں کو آستین سے پونچھتی ہوئی وہ بڑے مزے میں مسکرانے لگی:

"کیوں چھوٹے صاحب، آج میں تمھیں کیا سناؤں؟"

"میرے ابّا کا حال سناؤ۔"

"کس جگہ سے؟"

جب میں نے یاد دلایا تو اُس کی داستان کسی گنگناتے ہوئے جھرنے کی طرح بہنے لگی۔

ایک روز وہ تھکی ہاری سی آئی تھی اور ذیل کی تمہید کے بعد خود بخود ابّا کے حالات سنانے لگی تھی:

"تیرے باپ کو میں نے خواب میں دیکھا۔ وہ سیٹی بجاتے ہوئے کھیتوں میں ٹہل رہا تھا اور ایک کتّا زبان نکالے ہوتے اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس کے بعد میں عموماً ہر شب کو اُسے سپنے میں دیکھتی ہوں .... اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اس کی روح بے قرار ہے۔"

متواتر کئی شاموں تک وہ مجھے ابّا کے قصّے سُناتی رہی جو اس کی دوسری کہانیوں سے کم دل چسپ نہ تھے۔

میرا باپ ایک سپاہی کا بیٹا تھا۔ یہ سپاہی ترقی پاکر افسر بن گیا مگر اپنے ماتحتوں پر ظلم کرنے کے جرم میں حبس دوام کی سزا پاکر سائبیریا چلا گیا۔ وہیں میرے باپ کا جنم ہوا۔ اس کی ساری زندگی مصیبتوں میں بسر ہوئی۔ بچپن ہی میں اُسے گھر سے بھاگنے کی عادت پڑ گئی۔ ایک بار دادا نے اسے پکڑنے کے پے جنگل میں کتّے پیچھے لگا دیے۔ دوسری مرتبہ اسے اس بے دردی سے پیٹا کہ پڑوسیوں کو بیچ بچاؤ کرکے اُسے چھپا دینا پڑا۔

میں نے پوچھا: "کیا بچے ہمیشہ سے پٹتے آئے ہیں؟"

جواب ملا: "ہاں ہمیشہ سے"

دادی تو ابّا کے بچپن ہی میں مر گئی تھیں۔ اب جو وہ نو سال کے ہوئے تو دادا بھی چل بسے۔ ایک صلیب ساز نے اس یتیم کو گود لیا اور اپنا ہنر سکھانا شروع کیا۔ مگر ابّا وہاں سے بھی فرار ہو گئے۔ اور میلوں میں اندھوں کی رہبری کرکے اپنا پیٹ پالنے لگے۔ سولہ سال کی عمر میں وہ نجنی آکر اگن بوٹوں کے ایک مستری کے ہاں کام کرنے لگے اور بیس سال کے بھی نہ ہوتے تھے کہ بڑھئی گری اور آرائش کاری کے اُستاد ہو گئے۔ ان کا کارخانہ نانا کے پڑوس میں تھا۔

نانی نے قہقہہ لگا کر کہا: "دیواریں اونچی نہ تھیں اور کچھ لوگ تاک جھانک میں ایک ہی مشّاق تھے۔ ایک روز میں اپنی بیٹی کے ساتھ باغ میں بیر توڑ رہی تھی کہ تیرے باپ پر نظر پڑی جو دیوار پھاند رہا تھا۔۔۔۔ میں تو پہلے ہکّی بکّی رہ گئی۔ لیکن یہ

گبرو جوان ننگے پانو ننگے سر سفید قمیص اور پتلون پہنے سیب کے جھُرمٹ کی طرف بڑھا۔ یوں ان لوگوں میں محبّت شروع ہوئی۔ جب اسے میں نے پہلے پہل دیکھا تھا تو دل نے کہا کہ کیسا اچھا لڑکا ہی! اب وہ جو میرے روبرو آکھڑا ہُوا تو میں نے گھُڑکی بتائی:

"کیوں جی، تم پرائے باغ میں پھاندنے والے کون ہوتے ہو؟"

وہ گھٹنوں کے بل میرے سامنے گر پڑا: "بڑی بی، میں کیا کروں ... میں ورشکا کی محبّت کا مارا ہُوا ہوں۔ خدا را ہم پہ رحم کھاؤ اور ہماری شادی کرا دو۔"

یہ سُن کر میری تو گھگھّی بندھ گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو تیری ماں پیڑ کی آڑ میں لاج کی ماری کھڑی اُسے سینیاں دے رہی تھی۔ مگر ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تیر رہے تھے۔

میں نے چلّا کر کہا: "ارے بدمعاشو! تم دونوں نے یہ کیا پاکھنڈ رچایا ہی! اری ورشکا، تیرے اوسان تو خطا نہیں ہوگئے ... ارے لڑکے، تجھے کیا سوجھی ہی، کیا تو زور دکھانا چاہتا ہی؟"

اس زمانے میں تیرے نانا مالدار تھے۔ اپنے بیٹوں کو انھوں نے حصّہ نہ دیا تھا۔ چار چار مکان اور نقدی الگ۔ ان کے حوصلے بھی بہت بلند تھے۔ حال ہی میں برادری کی طرف سے انھیں وردی اور تمغہ ملا تھا کیوں کہ لگاتار نو سال تک اُنھوں نے چودھری کے فرایض ادا کیے تھے۔ لہذا ان کے مزاج ہی نہ ملتے تھے

میں نے انھیں ہر طرح ڈانٹا ڈپٹا، سمجھایا بجھایا، لیکن دل ہی دل میں ان پر بہت ترس آیا کیوں کہ وہ دونوں بہت مایوس ہو گئے تھے۔ آخر میرے باپ نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ بڑے میاں خوشی خوشی مجھے داماد نہیں بنائیں گے، اس لیے میں اُسے اُڑا لے جاؤں گا۔ اس میں آپ میری مدد کیجیے۔"

سُنی اس پگلے کی باتیں! مجھے بہت ہنسی آئی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہنے لگا: "چاہو تو مارو یا جلاؤ۔ میں اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا۔"

اتنے میں ورشکا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: شادی کے منصوبے باندھتے باندھتے ہم نے کتنی دیر کر دی — مئی میں ہی نکاح ہو جاتا تو کیسا اچھا تھا۔"

ایں ...... یہ کیسے ...... اوہ میرے اللہ!"

اتنا کہہ کر نانی ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ پھر ناس سونگھ کر آنکھیں پونچھتے ہوئے اُس نے اطمینان کی سانس لی: "تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں...... تو کیا جانے کہ شادی کیا بلا ہے... لیکن یہ یاد رکھ کہ شادی کے پہلے کسی لڑکی کا ماں بننا سب سے بڑی آفت ہے۔ بڑے ہو کر خبردار جو کسی لڑکی کو اس ڈھرے پر لایا۔ تیرا تو منہ کالا ہوگا ہی، وہ لڑکی دین و دنیا کہیں کی نہ رہے گی اور بچّہ حرامی کہلائے گا۔ میری بات کو گرہ باندھ کر رکھ لے! عورتوں سے مہربانی سے پیش آنا اور ان سے اپنے عیش کے لیے نہیں بلکہ اُن کی ذات کی

خاطر محبت کرنا۔ میری نصیحت کو نہ بھولنا۔"

چند لمحوں کے لیے وہ کسی خیال میں ڈوب گئی۔ پھر چونک کر اپنا قصہ سنانے لگی: "اس صورت میں کیا ہو سکتا تھا؟ میں نے تیرے باپ کے ایک تھپڑ لگایا اور ورشکا کی بھی گوشمالی کی۔ مگر لڑکا یہی کہتا گیا: "محبت تکرار سے یہ گتھی نہ سلجھے گی۔" اور لڑکی نے کہا: "پہلے کوئی راہ بتائیے، پھر چاہے میری بوٹی بوٹی نوچ لیجیے۔"

میں نے پوچھا: "جیب میں کچھ دام بھی ہیں؟"

تیرے باپ نے کہا: "زیادہ نہیں، کیوں کہ ورشکا کے لیے انگوٹھی خرید لی۔"

"سب ملا کر کتنے روپے تھے؟"

"یہی کوئی سو روبل"

اُن دنوں روپیہ مشکل سے ملتا تھا اور چیزوں کے دام بھی مہنگے تھے۔ بس کبھی ایک کا منھ تکتی کبھی دوسرے کا اور سوچتی کہ یہ دونوں کیسے نادان ہیں ....

تیری ماں نے بتایا: "آپ کے ڈر سے میں نے انگوٹھی چھپا رکھی ہے۔ ہم اسے بیچ دیں گے۔"

وہ دونوں کتنے معصوم تھے ـــــ کس قدر بھولے! ہم نے اسکیم بنائی کہ ہفتہ بھر میں شادی ہو جانا چاہیے اور میں نے وعدہ کیا کہ پادری کا انتظام میں کر دوں گی۔ کہنے کو تو کہہ دیا مگر میرا دل دھک دھک کرنے لگا کیوں کہ تیرے نانا کی ہیبت تھی

ورشکا بھی خوف کے مارے پیلی پڑ گئی۔ جب بھی ہو، انتظام پکا ہو گیا!
لیکن تیرے باپ سے ایک کاریگر کی دشمنی تھی۔ خدا
اسے غارت کرے۔ اُسے عرصے سے کچھ سُن گُن مل گئی تھی اور
وہ ہم لوگوں کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ روز مقررہ کو میں نے
حسب مقدور اپنی اکلوتی بیٹی کو سجایا بنایا اور اسے دروازے
تک لِوا لائی۔ جہاں ایک گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ورشکا
اس میں بیٹھ گئی تیرے باپ میکسم نے سیٹی بجائی اور گاڑی چل پڑی
میں روتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی کہ یہ بندۂ خدا راہ روک کر کھڑا
ہو گیا اور بڑی عاجزی سے بولا: "بڑی بی' میرے سینے میں بھی
ایک دل ہے اور میں قسمت کے کیے میں دخل نہیں دینا چاہتا۔
مگر میری زبان بند کرنے کے لیے پچاس روبل کی ضرورت ہے۔
میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ مجھے روپیوں کی کوئی
چاہت نہ تھی اور نہ میں نے کچھ پس انداز کیا تھا۔ میں نے نادانی یہ
کی کہ اس پر اپنا بھانڈا پھوڑ دیا:۔

"بھیّا میں خالی ہاتھ ہوں۔ تمھیں کچھ نہیں دے سکتی۔"

'مگر تم کوئی وعدہ تو کر سکتی ہو'

"یہ کیسے؟ وعدہ کر بھی لوں تو اسے پورا کرنے کی کیا صورت ہے؟"
اوہو! ایسے مالدار شوہر کی گرہ سے چند رُپے نکال لینا
کیا مشکل ہے۔

اگر میرے ہوش ٹھکانے ہوتے تو ضرور اس سے معاملہ
کر لیتی۔ لیکن میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اور گھر کے اندر

چلی گئی۔ بس آنگن میں آکر اس نے وہ قیامت برپا کی کہ الامان!
آنکھیں بند کرکے نانی مسکرانے لگی: "اب بھی اپنی اس حرکت کے انجام کا نقشہ میری آنکھوں کے آگے گھوم رہا ہے۔ تیرے نانا شیر کی طرح دھاڑ اُٹھے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا مذاق ہے۔ قسمت کا کھیل کہ انھیں دنوں وہ ورشکا کو دیکھ دیکھ کر فخریہ کہتے تھے: 'اس کا بیاہ میں کسی رئیس سے کروں گا'۔ مگر اس کے بھاگ میں تو یہ رئیس زادہ لکھا ہُوا تھا!۔ حضرت مریم کے سوا کس کو خبر کہ کن کا جوڑا بدا ہُوا ہے۔
بڑے میاں آنگن میں یوں جھپٹے گویا تلوے سلگ رہے ہوں اور اپنے دونوں بیٹوں کو طلب کیا۔ اس بدمعاش جاسوس کی رائے پر انھوں نے 'کلیما' کو چبان کو بھی ہمراہ لیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک چابک تھا جس کے دستے کو سیسا پلایا گیا تھا۔ مائیکل نے اپنی بندوق سنبھالی۔ اس زمانے میں ہمارے گھوڑے بڑے چست و چالاک تھے اور گاڑی بھی ہلکی پھلکی تھی۔ یعنی اسباب ایسے تھے کہ ان دونوں بھگوڑے عاشقوں کی گرفتاری یقینی تھی۔ مگر ورشکا کے نصیب آڑے آئے اور مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ ایک چھری سے میں نے گاڑی کے بم کی رسی کاٹ دی تاکہ وہ لوگ بیچ راستہ میں رک جائیں ایسا ہی ہوا۔ بم الگ گر پڑے اور ان چاروں کی جان جاتے جاتے بچی۔ اس جھمیلے میں وقت نکل گیا اور جب تک وہ گرجاگھر پہنچیں، ورشکا اور میکسم نکاح کی رسم ختم کر چکے تھے۔

اب ان سب نے میکسم سے جھگڑا شروع کیا لیکن وہ ایک ہی زور آور تھا۔ اس نے مائیکل کو وہ پٹخنی دی کہ بچّو کی بانہہ اکھڑ گئی۔ کوچبان کی بھی یہی گت ہوئی پھر تو بڑے میاں اور ان کے سب کاریگر سٹّی بھول گئے۔

غصّے میں بھی اسے حفظ مرتبہ کا پاس رہا اور اس نے بڑے میاں سے کہا: "آپ یوں چابک نہ ہلائیے کیوں کہ میں فطرتاً امن پسند ہوں۔ میں نے صرف وہی لیا جو خدا نے مجھے دیا ہے۔ اور اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی ...... اس سے زیادہ میں نہیں کہنا چاہتا۔"

ان لوگوں نے بھی بات نہ بڑھائی۔ بڑے میاں نے گاڑی کا رُخ کرتے کرتے کہا: "ورشکا، الوداع! آج سے تو میری بیٹی نہیں رہی۔ اور خواہ تو زندہ رہے، خواہ ایک ایک دانے کی محتاج ہوکر مرجائے، میں تیرا منہ نہ دیکھوں گا۔

گھر لوٹ کر انھوں نے مجھے خوب کوسا، خوب پیٹا مگر میں بھی منہ میں گھنگھنیاں بھر کر بیٹھ گئی۔

دن گزر جاتے ہیں یاد رہ جاتی ہے۔

پھر تیرے نانا نے کہا: "سنو جی، یہ بھول جاؤ کہ کبھی تمھاری کوئی بیٹی بھی تھی۔"

مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا: "ارے مکّار بس اتنی سی خود فریبی —— یہ کیوں نہیں کہتا کہ برف گرم ہوتی ہے۔"

میں کان لگا کر یہ کہانی سنتا رہا۔ اس کے بعض واقعات

میرے لیے حیرت افزا تھے کیوں کہ نانا نے اماں کے بیاہ کا ذکر دوسرے پیرایہ میں کیا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ اماں نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ تاہم شادی کھلے خزانے ہوئی تھی اور خود یہ حضرت کلیسا میں موجود تھے۔ میں نے نانی سے یہ نہ پوچھا کہ دونوں میں سے سچا کون ہے کیوں کہ بہرحال اس کی کہانی زیادہ دلچسپ تھی اور میں نے اسے ہی ترجیح دی۔

قصہ کہتے وقت وہ متواتر ہلتی جاتی تھی گویا کسی ڈونگے میں جھونکے کھا رہی ہو۔ اگر کوئی حسرتناک یا بھیانک واقعہ ہوتا تو وہ زور سے جھولنے لگتی اور یوں ہاتھ چلاتی گویا ہوا میں کسی چیز کو ہٹا رہی ہو۔ اکثر وہ آنکھیں بند کرلیتی اور اس کی بھویں بے حرکت ہو جاتیں مگر ایک حلیم و حسین تبسم اس کے پرشکن گالوں میں آ چھپتا تھا۔ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد تھا اور کبھی تو اس سے میرا دل بھی بھر آتا تھا۔ لیکن کبھی میں جھلّا اٹھتا کہ وہ زیادہ دبدبے اور غصّے سے کام کیوں نہیں لیتی۔

دو ہفتے تک تو مجھے ورشکا اور میکسم کی کوئی سُن گُن نہ ملی۔ اس کے بعد ایک غریب لڑکا ان کی خبر لے کر آیا۔ سنیچر کے روز میں انھیں دیکھنے گئی۔ بہانہ تو گرجا گھر کا تھا لیکن پہنچی میں ان کے گھر۔ دور دراز کے کسی مکان کے ایک پہلو میں وہ رہتے تھے اور ان کے سامنے کے آنگن میں کوئی کارخانہ تھا۔ گندگی اور شور و غل کا ٹھکانا نہ تھا، خاصا مچھلی بازار تھا۔ لیکن انھیں اس کی کیا پروا تھی۔ دو بلیوں کی طرح یہ ہمیشہ غرغر کرتے، کھیلتے اور خوش

رہتے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق میں ان کے لیے سب کچھ لے گئی۔ چائے، شکر، آٹا، دال اور چند رُبل جو میں نے بڑے میاں سے جیسے تیسے جھپٹ لیے تھے۔ بیٹے، چوری جائز ہی بشرطیکہ وہ دوسروں کے بھلے کے لیے ہو۔

لیکن تیرے باپ نے یہ سب لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ایں، کیا ہمیں کنگال محتاج جانا ہی۔؟ اور تو اور ورشکا نے بھی اس کے سُر میں سُر ملایا: امّی یہ سب کیا ہی؟ اب تو میں نے ان دونوں کی خوب خبر لی: ارے بے وقوفو، کیا میں ایسی پرائی ہو گئی؟ ۔۔۔۔ اللہ نے مجھے تم دونوں کی ماں بنایا ہی۔۔۔ ۔ اری بڑبولی، تو کس کے گوشت پوست سے بنی ہی۔ کیا تم دونوں میرا دل توڑنا چاہتے ہو؟ تمھیں اس کی خبر نہیں کہ جب دنیا میں کوئی اپنی ماں کو دکھ دیتا ہی تو فردوس میں مریم کا کلیجہ پھٹتا ہی۔"

یہ سن کر میکسم نے مجھے گلے لگا لیا اور مجھے کمرے بھر میں نچاتا پھرا ـــــ وہ کتنا طاقت ور تھا، ریچھ تھا ریچھ!۔ اور اس الھڑ ورشکا کو دیکھو، وہ مورنی کی مانند اپنے میاں پر ناز کر رہی تھی اور اسے یوں تک رہی تھی گویا وہ کوئی نیا گڈا ہی گھر گرھستی کے معاملات پر وہ اس ٹھسّے سے باتیں کرنے لگی گویا اس نے اپنی عمر اسی دھندے میں گذاری ہی۔ اس کی لنترانی کتنی مضحکہ خیز تھی۔ چائے کے ساتھ اس نے ہمیں جو کیک دیا اسے توڑنے کے لیے بھیڑیے کے دانتوں کی ضرورت تھی اور

ڈاہی پر گرد کی موٹی سی تہ چڑھی ہوئی تھی۔

عرصے تک حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور تیری پیدایش کے دن سر پر آگئے۔ تاہم بڑے میاں کی زبان پر ٹانکا لگا رہا — ہمارا بڈھا اپنی ہٹ کا پکا ہے! میں چھپ کر انھیں دیکھنے جاتی تھی اور بڑے میاں یہ راز بھانپ گئے تھے مگر ایسے بن گئے گویا کچھ پتا ہی نہیں۔ گھر بھر کو ورشکا کا نام لینے کی ممانعت تھی، اس وجہ سے بھول کر بھی اس کا ذکر نہ آتا تھا۔ میں بھی پلی جاتی تھی لیکن یہ خوب جانتی تھی کہ آخر باپ کا دل موم کا ہوتا ہے۔ سو ایک دن یہ بند ٹوٹ ہی گیا۔ رات کا وقت اور برف کا طوفان۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کھڑکی کے پاس ریچھ دہاڑ رہے ہیں۔ چمنی کے اندر ہوا پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ مختصر یہ کہ قیامت کا سماں تھا۔ ہم دونوں پلنگ پر تھے لیکن آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

میں نے یوں سلسلہ چھیڑا! ایسی رات غریبوں کے لیے کیسی مصیبت ناک ہوتی ہے۔ اور ان سے زیادہ ان کی مصیبت ہے جن کے دلوں میں سکون نہیں!"

بڑے میاں نے یک بیک پوچھا: ان کا کیا حال ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"تم کن کی خیریت پوچھ رہے ہو؟ اپنی بیٹی ورشکا اور داماد میکسم کی؟"

"تمھیں اس کا گمان کیسے ہوا؟"

"بڑے میاں، بس بھی کرو۔ کب تک یوں چشم پوشی کرتے رہوگے؟

اس میں تمھیں کیا مزہ ملتا ہے ؟"
سانس کھینچ کر وہ بولے : "ہاں ری چڑیل ۔ ۔ ۔ اری ڈھڈو!
گھڑی بھر بعد پوچھنے لگے : سب کہتے ہیں کہ وہ ( یعنی میکسم ) نرا بے وقوف ہے ۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

میں نے جواب دیا : "بے وقوف وہ ہے جو خود کام نہیں کرتا اور دوسروں کا دست نگر رہتا ہے ۔ مثلاً اپنے مائیکل اور جاکوف ۔ ان سے بڑھ کر بدھو اور کہاں ملیں گے ۔ اس گھر کا پالن ہار کون ہے ؟ کون سب کو روٹی دیتا ہے ؟ تم ! ان سے تو تمھارا ہاتھ بھی نہیں بٹایا جاتا ۔"

یہ سن کر بڑے میاں نے مجھے خوب ڈانٹ پلائی ـــــ گدھی ہے ، جاہل ہے ، غرض کہ اناپ شناپ سب سنا ڈالی ۔ میں دم سادھے پڑی رہی ۔

"جس آدمی کے آگے پیچھے کی کسی کو خبر نہ ہو ، اس کی تعریف تم کیوں کرتی ہو ؟"

جب وہ بولتے بولتے تھک گئے تو میں یوں مخاطب ہوئی :
"تمھیں خود جاکر دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیسی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں ۔"

اس پر بڑے میاں بولے : "وہ اس عزت کے مستحق نہیں ۔ انہیں خود یہاں آنا چاہیے ۔"

یہ سنتے ہی خوشی کے مارے میں رونے لگی ۔ اور بڑے میاں میرے بال چھوڑ کر ( انھیں میرے بالوں سے کھیلنے میں مزا ملتا تھا )

بڑ بڑانے لگے : " پاگل کہیں کی، کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے؟
سچ جانو کہ طبعاً وہ بڑے نیک تھے۔ لیکن جیسے ہی انھیں
یہ محسوس ہوتا تھا کہ دنیا بھر میں سب سے دانا فرزانہ ہیں کہ
ان کا دماغ پھر جاتا تھا اور وہ حاسد اور اجڈ بن جاتے تھے۔
تب کہیں ایک تیوہار کے دن تیرے ماں باپ ہمارے گھر
آئے۔ دونوں خوب بنے ٹھنے ہوئے تھے۔ میکسم تیرے نانا کے
آگے کھڑا تھا اور ان کے ہاتھ اس کے کاندھے پر تھے۔ اس نے کہا۔
"قبلہ آپ کو یہ گمان نہ ہو کہ میں جہیز طلب کرنے آیا ہوں۔
میں تو فقط اپنی بیوی کے باپ کو سلام کرنے آیا ہوں"
یہ جملہ بڑے میاں کو بہت پسند آیا، انھوں نے زور کا قہقہہ
لگایا۔
"ابے لڑاکے ـــــ ڈاکو کہیں کے! ـــــ خیر، ایک مرتبہ
درگذر کرتا ہوں۔ تم دونوں ہمارے ساتھ آرہو۔"
میکسم کے ماتھے پر بل آئے: " یہ ورنشکا کی مرضی پر منحصر
ہے۔ میرے لیے تو سب برابر ہے"
اصل دانتا کلکل اب شروع ہوئی۔ سسر اور داماد
ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے۔ کسی طرح ان کے دل نہ ملتے تھے۔
میں اکثر میکسم کو آنکھیں دکھاتی اور میز کی آڑ میں چٹکی لیتی
لیکن اس سے کچھ نہ بنتا تھا۔ وہ اپنی رائے پر اڑا رہتا اور ٹس
سے مس نہ ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں بلا کی خوبصورت بہت
شفاف اور روشن تھیں۔ بھویں کالی تھیں اور وہ جب انھیں

سکیڑ لیتا تو آنکھیں اندر چھپ جاتیں اور چہرے پر سرکشی اور سختی آجاتی تھی۔ میرے سوا وہ کسی کی بات نہ سنتا تھا۔ میں اپنی سگی اولاد سے زیادہ اسے چاہتی تھی۔ وہ بھی یہ جانتا تھا اور مجھے مانتا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے چمٹ جاتا اور سارے کمرے میں مجھے ہلا ڈلاکر کہنے لگتا: دھرتی ماتا کی طرح تم بھی میری ماں ہو۔ ورشکا سے زیادہ تم سے مجھے محبت ہے۔ اور تیری ماں (جب وہ خوش ہوتی تو بڑی نٹ کھٹ بن جاتی) اس سے اُلجھ جاتی: شریر کہیں کے، تونے یہ کیا کہا! پھر تو ہم تینوں خوب اودھم چوکڑی مچاتے تھے۔ آہ وہ دن بھی کیسے سکھ چین کے تھے۔ ناچ میں اسے کمال حاصل تھا —— اور اسے کیسے اچھے اچھے گیت یاد تھے۔ یہ گیت اس نے اندھوں سے سیکھے تھے۔ کیونکہ اندھوں سے بہتر گویّے کہیں نہیں ملتے۔

باغ والی بنگلیا انھیں رہنے کو دی گئی۔ اور وہیں تو بھری دوپہریا میں پیدا ہوا۔ تیرا باپ کھانا کھانے گھر آیا تو تو اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ خوشی کے مارے اس کا برا حال تھا اور اس نے تیری ماں کو دق کر ڈالا۔ اس بے خبر کو اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ بچہ جننا کیسی ٹیڑی کھیر ہے۔ مجھے کاندھے پر لاد کر وہ آنگن پار کر گیا اور بڑے میاں کو نواسے کی پیدایش کی خوش خبری جا سنائی۔ انھوں نے ہنس کر کہا:
"ارے میکسم، تو تو جن ہے جن!"

لیکن وہ تیرے ماموؤں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

وہ شراب نہ پیتا تھا اور بڑا زبان دراز تھا۔ اسے ہر قسم کے شعبدے آتے تھے ـــــ اور یہ اسے مہنگے پڑتے تھے۔ مثلاً، ایک روز جب تیز ہوا چل رہی تھی، یک بیک سارا مکان دہشت ناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ ہم سب بھوچکے رہ گئے یہ کیا مصیبت آئی؟ بڑے میاں بھی سہم گئے اور گھر بھر میں چراغاں کرنے کا حکم دے کر چیخ پڑے: ہم سب کو بیک زبان دعا پڑھنی چاہیئے!"

مگر اسی وقت وہ شور تھم گیا ـــــ اب تو ہمارا ہراس دو چند ہو گیا۔ مگر جاکوف کی سمجھ میں یہ معمہ آ گیا۔ یہ میکسم کی کرتوت معلوم ہوتی ہے! بعد ازاں میکسم نے خود ہی قبولا کہ اس نے درجنوں بوتلیں اور برتن کھڑکی سے لٹکا دیے تھے اور ہوا ان کے اندر سنسنا کر یہ آواز پیدا کر رہی تھی۔ نانا نے جھلا کر کہا: "یہی رفتار رہی تو ایک نہ ایک روز تو ضرور سائبیریا کی ہوا کھائے گا۔"

ایک سال غضب کا پالا پڑا اور بھیڑیوں کے غول شہر میں گھس آئے۔ انھوں نے کتوں کو پھاڑ ڈالا۔ متوالے چوکیداروں کو کھا ڈالا اور شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ مگر تیرے باپ نے بندوق اٹھائی اور دو بھیڑیوں کو بھون ڈالا۔ ان کی کھال اتار کر اس نے ان کا سر صاف کیا اور کانچ کی آنکھیں بٹھائیں ـــــ بھئی! خوب بہروپ پہنایا۔ مائیکل کسی کام سے غلام گردش میں گیا اور الٹے پاؤں اس بدحالی میں لوٹا کہ رونگٹے

کھڑے تھے، آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں، گھگھی بندھ گئی تھی بمشکل تمام اس نے کہا: "بھیڑیا!" پھر تو جس کے ہاتھ جو اوزار پڑا وہ لیے ہوئے قندیل کے ساتھ غلام گردش کی طرف لپکا۔ واقعی ایک بھیڑیے کا سر اندر جھانک رہا تھا۔ اسے خوب ٹھونکا۔ گولیاں چلائیں —— اور جانتے ہو یہ کیا تھا۔ غور سے دیکھا تو یہ بُھس بھری کھال تھی اور اس کے پنجے تختے میں ٹھونک دیے گئے تھے۔ اس مرتبہ بڑے میاں میکسم سے سخت خفا ہوئے۔

بھلا جاکوف ان شرارتوں میں کیسے شامل نہ ہوتا۔ میکسم دفتی کا سر کاٹ کر اس پر منہ آنکھ بناتا اور بال کی جگہ سن کی جٹا چپکا دیتا۔ دونوں سالے بہنوئی اسے لیے ہوئے سڑک پر جاتے اور کسی کھڑکی کے اندر یہ مہیب شکل ڈال دیتے ڈر کے مارے لوگوں کا دم نکل جاتا اور وہ چیخ کر بھاگ جاتے۔ دوسری مرتبہ یہ لوگ سرتاپا چادروں میں لپٹے ہوئے پادری کے گھر گھُس گئے اور وہ ڈر کر سنتری گاہ میں جا چھپا۔ اور سنتری بھی ایسا گھبرایا کہ پولیس کو بُلا لایا۔ غرض یہ دونوں نڈر نت نئے کھیل کھیلتے اور کوئی ان کا ہاتھ نہ روک سکتا تھا۔ میں نے اور ورشکا نے انھیں بہت منع کیا مگر وہ کب کسی کی سنتے تھے۔ میکسم تو ہماری بات پر ہنس دیا کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ لوگوں کو ذرا سے مذاق پر سراسیمہ ہو کر گرتے بھاگتے ہوئے دیکھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ذرا چل کر انھیں تسلی تو دیجیے!

یہ سب کیا دھرا اس کے سر پڑا اور وہ مرتے مرتے بچا۔

مائیکل نے جو ایک ہی بدخو اور کینہ جو تھا، تیرے باپ کو مارنے کی سازش کی ۔ سرغنہ کا آغاز تھا اور یہ تینوں ایک پادری کے ساتھ ـــــ جو بعد میں ایک کوچبان کے قتل کے شبہ میں برطرف کر دیا گیا ـــ کسی دوست کے گھر سے واپس آرہے تھے ۔ ان لوگوں نے بیچ راہ میں بہانہ کیا کہ آؤ باؤلی کی طرف سے چلیں اور وہاں اسکیٹنگ کریں ۔ برف پر بچوں کی طرح پھسلتے پھسلتے انھوں نے میکسم کو برف کے ایک گڑھے میں دھکیل دیا ـــــ مگر میں یہ واقعہ تجھے سنا چکی ہوں۔

"نانی جان، میرے ماموں اتنے بُرے کیوں ہیں؟"

نانی نے ناس سونگھ کر دل جمعی سے جواب دیا: برے تو نہیں البتہ وہ بے وقوف ضرور ہیں ۔ مائیکل ناسمجھ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی کائیاں ہے، مگر جاکوف فی الجملہ نیک دل ہے ۔ خیر جب انھوں نے میکسم کو گڑھے میں دھکیلا تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے برف کے تودے کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ان ظالموں نے اس کی کلائیوں کو جوتے کے تلووں سے ایسا کچلا کہ اس کی انگلیاں چور چور ہوگئیں ۔ خدا کی کرنی کہ اور سب تو متوالے تھے لیکن اس کے حواس درست تھے ۔ جوں توں کرکے اس نے اپنا دھڑ برف کے بار سے نکالا اور گڑھے کے بیچ میں سر اُٹھائے ٹھہرا رہا تاکہ سانس تو لے سکے ۔ جب یہ جلّاد کسی طرح اسے گرفت میں نہ لا سکے تو اُسے گلے گلے برف میں ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر بے نیل مرام اپنی راہ سدھارے ۔ میکسم باہر

نکل کر کوتوالی کی طرف بھاگا —— وہی جو بازار کے قریب ہے۔ کوتوال اسے اور ہمارے گھرانے کو خوب پہچانتا تھا۔ سو اس نے سوال کیا: "یہ کیا ماجرا ہے؟"

نانی نے صلیب کا نشان بنا کر تشکر آمیز لہجہ میں کہا:

"خدا بخشے، میکسم کن کن خوبیوں کا آدمی تھا۔ پولیس کے آگے جو وہ زبان پر حرفِ شکایت لایا بھی ہو۔ جواب دیا کہ یہ میری غلطی تھی۔ نشہ کے جھونکے میں میں بادلی کی طرف جا پہنچا اور برف کے گڑھے میں گر گیا۔ کوتوال اس بھلاوے میں نہ آیا: یہ صریح جھوٹ ہے کیونکہ تم نے شراب نہیں پی ہے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ انھوں نے برانڈی سے میکسم کے جسم کی مالش کی، اسے سوکھے کپڑے پہنائے اور کمبل میں لپیٹ کر گھر لائے۔ کوتوال صاحب بنفس نفیس ساتھ آئے۔ مائیکل اور جاگوف ہنوز نہ لوٹے تھے۔ جشن منانے کے لیے وہ کسی میکدے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ میں اور تیری ماں میکسم کو دیکھتی کے دیکھتی رہ گئیں۔ اس گھڑی وہ قطعاً بدل گیا تھا۔ چہرہ زرد انگلیاں لہولہان اور ان پر خون جم کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ بالوں کی لٹوں میں برف کی پپڑی جو اب تک نہ پگھلی تھی۔ اور چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔

ورشکا چیخ پڑی "ان کم بختوں نے تمھاری کیا گت بنا دی ہے!"

اب جا کر کوتوال پر اصل بھید کھلا اور اس نے اپنی جرح شروع کی۔ میں دل میں بھانپ گئی کہ معاملہ سنگین ہے۔ ورشکا کو کوتوال

کے پیچھے لگا کر میں نے چپکے چپکے میکسم سے پوچھا کہ آخر یہ کیا معمّہ ہے
اس نے میرے کان میں کہا: سب سے پہلے مائیکل اور جاکوف کی
تاک میں رہو۔ انھیں اپنے بیان میں یہ کہنا ہے کہ باولی کے نکڑ پر
وہ مجھے چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تھے۔ زیادہ گورکھ دھندا
مچایا تو پھر پولیس کے ہاتھوں ہلکان ہونا پڑے گا۔"
میں نے بڑے میاں سے کہا: "تم کوتوال کو باتوں میں لگاؤ۔
میں ان ناہنجار بیٹوں کو سنا آؤں کہ گھر پر کیا ستم ٹوٹا ہے۔
کپڑے بدلتے ہوئے وہ کانپنے اور بڑبڑانے لگے: میں جانتا تھا
کہ یہ ہوگا! مجھے اسی کا اندیشہ تھا!
یہ تو خیر ان کی باتیں تھیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی اس کی
خبر نہ تھی۔ اپنے بیٹوں کو دیکھتے ہی میں نے ہتیلی سے اپنا منہ
چھپا لیا۔ مارے ہراس کے میاں مائیکل کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اور
وہ لونڈا جاکوف گھگھیانے لگا: "قسم لے لیجیے جو مجھے کچھ بھی
معلوم ہو۔ یہ مائیکل کے کرتوت ہیں۔ وہی ہم سب میں سیانے تھے۔
بہرحال ہم نے کوتوال کو پرچا لیا۔ وہ بھلا مانس تھا۔ چلتے
چلتے وہ یہ تاکید کر گیا: آئندہ کے لیے تمھارے کان ہو جائیں،
اگر تمھارے گھر میں کوئی فوجداری ہوئی، تو مجرم کا نام میں ابھی
بتا سکتا ہوں۔"
بڑے میاں میکسم کے پاس جاکر بولے: خدا تمھیں اس کا
اجر دے! تمھاری جگہ اور کوئی ہوتا تو ہرگز یہ شرافت نہ برتتا۔
اور بیٹی آفریں ہے تجھ پر کہ ایسے فرشتہ صفت انسان کو ہمارے

خاندان میں لائی - جب وہ موج میں ہوتے تو ایسے ہی میٹھے بول بولتے تھے - مگر جب وہ حماقت پر اتر آتے تھے تو ان کے دل پر گویا بھاری سی سل لد جاتی تھی -

جب ہم تینوں اکیلے رہ گئے تو میکسم بلک بلک کر رونے لگا۔ انھوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا - میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا ؟ - ماما - - - - انھوں نے ایسا کیوں کیا ؟ وہ مجھے مشکا نہیں بلکہ بچوں کی طرح ماما کہا کرتا تھا - - - - اور حقیقتاً اس میں بچپن کا بھولا پن تھا - کیوں ؟ - - - وہ یہی سوال کرتا رہا -

میں رونے لگی ——— اور اس کے سوا میرے بس میں کیا تھا - اپنے بیٹوں کی وجہ سے میں کتنی نادم تھی - تیری ماں نے کرتی کے سارے بٹن توڑ ڈالے - اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی سے لڑ کر آئی ہے - وہ متواتر یہی کہے جاتی تھی : میکسم ہم اس گھر میں ایک پل نہ رہیں گے - یہ بھائی ہمارے خون کے پیاسے ہیں - میں ان سے ڈرتی رہتی ہوں - اب اس گھر میں ہمارا گزر نہیں - اسے چپ کرنے کو میں بولی : اری جلتی آگ میں تیل کیوں چھڑکتی ہے - گھر یوں ہی دھوئیں سے بھرا ہوا ہے -

بڑے میاں کی کھوپڑی تو اوندھی رہتی ہی ہے - آپ نے اسی گھڑی ان دونوں موذیوں کو گناہ بخشوانے کے لیے بھیجا - ورشکا تو مائیکل پر ٹوٹ پڑی اور اس کے منہ پر دو ہتڑ رسید

کر دیا: ـ یہ ہے تمھاری معافی! تیرے باپ نے کہا: 'بھائی، تمھیں اس کا ھیاؤ کیسے ہوا؟ میرے ہاتھ توڑنے میں تم نے کیا کسر رکھی تھی۔ لُولا لنجا ہوکر میں ساری عمر کے لیے بے کار ہو جاتا!'

بہر کیف ان دونوں میں میل ہو گیا۔ تیرا باپ یوں پہلے ہی سے ناساز تھا۔ چنانچہ سات ہفتے وہ مچھلی کی طرح بستر پر تڑپتا رہا۔ اس کی زبان پر ایک یہی ورد تھا: ماما، اس جگہ سے میں اُکتا گیا ہوں، چلو، کسی دوسری نگری کو آباد کریں۔

کچھ عرصے بعد اُسے استراخاں میں کچھ کام مل گیا۔ گرمیوں میں وہاں بادشاہ کی سواری آنے والی تھی۔ اس سلسلہ میں میکسم کو ایک آرائشی محراب بنانے کا حکم ہوا۔ وہ دونوں پہلی کشتی سے روانہ ہو گئے۔ ان کی جدائی کا غم میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ میکسم کو بھی اس کا قلق تھا۔ اور وہ یہی ضد کیے جاتا تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلی چلو۔ لیکن ورتکا کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا اور وہ بے دھڑک اس کا اظہار کر رہی تھی۔ چڑیل کہیں کی! ـ یہ ان کی الوداع تھی ....۔"

شراب کا ایک گھونٹ پی کر اور ناس کی ایک چٹکی سونگھ کر نانی نے کھڑکی سے نیلے آسمان کو تاکتے ہوئے کہا:

"گو مجھ میں اور میکسم میں خون کا رشتہ نہ تھا لیکن ہم دونوں کی ارواح ہم آہنگ تھیں!"

اس داستان کے دوران میں گاہ گاہے نانا جان اِدھر آنکلتے تھے اور اپنی تیز ناک سے ہوا کو سونگھ کر شُبہ آمیز انداز سے

نانی کی باتیں سنتے اور کہہ اٹھتے :

"یہ جھوٹ ہے! یہ غلط ہے!"

اور پھر یک بیک پوچھ بیٹھتے : 'الکسی! کیا یہ برانڈی پی رہی تھی ؟

'جی نہیں'۔

'ابے مکّار میں نے اپنی آنکھوں سے ابھی ابھی دیکھا ہے'۔

یہ کہہ کر اسی حیص و بیص کے عالم میں وہ چل دیتے -

پیٹھ پھیرتے ہی نانی ان کی طرف آنکھ مار کر کوئی کہاوت سناتی: 'لال بجھکڑ جانا ہے تو جا مگر گھوڑوں کو نہ بھڑکانا'!۔

ایک روز کمرے کے فرش پر ٹکٹکی لگائے ہوئے نانا نے نرمی سے کہا : 'بڑی بی'۔

'جی ؟'

'دیکھتی ہو کیا ہو رہا ہے ؟'

'ہاں، بہت اچھی طرح'!

'اس معاملہ میں تمھاری رائے کیا ہے ؟'

'بیاہ رچے گا اور کیا ۔ یاد ہے کہ تم کس شوق سے کسی شریف زادے کا ذکر کیا کرتے تھے ؟'

'خوب یاد ہے'۔

'اب تو تمھاری مراد برآئی ؟'

'لیکن یہ تو نرا کنگال ہے'۔

'یہ ورشکا کی پسند ہے'۔

جب نانا باہر چلا گیا تو میں نے بے قرار ہو کر پوچھا:
"یہ کس کا ذکر ہو رہا تھا؟"

نانی نے میرے تلوے سہلا کر جھڑک دیا: "ارے تجھ میں اتنی اُدھیڑ بن کیوں ہے؟ اگر ایسی عمر میں تو سب کچھ سیکھ لے گا تو بڑھاپے کے لیے کیا رہ جائے گا۔" ہنستے ہوئے وہ اپنا سر ہلانے لگی۔

---

"واہ جی بڑے میاں! خدا کی نظر میں تم خاک کے پتلے سے زیادہ کیا حقیقت رکھتے ہو۔ بیٹے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ ہم بالکل دیوالیے ہو گئے۔ انھوں نے کسی نتھو خیرے کو اپنی جمع پونجی قرض میں دی اور اس نے ٹاٹ الٹ دیا۔"

مسکراتے ہوئے نانی کسی خیال میں غرق ہو گئی اور دیر تک گم سم بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے بادل چھا گئے۔

"تم کس سوچ میں ہو؟"

اس نے چونک کر جواب دیا: میں سوچ رہی تھی کہ تجھے کون سا قصہ سناؤں؟۔ پادری 'یوستینا' کی کہانی تجھے پسند ہے؟۔ اچھا تو سُن:

ایک تھے پادری یوستینا چھوٹے سے اور موٹے سے
چرب زباں اور شیخی مار سارے زمانہ کے لقمان
"میں میخ میں پائیں مزا "وہ ہے بُرا اور یہ ہے بُرا!
یہ گرجا ہے چھوٹا سا یہ رستہ ہے ٹیڑھا سا
سیب ہے کیسا پیلا سا سوکھا سا اور پچکا سا

مجھ سے گر کوئی لیوے صلاح — ہرگز ہووے نہ وہ گمراہ
دنیا میں ہوں میں ہی ایک" — یہ تھی اس مرغے کی ٹیک
ایک رات کچھ بھوت پریت — ان کے گھر میں گھس آئے
"خیر تو ہے اے مولانا — کمرا ہے کیوں ٹھنڈا سا
دوزخ میں ہے آگ بھری — وہاں کہاں ایسی سردی
چلیے وہاں کی سیر کریں — پادری صاحب آگے بڑھیں۔
دوزخ میں یہ بڑے میاں — تپا کیے اور جلا کیے
پر جب پوچھا کسی نے کیوں — آپ کے ہیں اب کیسے مزاج
اینٹھ کے بولا یہ مگرا — اتنی آگ اور اتنا دھنواں!
چمنی کا پر نام نہیں — ہے یہ کیسا اوجڈ پن!!!

قصہ ختم کرتے وقت اس کی آواز سست اور نحیف پڑگئی اور لہجہ بدل گیا ۔ زیر لب ہنستی ہوئی وہ بولی :" اس یوستینا کے مرغے کی ایک ہی ٹانگ تھی اور بڑے میاں کی طرح وہ اپنی ہی ٹیک پر اڑا رہتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ خیر بہت ہوا چلو سونے کا وقت ہوگیا ۔"

اماں شاذ و نادر مجھے دیکھنے کو آتی تھی اور یہ بھی چند ساعت کے لیے ۔ وہ ایسی ہڑبڑاہٹ سے بولتی تھی گویا جلدی میں ہو ۔ اس کا رنگ روپ روز بروز کھلتا جاتا تھا ۔ اور اس کے لباس کی شان بھی دوبالا ہوتی جاتی تھی ۔ لیکن مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس میں اور نانی میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے ۔ میں سمجھ گیا کہ مجھ سے کوئی بات چھپائی جا رہی ہے —— اور میں اسی کی کرید میں رہنے لگا ۔

اب نانی کی کہانیوں میں مجھے وہ لطف نہ آتا تھا — حتیٰ کہ اپنے ابّا کے واقعات بھی میرے لیے کچھ غیر دلچسپ ہو گئے۔ ان سے اس روز افزوں جذبۂ ہراس کو تسکین نہ ملتی تھی جو قطعاً ناقابلِ فہم تھا۔

نانی سے میں نے پوچھا: "ابّا کی روح بے چین کیوں رہتی ہے؟" آنکھیں بند کر کے وہ بولی: میں کیا جانوں؟ - یہ خدا کا معاملہ ہے ... سرحدِ اِدراک سے پرے ... یہ راز ہم سے پوشیدہ ہے۔"

راتوں کو جب میری بے خواب آنکھیں ان ستاروں کو دیکھتیں جو آسمان میں چہل قدمی کرتے ہوتے تھے تو میرے دل میں آپ ہی آپ یہ غم انگیز وسوسہ اٹھتا کہ اُس دنیا میں میرا باپ تن تنہا آوارہ گردی کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے اور ایک کتّا اس کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔

---

# باب ۱۲

ایک مرتبہ دن کے تیسرے پہر میری آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو یکایک محسوس ہوا کہ میری دونوں ٹانگیں بھی جاگ گئی ہیں۔ جب انھیں باہر نکالا تو وہ پھر سُن ہوگئیں۔ تاہم یہ واقعہ تھا کہ اب وہ اچھی ہوگئی تھیں اور میں چلنے کے قابل ہوگیا تھا۔ یہ ایسی خوش خبری تھی کہ میں مسرت کے مارے چیخ اُٹھا اور فرش پر پیروں کے بل کھڑا ہوگیا۔ پہلے تو میں گر گیا مگر گھٹنوں کے بل دروازے سے ہوکر سیڑھیاں اتر گیا اور سوچتا رہا کہ مجھے دیکھ کر ہر سیڑھی کو کیسی حیرت ہوگی۔

یاد نہیں پڑتا کہ گھسٹتے ہوئے میں کیوں کر اپنی ماں کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں کئی اجنبی موجود تھے اور ان میں ایک سوکھی ساکھی سبز پوش بڑھیا نے کرخت آواز میں کہا:

”پھل کا عرق پلاکر اس کا سر ڈھک دو۔“

وہ سرتاپا سبز تھی۔ اس کی پوشاک، ٹوپی اور چہرہ تک ہرا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے مسّے تھے اور ان مسّوں کے روئیں تک گھاس کی طرح ہرے تھے۔ نچلا ہونٹ چباکر اور بالائی ہونٹ اوپر اٹھاکر اس نے اپنے سبز دانتوں سے مجھے گھورا اور سیاہ

دستانوں سے آنکھیں ڈھک لیں ۔

سہم کر میں نے پوچھا : "یہ کون ہے ؟"

نانا نے خشک آواز میں کہا : "یہ تیری دوسری نانی ہیں ۔"

اماں ہنستی ہوئی یوجن میکسموف کو میرے قریب لائی ۔

"اور یہ تمھارے ابا ہیں !"

اس نے تیزی سے کچھ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا اور یوجن نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں میری طرف جھکا کر کہا :

"میں تمھیں انعام میں کچھ تصویریں دوں گا ۔"

کمرا روشنی کے مارے جگمگا رہا تھا ۔ میز پر کئی شمع دان ضوفشاں تھے اور ان کے بیچ میں نانا کا ایک محبوب شبہ نشین رکھا ہوا تھا ۔ اس میں جڑے ہوئے موتی رہ رہ کر جھلملا اٹھتے اور مورت کا زرین تاج دمک اٹھتا ۔ گلگلوں کے سے بھرے بھرے گول مٹول چہرے باہر سے کھڑکی کے شیشے کے پاس آتے اور ان کی ناکیں اس پر چورس ہو جاتیں ۔ میری آنکھوں کے آگے ہر چیز ناچنے لگی ۔ اس ہری بھری بڑھیا نے اپنی ٹھنڈی انگلیوں سے میرے کانوں کو چھو کر کہا :

"بیشک ! بیشک !"

"وہ بیہوش ہو رہا ہے !" یہ کہہ کر نانی مجھے گود میں لیے ہوئے دروازے کی طرف چلی ۔

لیکن میرے ہوش سلامت تھے ۔ میں نے آنکھیں بھینچ لیں اور جب وہ جوں توں کر کے مجھے سیڑھی کے اوپر لے آئی تو میں نے پوچھا : "مجھ سے یہ بات چھپانے کی وجہ ؟"

"بس بھی کر ۔ ۔ ۔ ۔ چپ رہتا ہے یا نہیں !"

"تم سب دھوکے باز ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب کے سب۔"

مجھے پلنگ پر لٹا کر نانی نے تکیہ میں منہ چھپا لیا ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا :

"تو روتا کیوں نہیں؟"

میرا جی رونے کو نہ چاہا ۔ ہماری کوٹھڑی میں شفق کا اُجالا آرہا تھا۔ خاصی سردی تھی ۔ میں کانپ اٹھا اور پلنگ چرچرانے لگا ۔ اُس بڑھیا سبز پری کی مورت میری آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھی ۔ میں نے جھوٹ موٹ آنکھیں میچ لیں تو نانی چلی گئی ۔

کئی خالی از واقعات دن کسی پھیکے جھرنے کی مانند گزر گئے۔ شادی کے بعد اماں کہیں چلی گئی تھی اور گھر بھر میں ہُو کا عالم تھا۔

ایک روز نانا چھینی لیے ہوئے آیا اور کوٹھڑی کی کھڑکی کے آس پاس کی سیمنٹ اُکھاڑنے لگا ۔ جب نانی پانی کا تسلا اور جھاڑن لیے ہوئے آئی تو نانا نے آہستہ سے پوچھا :

"بڑی بی اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میری سمجھ میں تمہاری بات نہ آئی۔"

"تم اب بھی خوش ہو یا نہیں ؟"

نانی نے وہی جملہ دُہرایا جو اس نے سیڑھی پر مجھ سے کہا تھا :

"بس بھی کرو!"

ان سیدھے سادے الفاظ میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ تھا۔

اور میں سمجھ گیا کہ وہ کسی بہت ہی اہم اور غم انگیز واقعہ کو چھپا رہے ہیں، جسے سب جانتے ہیں مگر کوئی بیان نہیں کرسکتا۔

کھڑکی کے چوکھٹے کو لیے ہوئے نانا باہر چلا گیا اور نانی ہوا خوری کرنے لگی۔ باغ میں چنڈول گا رہا تھا، گوریّاں چہچہا رہی تھیں اور بھیگی ہوئی زمین کی مخمور کن خوشبو کمرے میں سما رہی تھی۔ ایسا معلوم ہؤا کہ تندور کی نیلی اینٹیں حیرانی سے زرد پڑ گئی ہیں۔ ان پر نظر گڑانا گویا جاڑے کو پاس بلانا تھا۔ میں تو پلنگ سے فرش پر اُتر آیا۔

نانی نے آواز لگائی: "تو ننگے پانوں اُتر کر تو دیکھ!"

"میں باغ ہی میں تو جا رہا ہوں۔"

"وہ بھی نرا سیلا پڑا ہے۔ زرا ٹھہر جا۔"

لیکن میں نے اس کے کہے پر کوئی دھیان نہ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بڑی عمر کے لوگوں سے مجھے کچھ چڑ سی ہوگئی تھی۔ باغ میں دوب کی ہری بھری کونپل سر نکال رہی تھی۔ سیب کے پیڑوں میں اکھوے پھوٹ رہے تھے۔ 'پترونا' کے جھونپڑے کی چھت پر جمی ہوئی کائی بہت لبھا رہی تھی۔ چاروں طرف پرندوں کا زمزمہ تھا اور تازی تازی مداتی ہوا ایک عجیب خوشگوار کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ اس کھائی کے پاس جہاں چچا پیٹر نے جامِ شہادت پیا تھا، لمبی لمبی گھاس لہلہا رہی تھی۔ اس کا رنگ سرخ تھا اور وہ پگھلی ہوئی برف سے گتھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھائی کیونکہ یہ بہار کا رنگ نہ تھا۔ سیاہ چمنی اُداس

انداز میں تنی کھڑی تھی اور یہ پوری کھائی میرے لیے آشوب چشم
بن گئی تھی ۔ میرا دل غصے کے مارے مچل اٹھا کہ اس بھٹی کی اینٹ
سے اینٹ بجا دوں اور یہ سارا کوڑا کرکٹ صاف کرکے اپنے
لیے گڑھے میں ایک صاف ستھری جھونپڑی بناؤں اور بڑے بوڑھوں
سے الگ تھلگ گرمیوں بھر اسی میں رہوں۔

یہ خیال اٹھتے ہی میں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا ۔ اور
اس مصروفیت سے گھر کے معاملات سے میرا دھیان بٹ گیا ۔
اب میں اسی ادھیڑ بن میں رہنے لگا اور گو کہ پریشانی کے مختلف
اسباب پیدا ہُوا کیے لیکن ان کی اہمیت دن بدن کم ہونے لگی ۔

نانی اور اماں پوچھا کرتیں : تو کس بات پر رُوٹھا ہُوا ہے ؟-
اس کا جواب کٹھن تھا ۔ کیونکہ میں ان سے خفا نہ تھا —— بلکہ
گھر کا ہر آدمی اب مجھے اجنبی نظر آتا تھا ۔ کھانا کھانے کا وقت ہو
یا چائے کا —— وہ بوڑھی سبز پری اکثر آدھمکتی تھی ۔ وہ کسی
باڑی کی سڑی ہوئی ٹہنی معلوم ہونے لگی تھی ۔ یہ معلوم ہوتا تھا
کہ اس کی آنکھیں غیر مرئی دھاگے سے چہرے پر ٹانک دی گئی ہیں
جب وہ انھیں تیزی سے دائیں بائیں گھما کر ہر شے کا جائزہ لینے
لگتی ۔ خدا کے ذکر کے وقت انھیں اوپر اٹھاتی اور گھر بار کے
تذکرے کے موقعہ پر انھیں ناک سے بھڑا لیتی ——
تو ڈر لگتا کہ اس کے دیدے اپنے خانوں سے لُڑھک نہ پڑیں۔
اس نے بھویں بھی ایسی پائی تھیں گویا کاٹ کر گوند سے چپکا دی گئی ہوں
مضحکہ خیز انداز سے کہنی موڑ کر اور آخری انگلی اٹھا کر وہ منہ میں جو

کچھ ٹھونس لیتی اسے وہ آگے نکلا ہُوا دانت خاموشی سے چبایا کرتا. اس اثنا میں اس کی کنپٹی کسی گیند کی طرح اچھلنے لگتی ،چہرے کے سبز روئیں یوں حرکت کرنے لگتے گویا اس کی کریہہ صاف ستھری جھرّی دار جلد پر رینگ رہے ہوں۔

وہ اپنے بیٹے کی طرح اتنی صاف شفاف تھی ـــــ کہ اس کے پاس جاتے گھن آتی تھی۔ پہلے ہی دن جب اس نے اپنا مُردار ہاتھ میرے ہونٹوں سے لگایا تو اس سے صابن اور ابٹن کی ایسی تیز مہک آئی کہ میں بھاگ کھڑا ہُوا۔ وہ اکثر اپنے بیٹے کو جتایا کرتی: اس لڑکے کو تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ جانیا، سُنا یا نہیں؟"

سر کی جنبش سے فرماں برداری جتاکر وہ ناک بھوں چڑھاتا اور چپ ہوجاتا تھا۔ اس ہری بڑھیا کے سامنے ہر شخص کے ماتھے پر شکن رہتی تھی۔

اس بُڑھیا اور اس کے بیٹے سے میں انتہا کی نفرت کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر میری گوشمالی ہُوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ شب کے کھانے پر اس نے نہایت بیہودگی سے آنکھیں مٹکا کر کہا:

"لڑکے، کھانے میں اتنی جلدی کیوں کرتا ہے؟ اور اتنی بڑی بوٹیاں کیوں کاٹتا ہے۔ لاڈلے، لا، یہ ٹکڑا مجھے دے دے۔"

میں نے اپنے منہ کی بوٹی نکال کر کانٹے میں اٹکائی اور اس کی طرف بڑھاکر کہا: "لیجیے ـــــ مگر کہیں منہ نہ جل جائے۔"

امّاں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکال دیا۔ نانی بھی میرے پیچھے پیچھے آئی اور ہنسی روکنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"خدا تجھ سے سمجھے رے بندر!"

اس کی یہ ادا مجھے بالکل نہ بھائی اور میں بھاگ کر چھت پر چڑھ گیا اور دیر تک چمنی کے پاس بیٹھا رہا۔ بیشک میں گستاخ ہوکر ان سب کو سخت سُست سنانا چاہتا تھا۔ اس جذبہ کو دبانا مشکل تھا۔ تاہم اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔

ایک دن میں نے ان ہونے والے ناتے داروں کی کرسیوں پر گوند کا وہ لیپ لگایا کہ یہ دونوں چپکے کے چپکے رہ گئے۔ یہ تماشا ازحد مضحکہ خیز تھا۔ جب نانا جان میری مرمت کر چکے تو اماں میری کوٹھڑی میں آئیں اور مجھے گود میں اٹھاکر کہا:

"ایک بات سنو! ۔ آخر تم ایسے بد دماغ کیوں ہوگئے ہو؟ کاش تمھیں معلوم ہوتا کہ مجھے اس کا کتنا صدمہ ہے!" اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو ڈبڈبانے لگے اور وہ اپنا سر میرے گالوں سے ملنے لگی۔

اس سے میرے دل کو چوٹ لگی۔ کاش اس کی بجائے اس نے مجھے ٹھونکا ہوتا۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ اگر وہ اپنے آنسو پی لے تو میں آئندہ کبھی ان ماں بیٹوں پر منہ نہ آؤں گا۔

اس نے نرمی سے میری پیٹھ ٹھونکی: "دیکھو، اب ڈھٹائی نہ برتنا۔ بہت جلدی ہماری شادی ہونے والی ہے جس کے بعد ہم ماسکو چلے جائیں گے۔ جب واپس لوٹیں تو تم ہمارے ساتھ رہوگے۔ 'یوجین' بڑے بھلے مانس ہیں اور تم دونوں میں خوب نبھے گی۔ تم اسکول جانے لگوگے اور بعد ازاں کالج —— ان کی طرح پھر تم ڈاکٹر

یا جو چاہو بن سکتے ہو۔ اپنے شعبے کا انتخاب تم خود ہی کروگے۔
اچھا، جاؤ، اب کھیلو۔

بعد ازاں' اور 'پھر' کی اس بھرمار پر مجھے کسی سیڑھی کا گمان ہوتا تھا جو امّاں سے دور کسی تنگ و تاریک مقام میں جاکر ختم ہوتی ہو ـــــ ایک ایسی سیڑھی جو مجھے پسند نہ تھی۔

میرا جی چاہا کہ امّاں سے کہوں: "آپ شادی وادی کے جھمیلے میں نہ پڑیں۔ آپ کے لیے میں محنت مزدوری کرنے کو تیار ہوں۔" مگر یہ الفاظ کبھی میری زبان تک نہ آئے۔ وہ ہمیشہ میرے دل میں محبّت کے جذبات پیدا کرتی تھی گو میں ان کا اظہار نہ کرسکتا تھا۔

میں نے باغ میں جو مہم شروع کی تھی اس کی تکمیل ہونے لگی تھی۔ گھاس پھوس کو اکھاڑنے اور کاٹنے کے بعد میں نے خندق کے کنارے اینٹوں سے ایک چبوترا بنا ڈالا۔ یہ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر میں لیٹ سکتا تھا۔ میں نے رنگین شیشے اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے جمع کیے اور انھیں اینٹ کے جوڑوں کے بیچ میں بٹھایا۔ جب سورج کی کرنیں وہاں تک پہنچتیں تو اس سے قوس قزح کی جھلک آتی جیسی کلیسا کی محرابوں میں ہوتی ہے۔

ایک روز ناتا نے میری کارگزاری کا معائنہ کرکے فرمایا: بھئی خوب سوجھی! مگر شیشے توڑنے اور گھاس کی جڑوں کو یوں چھوڑ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی کُدال دے تو میں اسے کھود کر ٹھیک کردوں۔"

میں نے اپنی پیلی کدال اس کے حوالے کی۔ اس نے ہاتھوں کو

ٹھوک سے نرم کرکے بطخ کی سی آواز نکالی اور کُدال کو پیر سے
دبا کر مٹی میں دھنسا دیا۔

"جڑوں کو پھینک آ۔ پھر کبھی یہاں سورج مکھی کے پودے
اور بیری کے پیڑ لگا دوں گا۔ تب تو یہ جگہ بڑی سہانی ہوجائے گی"۔

یہ کہہ کر کدال پر جھک کر وہ یک لخت خاموش ہوگیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھوں سے
آنسو کی بڑی بڑی بوندیں زمین پر ٹپک رہی تھیں۔

"ناناجان، یہ کیا ہے؟"

چونک کر اس نے ہتھیلی سے اپنا منہ پونچھا اور بے نور نظروں
سے مجھے دیکھ کر کہا۔" میں پسینے پسینے ہوگیا تھا ——— اوہ کتنے
مکوڑے ہیں!"

اس نے دوبارہ کھودنا شروع کیا اور دم بھر بعد یکایک
بول اٹھا۔" میرے بیٹے تونے فضول یہ جتن کیا۔ میں اس مکان
کو بیچنے کا ارادہ کرچکا ہوں۔ برسات سے پہلے اسے نکال ہی
دینا ہے۔ تیری ماں کے جہیز کے لیے مجھے روپیوں کی ضرورت ہے،
اب سمجھا۔ خدا کرے کہ اسے خوشی نصیب ہو۔"

کدال پھینک کر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے وہ دھوبی گھر
کی طرف چلا گیا جہاں اس کی آرام کرسی پڑی رہتی تھی۔ میں نے
کھودنا شروع ہی کیا تھا کہ کدال میرے انگوٹھے پر آگری۔

اس سانحہ کی وجہ سے میں امّاں کی شادی میں کلیسا نہ جا سکا۔
گھر کے دروازے سے میں نے دیکھا کہ وہ سر جھکائے 'میکسوف'

کی بانہہ تھامے ہوئے ہے۔ سبزہ زار اور فرش پر وہ یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی گویا کانٹوں پر چل رہی ہو۔

شادی نہایت خاموشی سے ختم ہوگئی۔ گرجا گھر سے لوٹ کر سب نے اداسی سے چائے پی اور اماں فوراً کپڑے بدلنے اور سامان باندھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میرا سوتیلا باپ قریب آبیٹھا اور کہنے لگا: "میں نے تمھیں تصویریں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس شہر میں اچھی تصویریں دستیاب نہیں ہوسکیں، اور اپنے پاس کی تمھیں دینے سے رہا لیکن میں ماسکو سے خرید لاؤں گا۔"

"لیکن میں انھیں لے کر کیا کروں گا۔"

"کیوں، کیا تمھیں مصوّری پسند نہیں؟"

"مجھ سے تو سیدھی لکیر بھی کھینچی نہیں جاتی۔"

"کوئی ہرج نہیں، میں تمھارے لیے کوئی اور تحفہ لاؤں گا۔"

اتنے میں اماں اندر آئی: "ہم جلد لوٹ آئیں گے۔ تمھارے ابا کو امتحان دینا ہے۔ جیسے ہی وہ کامیاب ہوجائیں گے ہم دونوں یہاں آجائیں گے۔"

یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ مجھ سے برابری والوں کا سا برتاؤ کر رہے تھے۔ لیکن مجھے یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک ڈھیل بھی طالب علم ہوسکتا ہے۔

میں نے پوچھا: "آپ کیا سیکھ رہے ہیں؟"

"پیمائش"

میں نے یہ معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ یہ پیمائش کیا بلا ہے۔ مکان میں ایک بوجھل سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نرالے قسم کی ایک سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میری صرف یہ خواہش تھی کہ جلدی سے رات آجائے۔ نانا تندور کا سہارا لیے ہوئے ناک بھوں چڑھائے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑھیا سنبری بڑبڑاتی اور آہ بھرتی ہوئی سامان باندھنے میں اماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ نانی نے دوپہر کو اتنی پی لی تھی کہ اب شرم کے مارے اپنے کمرے میں منہ چھپائے لیٹ گئی تھی۔

اماں دوسرے دن تڑکے ہی روانہ ہوگئی۔ خدا حافظ کہتے وقت اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ ایک نئے انداز سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے مجھے چوما اور کہا:

"اچھا ——— الوداع"

گلابی آسمان پر نظر گاڑے ہوئے نانا نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "اسے سمجھا جاؤ کہ اسے میرا حکم ماننا چاہیے"

اماں نے مجھ پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

"نانا جان کا کہا کیا کرنا"

میرا خیال تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتی ہے اور مجھے نانا پر سخت غصّہ آیا کہ اس کی بات کاٹ دی۔

وہ دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اماں کا دامن کسی چیز میں اٹک گیا تھا اور وہ بپھر بپھر کر دیر تک اسے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔

نانا نے کہا: "ارے تو اندھا تو نہیں ہو گیا؟ اس کی مدد کیوں نہیں کرتا۔"

لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ میں آپ اپنے غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔ میرا سوتیلا باپ ٹانگیں سکیڑ کر گاڑی میں دھنس گیا اور نانی نے اس کے ہاتھ میں کچھ پلندے تھما دیے۔ انھیں اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اور ٹھڈّی دبا کر اس نے یہ الاپ لگائی: "بس بہت ہُوا آ آ!" تھکاوٹ کے مارے اس کے چہرے پر جھُرّیاں پڑ گئی تھیں۔

دوسری گاڑی میں سینرپری اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رونق افزا تھی جو تلوار کے دستے سے ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے جماہی لے رہا تھا۔

نانا نے پوچھا: "کیا آپ لڑائی کے لیے جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں، مجبوری ہے۔"

"یہ تو کار نیک ہے۔۔۔ ہمیں تُرکوں کی خبر لینی چاہیے۔"

وہ سب چلے گئے۔ امّاں نے کئی بار مڑ کر رومال ہلایا۔ نانی آنسوؤں میں شرابور، دیوار کا سہارا لیے ہوئے ہاتھ ہلاتی رہی۔ نانا نے آنسو پونچھ کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے تو اس کا انجام اچھا نظر نہیں ——آتا۔"

پھاٹک کے ستون پر بیٹھے بیٹھے میں گاڑی کے دھچکولے بازی کا تماشا دیکھتا رہا۔ مگر جیسے ہی وہ کونے میں جا کر آنکھ اوجھل ہوئی گویا میرے دل کا جھروکا یکایک بند ہو گیا۔ ابھی پو پھٹی تھی، مکانوں کی کھڑکیاں کھلی نہ تھیں اور سڑک سنسان تھی۔ میں نے کبھی زندگی کا ایسا فقدان نہ دیکھا تھا۔ دور کہیں گڈریا کوئی بے تُکا

سُر الاپ رہا تھا۔

نانا نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا: "چل آ، ناشتہ کریں۔ تیری قسمت میں میرا ہی ساتھ بدا ہے۔ جیسے اینٹ پر آگ کا اثر ہوتا ہے ویسے ہی تو مجھ پر اثر ڈال رہا ہے۔"

صبح سے شام تک ہم دونوں باغ میں کام کیا کرتے تھے۔ وہ کیاریاں لگاتا، قلم بندی کرتا اور کیڑوں کا قتل عام کرتا تھا۔ اور میں اپنے محل کی آرائش میں مصروف رہتا تھا۔ نانا نے ایک جلے ہوئے شہتیر کو کاٹ کر کھپچیاں زمین میں نصب کیں اور میں نے ان میں چڑیوں کے پنجرے ٹانک دیے۔ پھر میں نے سوکھی ہوئی گھاس کا گھنا جال بُنا اور دھوپ اور اوس سے بچنے کے لیے اسے اپنے چبوترے پر شامیانے کی طرح تان دیا۔ اپنے ارادے میں مجھے کامیابی ہوئی۔

نانا نے کہا: "اگر تجھے چیزوں کا بہترین استعمال کرنا آگیا تو یہ تیرے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔"

اس کی نصیحتوں کو میں بہت قیمتی سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ میرے چبوترے پر لیٹ جاتا جس پر میں نے گھاس بچھا دی تھی۔ ہر ہر لفظ کو یوں تول کر گویا وہ بدقت تمام انھیں تلاش کر سکا ہے، کہنے لگتا: "اب تو اپنی ماں سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔ اس کے گھر اور بچے ہوں گے اور وہ ان سے زیادہ محبّت کرے گی اور تیری نانی — اب اسے پینے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

دیر تک وہ یوں چُپ رہا گویا کسی کی باتیں سُن رہا ہو۔ پھر

بادل ناخواستہ یہ دل شکن کلمے زبان پر لایا۔

"یہ دوسری مرتبہ ہے کہ وہ شراب پینے لگی ہے۔ جب مائیکل فوج میں بھرتی ہؤا تو اس نے یہی علّت پال لی تھی۔ اور اس احمق کی منّت پر میں نے اسے فوج سے رہائی دلائی۔ اگر وہ سپاہی ہوتا تو کیا عجب کہ بدل جاتا... ہشت... دھت!... میں جلد مرجاوں گا۔ اور تو اکیلا رہ جائے گا۔ تجھے اپنی روٹیاں کمانی ہوں گی۔ سمجھتا ہے یا نہیں؟ ... شاباش!.... تجھے خود جفاکشی کی عادت ڈالنی چاہیے... اور دوسروں سے دب کر نہ رہنا۔ زندگی خاموشی، امن اور ایمانداری سے گزارنا سیکھو۔ دوسروں کا کہا سنو لیکن کرو وہی جسے اپنے لیے بہتر سمجھتے ہو۔"

ان دنوں کو چھوڑ کر جب موسم خراب ہوتا، میں نے ساری گرمیاں باغ میں گزاریں۔ اگر رات کو گرمی پڑتی، تو میں وہیں موم جامہ کے ایک ٹکڑے پر سوتا جو نانی نے مجھے دیا تھا۔ گاہ گاہے وہ بھی باغ میں سوتی۔ گھاس کی توشک بچھاکر وہ میرے پاس لیٹ جاتی اور دیر تک کہانیاں سنایا کرتی۔ بیچ بیچ میں رُک کر وہ اس قسم کی بے موقعہ رائے زنی کرنے لگتی تھی۔

"دیکھو!... ایک ستارا گر رہا ہے!۔ یعنی کوئی مظلوم روح درد میں مبتلا ہے... یا کوئی ماں اس دنیا کی یاد کر رہی ہے! اس کا مطلب یہ ہے کہ اسی گھڑی کسی نیک مرد یا عورت کا جنم ہؤا ہے۔"

یا وہ اُنگلی سے دکھا کر کہتی:

"ایک نیا تارا جگمگانے لگا۔ دیکھ، وہ کسی بڑی سی آنکھ سے مشابہ ہے۔۔۔۔ قربان جاؤں تجھ پر اے آسمان کے روشن دان!۔۔۔۔ اے خدا کے مقدس زیور۔۔۔۔"

نانا جان کڑک اٹھتے: "ارے پاگل، تجھے زکام ہوجائے گا۔ جب مرگی کا دورہ اٹھے گا تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ڈاکو آکر تجھے قتل کرجائیں گے۔"

کبھی کبھی غروب آفتاب کے وقت آسمان میں نور کی ندیاں بہنے لگتیں اور گمان ہوتا کہ ان میں آگ لگ گئی ہے۔ باغ کے مخملی سبزہ پر آتش پاروں کی بارش سی ہونے لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہر شے یک گونہ تاریک ہوکر وسیع تر ہوجاتی —— بھول سی جاتی۔ یہ اس وقت جب کہ شام کی لالی گہری ہوجاتی تھی۔ دھوپ میں جھلس کر پتیاں مرجھا جاتیں اور گھاس کے تنکے سر جھکا لیتے تھے۔ ہر چیز زیادہ نازک معلوم ہوتی اور ایسی مہک پھیلاتی جو موسیقی کی طرح خوش گوار ہوتی تھی۔ اور موسیقی کی ترنگیں کھیتوں سے اٹھ کر آتیں جہاں لوگ رہ رہ کر کچھ بجانے لگتے تھے۔

رات آتی۔ اور اس کے ساتھ دل میں ماں کے پیار کی سی شگفتگی اور حیات آفرینی پیدا ہونے لگتی۔ سناٹے نے اپنے گرم و گداز ہاتھوں سے دل کو تھپکی دی۔ اور سارے گرد و غبار کو دھو کر وہ سب کچھ بھلا دیا جسے بھول جانا چاہیے۔ چت لیٹے ہوئے آسمان کی نامحدود گہرائی —— ایسی گہرائی جو اپنی ہر بلندی میں ستاروں کی ایک نئی محفل سجاتی ہے —— ستاروں کی چمک دمک

کے نظارے میں کیسا مزا ملتا تھا۔ اور اس موقع پر اگر زمین پر قدم رکھو تو گمان ہوتا ہے کہ یا تو دنیا سمٹ گئی ہے یا تم بہت بڑے ہو گئے ہو اور اپنے ماحول میں سمائے جا رہے ہو۔ لمحہ بہ لمحہ تاریکی اور خاموشی بڑھتی جاتی ہے۔ تاہم نہایت ہی دھیمی اور ناقابل احساس آوازوں کا سلسلہ سا جاری رہتا ہے۔ اور ہر آواز ـــــ خواہ وہ کسی بلبل خوابیدہ کا ترانۂ نیم شب ہو یا کسی خرگوش کا سراسیمہ خرام یا کسی انسان کی زیرِ لب گفتگو ـــــ دن کی آوازوں سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ ایک خاص نرالا پن اس کے حسّاس سکون کے نیچے چھپا رہتا ہے۔

کہیں ہارمونیم بج رہا ہے۔ کوئی عورت قہقہہ لگا رہی ہے۔ کوئی تلوار سڑک کے روڑوں سے ٹکرا رہی ہے۔ کوئی کُتّا بھونک رہا ہے۔ مگر یہ آوازیں صدائے بازگشت ہیں، اُن پتّیوں کی دم واپسیں کی جو صبح کِھل کر شام کو مرجھا گئی تھیں۔

کبھی سڑک یا کھیت سے کسی متوالے کی چیخ یا بھگدڑ کا شور سنائی دیتا۔ مگر یہ ایسا معمولی واقعہ تھا کہ ہر طرف توجہ جاتی ہی نہ تھی۔

نانی کی نیند کچی تھی۔ میری طرف سے ذرا بھی اشارہ ملتے ہی وہ قصّہ خوانی شروع کر دیتی تھی اور اس کی ذرا بھی پروا نہ کرتی کہ میں سُن رہا ہوں یا نہیں۔ وہ ایسی کہانیوں کا انتخاب کرتی جو میرے لیے رات کو زیادہ محبوب اور دلکش بنا دیتی تھیں۔

اس کے میٹھے بولوں کی روانی مجھے نیند کی ندی میں بہلے جاتی اور میں چڑیوں کے چہچہے کے ساتھ جاگتا۔ سورج مجھے چشمک زنی

کرتا ہوتا اور اس کی کرنوں میں تپ کر نسیم صبح ہولے ہولے چلنے لگتی۔ سیب کے پیڑوں کی پتیاں اوس کی بوندوں کو جھٹک دیتیں۔ سبزہ ایسا تروتازہ ہو جاتا کہ پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ وہ آب رواں کی طرح شفاف ہوتا اور اس پر ایک ہلکا سا کُہرا منڈلانے لگتا۔ حدِّنظر سے دور آسماں کے قریب ایک چکور تان چھیڑ دیتی تھی۔ شبنم کے ابھارے ہوئے سب رنگ اور نکہت ایک راحت افزا ولولہ پیدا کرتے اور یہ خواہش ہوتی کہ جھٹ پٹ اٹھ کر کسی کام میں لگ جائیے اور سب جانداروں سے پیت کی پینگ بڑھائیے

میری پوری زندگی میں یہ سب سے بڑا استغراق اور پرامن زمانہ تھا۔ اس کے دوران میں مجھ میں اپنی طاقت کا احساس مضبوط ہُوا اور پروان چڑھا۔ میں جھینپو اور ناملنسار ہونے لگا۔ اور پڑوس کے بچوں کی پکاریں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہی رجب چچا زاد بھائی ہمارے گھر آئے تو میں ان سے برہم ہُوا اور مجھے ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں وہ باغ میں میرے جیو ترے کو توڑ نہ دیں —— وہ میری زندگی کا پہلا کارنامہ تھا۔

نانا کی بات چیت اب میرے لیے بالکل غیر دلچسپ ہوگئی تھی کیونکہ وہ روز بروز زیادہ روکھی پھیکی چڑ چڑی اور دکھ بھری ہوتی جاتی تھی۔ وہ اکثر نانی سے تکرار کرتا اور اگر وہ کبھی اپنے بیٹوں سے ملنے چلی جاتی تو اسے گھر سے نکال دیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کئی دن کے لیے غائب ہوگئی اور ان حضرت کو چولھا سنبھالنا پڑا۔ ہاتھ جلاکر وہ درد سے چلّا اٹھا اور غُصّے میں برتن توڑ دیے۔

اب اس کی حرص بڑھتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ میری جھونپڑی میں آکر سبزپوش چبوترے پر آرام سے دراز ہوجاتا اور تھوڑی دیر چپ چاپ مجھ پر نظریں گڑانے کے بعد پوچھ بیٹھتا۔

"تو یوں چپ کیوں ہے؟"

"بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں؟"

اب اس کا وعظ شروع ہوتا:

ہمارا شمار شریفوں میں نہیں ہے۔ کوئی ہمیں مشورہ دینے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ ہمیں آپ اپنی محنت سے علم حاصل کرنا ہے شریفوں کے لیے کتابیں اور مدرسے ہیں۔ مگر ہمارے لیے کون وقت برباد کرتا ہے۔ ہمیں آپ اپنی راہ تلاش کرنا ہے۔"

پھر وہ کسی دھیان میں مگن ہوگیا اور یوں بے حرکتی اور خود فراموشی کے عالم میں کھوگیا کہ اس کی موجودگی ناگوار گزرنے لگی۔

ایّام برسات میں اس نے مکان بیچ دیا۔ اس واقعہ کے چند روز قبل ایک صبح چائے پیتے پیتے اس نے یک بیک اعلان کیا۔

"بڑی بی، میں نے بہت عرصہ تمھاری پرورش کی۔ مگر اب تمھیں آپ اپنی روٹی کمانی ہوگی۔ سُنا؟"

نانی نے ایسے اطمینان سے یہ اعلان سُنا گویا عرصۂ دراز سے اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے ناس کی ایک چٹکی اپنی پلپلی ناک میں بھری اور کہا:

"کوئی ہرج نہیں۔ تمھاری یہ مرضی ہے تو مجھے بھی انکار نہیں!"

اب نانا نے ایک ٹیلے کے نیچے کسی دقیانوسی مکان کے تہ خانہ

میں دو اندھیرے کمرے کرائے پر لیے۔
جب ہم نے اپنے نئے ٹھکانے میں قدم رکھا تو نانی نے ایک پرانی جوتی تندور کے اندر رکھ کر گھر کے بھوت کا منتر جگایا:
"گھر کے بھوت، گھرانے کے بھوت! یہ رہی تیری سواری۔ ہمارے نئے گھر میں آ۔ اور سوئی ہوئی قسمت کو جگا!"
نانا نے آنگن سے یہ نظارہ دیکھتے ہی آواز لگائی۔
"اری کافر، میں تیرے حواس درست کردوں گا! تجھے کچھ میری عزت کا خیال ہے یا نہیں!"
نانی نے سنجیدگی سے جواب دیا: "اوئی بڑے میاں ایسی باتوں سے تمھارا بھلا نہ ہوگا۔" لیکن نانا کا غصہ نہ تھما اور اس نے 'گھر کے بھوت' کی نیاز کی ممانعت کردی
فرنیچر اور باقی سامان اس نے ایک تاتار کباڑیئے کے ہاتھ بیچ دیا۔ تین دن ان دونوں نے مول بھاؤ اور گالی گلوچ میں گزارے۔ نانی کھڑکی سے منہ نکال کر کبھی روتی کبھی ہنستی اور زیر لب بڑبڑاتی جاتی: "ان کا یہی حشر ہونا تھا! توڑدو، پھینک دو!" اپنے باغ اور جھونپڑے کے غم میں میں بھی رونگھا ہو رہا تھا۔
دو چھکڑوں میں لد کر ہم اپنے نئے گھر میں آئے۔ میں برتنوں کے بیچ میں اٹا ہوا تھا اور چھکڑا یوں بے تحاشہ دھچکے کھا رہا تھا۔ گویا مجھے ابھی سامان کے ساتھ باہر پٹک دے گا۔ اس دن کے بعد دو سال تک یعنی اماں کے انتقال تک مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی گویا میں سڑک پر پھینک دیا گیا ہوں۔ اس نقل مکان کے چند

روز بعد ہی اماں کی آمد ہوئی ۔ وہ دُبلی اور پیلی پڑ گئی تھی ۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک آ گئی تھی ۔ وہ ہم تینوں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی گویا پہلی بار دیکھا ہو۔ زبان سے وہ کچھ نہ بولی ۔ میرا سوتیلا باپ آہستہ سے سیٹی بجاتے اور کھنکھارتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔اس کے ہاتھ پیٹھ پر تھے اور انگلیاں پھڑک رہی تھیں ۔

اماں نے میرے گالوں کو اپنی گرم انگلیوں سے دبا کر کہا:۔
"ماشاءاللہ! تو کیسا لمتڑنگ ہو گیا ۔" وہ ایک غیر دلکش بھورا گاؤن پہنے ہوئے تھی اور اس کا پیٹ تنا ہُوا تھا ۔

سوتیلے باپ نے ہاتھ بڑھا کر کہا: "کہو میاں کیسے ہو؟" پھر ناک چڑھا کر بولا: "جانتے ہو یہاں کس قدر سیلن ہے؟"

وہ دونوں ایسے ماندے پڑ گئے تھے گویا دور سے پیدل چل کر آئے ہوں ۔ ان کے کپڑے گرد آلود ہو رہے تھے اور وہ لیٹ کر سو جانا چاہتے تھے ۔ جب وہ قہراً و جبراً چائے پینے لگے تو نانا نے دھلی دھلائی کھڑکی کی طرف دیکھ کر پوچھا:
"تو گویا آتش زنی میں آپ کا سارا مال متاع جل گیا؟"
سوتیلے باپ نے بے دھڑک جواب دیا: "وہ تو کہیے کہ ہماری جان بچ گئی ۔"

"اُفوہ! ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ۔"
نانی کی طرف جھک کر اماں نے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ یوں چُندھیا گئی گویا کوندا لپک گیا ہو۔ اب ماحول زیادہ

بے لطف ہونے لگا۔

اتنے میں نانا نے تیکھی مگر صاف آواز میں کہا:

"جناب یوجین صاحب، گستاخی معاف، سننے میں یہ آیا ہو کہ یہ آگ واگ نرا ڈھکوسلا ہو۔ آپ کا دیوالہ کسی جوئے گھر میں نکلا ہو۔"

اب تو موت کا سا سناٹا چھا گیا اور سماور کی سرسراہٹ اور پانی کی بوندوں کی ٹپ ٹپاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ بالآخر اماں نے نہایت دل نشیں انداز میں کہا:

"ابا جان ——"

اب تو نانا جان گلا پھاڑ کر چیخ اٹھے: "کیا کہتا ہو ابا جان سے! کیا میں نے تجھے سمجھایا نہ تھا کہ تیس سال کی گائے کا جوڑ بیس سال کے بچھڑے سے نہیں مل سکتا؟۔۔۔ اب اپنے کیے کی سزا بھگتو۔۔۔ اور یہ ہو وہ لچا! بڑا شریف زادہ بنا ہوا تھا۔۔۔ کیوں؟ ۔۔۔ بیٹی اب مزاج درست ہوئے؟"

وہ چاروں زور زور سے شور مچانے لگے اور ان میں میرے سوتیلے باپ کی غراہٹ سب سے زیادہ زور دار تھی۔ میں برساتی میں جاکر لکڑیوں کی ڈھیر میں بیٹھ گیا۔ اماں میں یہ قیامت کی تبدیلی دیکھ کر میں بھوچکا رہ گیا۔ کمرے کے اندر اس تغیر کا مجھ پر وہ اثر نہ ہؤا تھا جو باہر شفق میں اس خیال سے پیدا ہوا۔

یہاں سے ہم 'سورموفا' کے ایک نئے مکان میں کیوں منتقل ہوئے، اس سلسلے کے واقعات اب میں بھول گیا ہوں۔۔ اس کی

دیواریں ننگی تھیں اور شہتیروں کی دراڑوں میں گھاس اُگ رہی تھی اور ان میں تل چٹے بھرے ہوئے تھے۔ میرا سوتیلا باپ اماں کے ساتھ دو کمروں میں رہتا تھا، جن کی کھڑکیوں کا رُخ سڑک کی طرف تھا۔ میں نانی کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا جس کا جھروکا چھت سے ملا ہوا تھا۔ چھت کے مقابل کسی کارخانے کی چمنیاں تھیں جو ہمیشہ دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھیں۔ جاڑوں کی تیز ہوا اس دھوئیں کو سارے گانو میں پھیلا دیتی تھی اور ہمارے سرد کمروں سے ہمیشہ جلاندگی بو آیا کرتی تھی۔ تڑکے میں بھیڑیوں کی غرّاہٹ سنائی دیتی تھی۔

اسٹول پر کھڑے ہوکر میں بالائی جھروکے سے کارخانے کے پھاٹک کو دیکھ سکتا تھا جسے کسی بوڑھے بھکاری کے کالے اور پوپلے منہ کی طرح ادھ کھلی لالٹینیں اجالتی ہوتی تھیں اور انسانوں کا گروہ اس کے اندر آتا جاتا تھا۔ دوپہر کو پھاٹک کا سیاہ دہانہ دوبارہ کھلتا اور کارخانہ ادھ چبائے مزدوروں کو باہر اُگل دیتا یہ لوگ ایک کالی نالی کی مانند سڑک پر بہتے جاتے تھے حتیٰ کہ برفیلی ہوا کا جھونکا آتا اور انھیں مکانوں کے اندر دھکیل دیتا۔ شاذ و نادر ہی آسمان دکھائی دیتا ہو؛ ورنہ مکانوں کی چھتوں اور دُود آلود برف کی تہوں پر ایک بھورا اور مٹ میلا گنبد کھڑا رہتا تھا جو تخیل کو کچل کر اپنی بے انتہا یکرنگی سے اندھیرا سا پیدا کر دیتا تھا۔

شام کے وقت کارخانے پر ایک ہلکی سی سرخی چھا جاتی اور

چمنیوں کو روشن کر دیتی ۔ اس گھڑی یہ گمان ہوتا کہ چمنیاں زمین سے نکل کر آسمان کی طرف نہیں اٹھی ہیں بلکہ دھنوئیں کی چادر سے پیدا ہوکر زمین کی طرف جھک رہی ہیں ۔ اور یہ معلوم ہوتا کہ گرتے گرتے وہ آگ تھوک رہی ہیں اور گرج رہی ہیں ۔

یہ تماشا مجھے اکتا دیتا تھا اور اس کی بے رنگی میرے دل پر بار سا دلا دیتی تھی ۔نانی گویا سارے گھر کی نوکرانی تھی ۔ وہ صبح سے شام تک کھانا پکاتی ، جھاڑو دیتی لکڑی کاٹتی یا پانی بھرتی رہتی تھی ۔ جب وہ پلنگ پر لیٹتی تو تھکاوٹ کے مارے چور چور ہو جاتی تھی اور لمبی لمبی سانسیں بھر کر بڑبڑانے لگتی تھی ۔ کبھی کبھی کھانا پکا کر وہ اپنی اونی انگیا پہنتی اور سائے کو اوپر چڑھا کر شہر کی راہ پکڑتی ۔

"جا کر بڑے میاں کو دیکھ آؤں کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں تو اکڑ جائے گا۔ دیکھتا نہیں کیسی برف پڑ رہی ہے۔"

اور وہ سڑکوں یا برف پوش کھیتوں سے ہوتی ہوئی پانچ میل چل کر وہاں جاتی ۔

میری ماں جو حاملہ تھی ، پیلی اور جاڑے میں کانپتی ہوئی ایک پھٹی ہوئی شال اوڑھے رہتی تھی جس میں کناری ٹنکی ہوئی تھی ۔

مجھے اس شال سے نفرت تھی کیونکہ وہ اس کے سڈول جسم کو بدنما بنا دیتی تھی ۔ مجھے شال کی کناری سے چڑھ تھی اور میں نے اسے پھاڑ ڈالا ۔ مجھے اس مکان سے ، کارخانے سے ، گانو سے —

ہر چیز سے نفرت تھی۔ امّاں پھٹی ہوئی جوتیاں پہنے رہتی تھی۔ جب وہ چلتی تو اس کا بے ڈول پیٹ ہلنے لگتا۔ اور اس کی بھوری نیلی آنکھوں میں ایک سخت چمک آجاتی۔ اکثر وہ دیوار سے لگ کر دیر تک یوں بے حرکت کھڑی رہتی گویا اس میں چن دی گئی ہو۔ کبھی کبھی وہ گھنٹوں کھڑکی سے سڑک کو تا کا کرتی اور یہ سڑک اس جبڑے کی مانند تھی جس کے آدھے دانت بڑھاپے کی وجہ سے سڑ گئے ہوں اور ہل گئے ہوں اور باقی آدھے کالے پڑ گئے ہوں۔

میں نے پوچھا: "آخر ہم نے یہ جگہ رہنے کے لیے کیوں چنی؟"

"افوہ!۔۔۔ تو نے پھر بک بک شروع کی۔ چپ رہتا ہے یا نہیں!"

وہ مجھ سے بہت کم باتیں کرتی تھی۔ اگر کبھی کچھ کہا بھی تو کسی کام کے سلسلے میں: "یہاں آ۔۔۔ وہاں جا۔۔۔ یہ لا!"

مجھے باہر جانے کی اجازت اکثر نہ ملتی تھی۔ اور میں باہر سے ہمیشہ زخم خوردہ واپس آتا تھا۔ کیونکہ مار پیٹ میری تنہا دلچسپی تھی اور میں جی کھول کر اس کھیل میں حصّہ لیتا تھا۔ اس کی وجہ سے امّاں مجھے اپنے کمر پٹے سے ٹھونکا کرتی تھی۔ مگر یہ سزا مجھے اور بھی برہم کرتی اور میں دوسری مرتبہ زیادہ جوش سے لڑتا۔ اسی مقدار سے امّاں کی پٹائی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ یہ مقابلہ جاری رہا حتیٰ کہ ایک روز میں نے اسے اچھی طرح جتا دیا کہ اگر اس نے مجھے پیٹنا بند نہ کیا تو میں اسے کاٹ کھاؤں گا اور گھر سے بھاگ کر برف میں دب مروں گا۔ یہ سن کر وہ حیرت سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مجھے دھکیل کر وہ تھکاوٹ کے مارے ہانپتی ہوئی

کمرے میں ٹہلنے لگی اور بولی:

"ارے تو تو وحشی جانور ہُوا جا رہا ہے!"

اب وہ جذبہ جسے محبّت کہتے ہیں میرے دل میں قوس قزح کی مانند تھرتھرانے لگا۔ کسی دؤدکشں کی سیاہ لپٹ کی مانند ہر آدمی کے خلاف میرا غصّہ بڑھنے لگا اور میرے سینے پر چڑچڑے پن کی وجہ سے بوجھ سا رہنے لگا۔ اس بے معنے و بے رنگ ماحول میں اکیلے پن کا احساس مجھے ستانے لگا۔

سوتیلا باپ مجھ سے سختی کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ اماں سے شاید ہی کبھی بولتا ہو۔ یا تو وہ سیٹی بجاتا یا کھانستا رہتا اور کھانے کے بعد آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اپنے نکلے ہوئے دانت کو تنکے سے کریدا کرتا تھا۔ اماں سے اس کے جھگڑے بڑھنے لگے اور وہ غصّے میں تو کی بجائے اسے 'تم' سے مخاطب کرتا — اور یہ عادت مجھے حد سے زیادہ ناپسند تھی۔ تکرار شروع ہوتے ہی وہ باورچی خانے کا دروازہ بند کر دیتا تاکہ میں اس کی باتیں نہ سن سکوں مگر اس کی کرخت آواز کو میں صاف سن سکتا تھا۔ ایک دن وہ پیر پٹک کر چلّا اٹھا:

"چونکہ اپنی حماقت کی وجہ سے تم گابھن ہو گئی ہو، میں کسی یار دوست کو گھر نہیں بُلا سکتا! گائے کہیں کی!"

مجھے ایسا تعجب ہُوا اور میں اس قدر بپھرا کہ اوپر اچھل کر چھت سے ٹکرا پڑا اور اتنے زور سے زبان کاٹی کہ لہو نکلنے لگا۔

سنیچر کے دن مزدور دس دس کی ٹولی بنا کر میرے سوتیلے

باپ کے ہاتھ 'خوراکی کے ٹکٹ' بیچنے کی غرض سے آتے تھے۔ قاعدے کے مطابق انھیں یہ ٹکٹ کارخانے کے بھٹیار خانے میں صرف کرنا چاہییں تھے۔ میرا سوتیلا باپ انھیں آدھے داموں میں خرید لیتا تھا۔ باورچی خانے میں وہ بڑی اکڑ سے بیٹھ جاتا اور مزدوروں کے ٹکٹ دیکھ دیکھ کر کہا کرتا: "ڈیڑھ روبل!"

"یوجین صاحب، للہ ـــــ"

"بس کہہ دیا ڈیڑھ روبل!"

شکر ہی کہ اماں کی زچگی کے وقت یہ آشوب ختم ہوگیا کیونکہ میں نانا کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہ 'کُنوں' کے ایک دو منزلہ مکان کی ایک تنگ سی کوٹھڑی میں رہنے لگا تھا۔ کوٹھڑی ایک کچی سڑک کی طرف کھلتی تھی جس کا ڈانڈا گرجا گھر سے ملا ہؤا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک تندور تھا اور اس کی دونوں کھڑکیاں آنگن کی طرف کھلتی تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہوگیا:

"بھئی یہ کیا مذاق ہی! اب تک تو یہی سننے میں آیا تھا کہ ماں سے بڑا ہیت کوئی نہیں۔ مگر اب ثابت ہؤا کہ بھتنے نانا کے سوا کوئی دوست نہیں۔ ہشت ... دھت!"

ابھی میں اپنے نئے مکان کا معائنہ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ نانی اماں اور بچّے کو لیے ہوئے آدھمکی۔ مزدوروں کی گرہ کاٹنے کے جرم میں میرا سوتیلا باپ برطرف کردیا گیا تھا۔ اب وہ کسی نئی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا اور اسٹیشن کے ٹکٹ گھر میں

اسے فوراً کام مل بھی گیا۔ ایک طویل بے لطف زمانے کے بعد میں دوبارہ امّاں کے ساتھ کسی گودام کے تہ خانے میں رہنے لگا۔ مہلت ملتے ہی امّاں نے مجھے اسکول روانہ کیا۔ اور اول دن سے ہی مجھے اس ادارے سے نفرت ہوگئی۔

میری وجہ یہ تھی کہ پیروں میں امّاں کی جوتی، نانی کی انگیا کا بنا ہوا کوٹ زیب تن اور اس کے نیچے ایک پیلا کرتا اور پائجامہ جس کے پائینچے لمبے کر دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس پوشاک کی وجہ سے سب میرا مذاق اڑانے لگے۔ اور پیلے کرتے کی وجہ سے مجھے اینٹ کے اِکّے کا لقب ملا۔

لڑکوں سے جلد میری دوستی ہوگئی۔ مگر ماسٹر اور پادری کو میں ایک آنکھ نہ بھایا۔

ماسٹر کا چہرا زرد اور سر گنجا تھا اور اس کی ناک سے ہمیشہ خون بہا کرتا تھا۔ جب وہ کلاس میں آتا تو اس کی ناک میں روئی ٹھنسی ہوتی تھی۔ اور کرسی پر بیٹھ کر منمنی آواز میں سوال پوچھتے پوچھتے کسی جملے کے بیچ میں اچانک رُک کر وہ نتھنوں سے روئی نکالتا اور اسے دیکھ کر سر ہلانے لگتا تھا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور روکھا تھا اور اس کی جھرّیوں میں سبزی کی جھلک تھی۔ مگر سب سے زیادہ مہیب چیز اس کی آنکھیں تھیں جن کا رنگ جست کا سا تھا اور وہ ایسے کریہہ انداز سے مجھے گھورا کرتی تھیں کہ مجھے محسوس ہوتا کہ اپنے گال کو نوچے بغیر ان نگاہوں سے بچ نہیں سکتا۔

کئی روز کلاس میں میرا نمبر اول رہا اور مجھے ماسٹر کی میز کے قریب بیٹھنا پڑا۔ یہ مصیبت ناقابل برداشت تھی کیونکہ بظاہر وہ میرے سوا اور کسی کو نہ دیکھتا تھا اور ہمیشہ ممیایا کرتا تھا۔

"پیشکوف، تم صاف قمیص کیوں نہیں پہنتے۔ پیشکوف پاؤں کیوں پٹک رہے ہو۔ پیشکوف جوتے کے بند کیوں نہیں باندھتے"

لیکن اس بدسلوکی کا مزہ بھی ان حضرت کو چکھنا پڑا۔ ایک روز میں نے تربوز کے آدھے حصے کا کھوکھل لیا اور اسے دروازے کی چرخی سے باندھ دیا۔ جب دروازہ کھلا تو تربوز اوپر اُٹھ گیا مگر جب ماسٹر نے اسے بند کیا تو تربوز ٹوپی کی مانند اس کی گنجی کھوپری میں کھٹ سے بیٹھ گیا۔ چپراسی شکایت نامہ کے ساتھ مجھے ہیڈ ماسٹر کے گھر لے گیا اور اس شرارت کی پاداش میں میری خوب کُندی ہوئی۔

دوسری مرتبہ میں نے اس کی میز پر ناس چھڑک دی اور وہ چھینکتے چھینکتے ایسا تنگ آیا کہ کلاس چھوڑ کر بھاگا اور اپنے عوض اپنے سالے کو بھیج دیا۔ یہ ایک حولدار تھا اور اس نے "ہمیں زندہ باد شاہ زار!" اور "آزادی اور آزادی!" کے ترانے الاپنے کا حکم دیا۔ جو لڑکے سُر نہ ملا سکے اس نے ان کی کھوپریوں پر اپنے ڈنڈے سے وہ گت بجائی کہ ایک کھوکھلی سی آواز آئی اور اچھی خاصی چوٹ لگی۔

پادری ایک گبھرو جوان تھا اور اس کے بال لمبے لمبے تھے۔

وہ مجھے پسند نہ کرتا تھا کیونکہ ایک تو میرے پاس انجیل نہ تھی، دوسرے میں اس کے انداز تقریر کی نقل اُڑاتا تھا۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ پوچھتا:

"پیشکوف، تم وہ کتاب لائے یا نہیں؟ ہاں، ہاں، کتاب!"

"جی نہیں، میں کتاب نہ لا سکا۔ ہاں، ہاں۔"

تمھاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں یا نہیں؟"

"نہیں"

تو پھر یہاں سے تشریف لے جائیے۔ ہاں، میں آپ کو سبق نہیں دینا چاہتا۔ ہاں، اس سے کیا فائدہ؟"

بھلا اس سے میرا کیا بگڑتا تھا۔ اس سبق کے دوران میں میں گانو کی گندی سڑکوں پر قلا بازیاں کھاتا پھرتا اور وہاں کی پُر ہنگامہ زندگی کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔

اس پادری نے عیسیٰ کا سا حسین مکھڑا پایا تھا، آنکھوں میں زنانہ لجیلا پن تھا اور اس کے ننھے ہاتھ نازک تھے۔ اس کی ہر ادا میں نفاست تھی۔ وہ جو بھی چیز اٹھاتا ——— خواہ وہ قلم ہو یا کتاب ——— اسے نفاست سے برتتا گویا اس میں جان ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ گویا اس سے اسے محبت ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں یہ روٹھ نہ جائے۔ وہ طالب علموں سے کچھ بہت اچھا سلوک نہ کرتا تھا تاہم یہ سب اسے چاہتے تھے۔

اس کے باوجود کہ میں ذہین اور محنتی تھا، مجھے کچھ عرصے بعد ہی تاکید کر دی گئی کہ بیہودہ روی کے جرم میں میں اسکول سے

نکال دیا جاؤں گا۔ یہ سُن کر میرے چھکّے چھوٹ گئے کیونکہ اس کا انجام میرے سامنے تھا۔ امّاں کی بد دماغی روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور وہ مجھے بُری طرح پیٹا کرتی تھی۔

مگر میری نجات کے اسباب نکل آئے۔ پادری 'خرزناف'[ھ] ایک دن بے اطّلاع ہمارے اسکول کی طرف نکل آیا۔ اس کا قد ٹھنگنا تھا اور اگر میں بھولتا نہیں تو وہ کُبڑا تھا۔ بس کوئی جادوگر معلوم پڑتا تھا۔

وہ میز پر بیٹھ گیا۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں اور بھی چھوٹا معلوم ہونے لگا اور اس کی مضحکہ خیز ٹوپی بالٹی کی طرح اس کے سر پر جمی ہوئی تھی۔ آستینوں سے اپنے ہاتھ نکال کر اس نے کہا:

"بچّو، آؤ، ہم کچھ گپ شپ کریں۔"

کمرے میں گرمی سی آگئی اور ایک نرالا خوشگوار ماحول پیدا ہوگیا۔ کئی لڑکوں کے بعد اس نے مجھے میز کے پاس طلب کیا اور سنجیدگی سے پوچھا:

"تمھاری عمر کیا ہے؟ ایں، بس اتنی! لیکن تم کتنے اونچے پورے ہو! میرا خیال ہے کہ تم نے اکثر بارش کے پانی میں اشنان کیا ہے۔ کیوں؟"

ایک سوکھا سا ہاتھ جس کے ناخون لمبے اور تیز تھے، میز پر رکھ کر اور دوسرے سے اپنی چھدری ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے وہ اپنی مہربان آنکھیں میرے قریب لایا:

---

ھ یہ کئی مشہور کتابوں کا مصنّف تھا۔ "عورت وشادی" پر اُس نے ایک پُرمغز مقالہ لکھا تھا جس کا جوانی میں مجھ پر بڑا اثر ہُوا۔ (گورکی)

"اچھا یہ بتاؤ کہ تھیں انجیل کا کون سا قصہ پسند ہی" جب میں نے کہا کہ میرے پاس انجیل نہیں ہی اور میں اس علم سے بے بہرہ ہوں تو وہ اپنے کنٹوپ کو کھینچ کر بولا :

"یہ کیا ماجرا ہی؟ - یہ تمھارا پہلا فرض ہی - لیکن شاید تم نے دوسروں کی زبانی سن سن کر کچھ سیکھا ہی۔ تھیں مناجات یاد ہی؟ شاباش! اور دعائیں بھی؟ . . . تو اور کیا چاہیے! - اولیا کے حالات بھی؟ . . . اور نظم میں؟ . . . ارے تو تو اس مضمون میں بہت ہوشیار ہی۔"

اسی وقت ہمارے پادری صاحب ہانپتے کانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑے پادری نے اسے دعا دی لیکن جب اس نے میری بابت اپنی چونچ کھولی تو بڑے میاں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا :

"بھئی، معاف کرنا . . . ایک منٹ کے لیے؟ . . ہاں، میاں، وہ الکسی علیہ الرحمۃ کا قصہ کیا ہی؟"

جب یہ نظم سناتے سناتے اگلا بند بھول کر میں چپ ہو گیا تو بڑے پادری نے کہا :

"مزے کی نظم ہی - اچھا اب کچھ اور سناؤ - حضرت داؤد کا قصہ؟ . . . ہاں ہاں میں غور سے سُن رہا ہوں۔"

وہ دراصل کان لگا کر سُن رہا تھا اور یہ نظمیں اسے پسند آئیں۔ دیر تک مجھے سر سے پانو تک دیکھ کر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔

"یہ مناجاتیں تھیں کس نے سکھائیں؟ تمھارے نانا بڑے

بھلے مانس ہوں گے" ؟ "نہیں !" "ایں بُرے ہیں ! ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ۔ ۔ ۔ تم ضرور بڑے شریر ہوگے ۔"

پہلے تو میں جھجکا مگر بالآخر قبولنا ہی پڑا : "جی ہاں"۔ ماسٹر اور پادری نے فوراً میرے اعتراف کی دلی تائید کی ۔ بڑا پادری سر جھکائے اس فردِ جرم کو سنتا رہا اور پھر لمبی سانس بھر کر بولا:

"سنا ، تمھارے بارے میں ان کی رائے کیا ہے ؟ یہاں آؤ۔"

اپنا ہاتھ ، جس سے سرو کی لکڑی کی بو آرہی تھی میرے سر پر پھیر کر اس نے پوچھا:

"تم اس قدر شریر کیوں ہو؟"

"پڑھنے میں جی نہیں لگتا ۔"

بیٹے ، یہ نہ کہو ۔ اگر تم نے جی نہ لگایا تو علم نہ آئے گا کیونکہ تمھارے استادوں کی رائے ہے کہ تم بہت ذہین ہو ۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمھاری شرارتوں کا سبب کچھ اور ہے ۔"

جیب سے ایک نوٹ بک نکال کر وہ اس میں کچھ لکھنے لگا :

"الکسی پیشکوف ۔ ۔ ۔ میرے بچے ، ضبط سے کام لینا اور ضرورت سے زیادہ شرارت نہ کرنا ۔ ۔ ۔ تھوڑی بہت شرارت ہمیں منظور ہے ۔ لیکن لوگوں کی جان پر اور کیا مصیبتیں کم ہیں کہ ان میں اضافہ کیا جائے ۔ بچو . کیا میں غلط کہتا ہوں ؟"

کئی لڑکوں نے ہنستے ہوئے کہا: "جی نہیں"

"میرا خیال ہے کہ تم سب زیادہ اودھم نہیں مچاتے ۔ کیوں ؟"

لڑکوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر جواب دیا :

"ہم بھی بڑے شریر ہیں۔"

بڑے پادری نے کرسی کا ٹیکا لے کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور یہ سن کر ہم سب کو اچنبھا ہُوا حتیٰ کہ ماسٹر اور پادری بھی ہنسی نہ روک سکے:

"دوستو، یہ حقیقت ہے کہ جب میں تمھاری عمر کا تھا تو تم سے زیادہ شریر تھا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

وہ بچوں سے پیچیدہ سوال پوچھنے لگا اور وہ گڑ بڑا کر ایک دوسرے سے الجھنے لگے جس سے لطف دوبالا ہوگیا۔ آخر کار وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہُوا۔

"بچو، تمھاری صحبت نہایت پُرلطف ہے لیکن مجھے اب رخصت ہونا چاہیے۔"

اپنی آستین ہٹا کر اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور ہم سب پر صلیب کا نشان بنا کر دعا دی:

"خدا، بیٹے اور روح القدس کے نام پر میں تمھاری برکت کی دعا مانگتا ہوں۔ اچھا، خدا حافظ۔"

ہم سب بیک آواز چیخ پڑے:

"خدا حافظ۔ حضرت، جلد لوٹیے گا۔"

اپنا کنٹوپ ہلا کر وہ بولا:

"میں جلد آؤں گا اور تمھارے لیے کتابیں لاؤں گا۔"

باہر جاتے جاتے وہ ماسٹر سے کہتا گیا "اب انھیں چھٹی دے دیجیے۔"

میرا ہاتھ تھامے تھامے وہ باہر آیا اور جھک کر بولا:

"اب تم آپے سے باہر نہ ہوگے۔ کیوں ؟ ۔۔۔ یہ وعدہ رہا۔ میں تمھاری شرارتوں کی وجہ سمجھ گیا ۔۔ ۔ بیٹے، خدا حافظ۔"

میں سخت اشتعال کے عالم میں تھا ۔ میرے دل میں عجیب وسوسے اٹھ رہے تھے ۔ اور جب ماسٹر سب کو چھٹی دے کر مجھے سمجھانے لگا کہ آئندہ مجھے برف کی مانند سرد اور گھاس کی مانند نرم رہنا چاہیے تو میں غور سے فرماں برداروں کی طرح اس کی تقریر سنتا رہا۔

پادری نے لبادہ اوڑھتے ہوئے اس کے سُر میں سُر ملایا:

اور آج سے تمھیں میری کلاس میں آنا ہوگا ۔ ہاں ہاں۔ اور اب تم گڑبڑ نہیں کر سکتے ۔ ہاں ہاں۔

ادھر اسکول میں معاملات سلجھ رہے تھے کہ گھر میں ایک بدمزہ واقعہ پیش آیا ۔ میں نے اماں کا ایک روبل (روپیہ) چُرا لیا۔ یہ گناہ بلا ارادہ سرزد ہُوا تھا ۔ ایک شام کو بچہ اور گھر کی دیکھ ریکھ میرے سپرد کر کے اماں کہیں باہر گئیں۔ دل بہلانے کے لیے میں سوتیلے باپ کی ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کے اوراق کے بیچ میں دو نوٹ نظر آئے ، ایک دس روبل کا۔ دوسرا ایک روبل کا ۔ کتاب میری سمجھ میں خاک نہ آئی اور میں نے اسے بند کر کے رکھ دیا ۔ لیکن یک بیک یہ خیال دل میں آیا کہ اگر ایک روبل میرے ہاتھ لگ جائے تو میں انجیل کے علاوہ "روبن سن کروسو" کی داستان بھی خرید سکتا ہوں ۔ اس کتاب کے وجود کا علم مجھے کچھ روز پہلے اسکول میں ہُوا تھا ۔ دوپہر کی چھٹی کے وقت میں ہم جولیوں

کو بھوت پریت کا کوئی قصّہ سنا رہا تھا ۔ اتنے میں ان میں سے ایک نے حقارت سے کہا :

”تم نے یہ کیا طوطا کہانی نکالی ہو ! مجھے تو بس روبن سن پسند ہو کیونکہ وہ ایک سچا واقعہ ہو ۔“

جب میں نے یہ دیکھا کہ اور بھی کئی دوست یہ کتاب پڑھ چکے ہیں اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں تو مجھے سخت غصہ آیا کہ یہ نانی کی کہانیوں کو پسند نہیں کرتے ۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ روبن سن پڑھ کر انھیں بتاؤں گا کہ یہ کیسی طوطا کہانی ہو !

دوسرے دن میں انجیل اور اینڈرسن کی کہانیوں کی دو پھٹی ہوئی جلدیں خرید کر اسکول لے گیا ۔ ساتھ ساتھ تین موٹے موٹے پراٹھے اور آدھ سیر قیمہ بھی تھا ۔ گرجا گھر کے پاس ایک چھوٹی سی دوکان میں روبن سن کی داستان بھی تھی ـــــ ایک چھوٹی سی کتاب جس کا سرورق زرد تھا اور اس پر ایک ڈڑھیل آدمی کی تصویر تھی جس کے جسم پر کسی جانور کی کھال پڑی ہوئی تھی ۔ مجھے کتاب کی ظاہری شان پسند نہ آئی ۔ اس کے برعکس اینڈرسن کی کہانیاں گو پھٹی پرانی تھیں تاہم اس روپ میں بھی بھلی لگتی تھیں ۔

کھیل کے گھنٹے میں میں نے پراٹھے اور قیمہ کی دعوت رچائی اور پھر ہم سب مل کر وہ لاجواب کہانی ”بلبل“ پڑھنے لگے جس نے ہمارے دلوں کو موہ لیا ۔

”چین میں چینیوں کے سوا کوئی نہیں رہتا ، یہاں تک کہ ان کا بادشاہ بھی ایک چینی ہو !“ مجھے یاد ہو کہ اس سیدھے سادے رسیلے

جُملے نے مجھے کتنا متاثر کیا۔ اس قصے میں اور بھی خوبیاں تھیں۔
لیکن اسکول میں ان قصوں کو پڑھنے کی فرصت کب تھی۔ جب میں گھر لوٹا تو امّاں نے کڑھائی اٹھاکر جس میں وہ انڈے تل رہی تھی، ایک عجیب انداز میں پوچھا۔

"کیا تم نے وہ روبل نکالا تھا؟"

"جی ہاں — اس کتاب کے اندر مجھے ملا۔"

امّاں نے کڑھائی سے مجھے تابڑ توڑ ٹھونکا اور سب سے بڑی سزا یہ دی کہ اینڈرسن کی کتابوں کو کسی ایسی جگہ چھپا دیا کہ پھر وہ میرے ہاتھ نہ لگیں۔

میں کئی روز اسکول نہ گیا۔ اس اثنا میں میرے سوتیلے باپ نے ضرور اپنے کسی دوست کو یہ واقعہ سُنایا ہوگا اور اس کے بچّے یہ خبر اسکول میں پھیلا آئے۔ چنانچہ وہاں میرا درود ہوتے ہی سب نے "چور چور!" کے نعروں سے میرا استقبال کیا۔

یہ تعریف نہایت جامع اور واضح تھی۔ لیکن یہ مجھ پر صادق نہ آتی تھی کیونکہ میں نے فوراً اس امر کا اقرار کرلیا تھا۔ میں نے انھیں قائل کرنا چاہا مگر وہ کب مجھ پر اعتبار کرنے لگے تھے۔ سو گھر لوٹتے ہی میں نے امّاں کو نوٹس دے دیا کہ میں آئندہ اسکول نہ جاؤں گا۔

وہ دوبارہ حاملہ ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں آزردہ اور چہرہ غمگین تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے میرے بھائی ساشا کو دودھ پلا رہی تھی۔ میری دھمکی سنتے ہی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا:

"تمھارا شبہ غلط ہے۔ کسی غیر کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ تم نے

روبل نکالا تھا۔"

"آپ خود چل کر ان سے پوچھ لیجیے۔"

"تم نے خود اپنا بھانڈا پھوڑا ہوگا۔ کیوں یہی بات ہے نا؟۔ دیکھو، میں معلوم کر کے رہوں گی کہ اسکول میں کس نے یہ خبر پھیلائی۔"

جب میں نے اس ہمجولی کا نام سنایا تو اماں کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

باورچی خانے میں جا کر میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا — یعنی ایک بڑا سا صندوق، جو تندور کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ لیٹے لیٹے میں اماں کی کراہ سن سکتا تھا — "اللہ! میرے اللہ!"

دھو کر سکھائی ہوئی جھاڑنوں کی مکروہ بدبو ناقابل برداشت تھی اور میں اٹھ کر آنگن کی طرف جا رہا تھا کہ اماں نے مجھے آواز دی:

"کہاں جا رہے ہو؟ میری بات سنو۔ یہاں آؤ۔"

ہم فرش پر بیٹھ گئے۔ ننھا 'ساشا' اماں کی گود میں لیٹے لیٹے اپنے بٹن سے کھیلنے اور اپنی توتلی زبان میں "بٹن بٹن" چلّانے لگا۔

میں اماں سے لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے چوم کر کہا:

"ہم ۔۔۔ غریب ہیں ۔۔۔ اور ایک ایک چھدام ۔۔۔" وہ یہ جملہ ختم نہ کر سکی اور اپنے گرم بازوؤں میں مجھے لپیٹ لیا۔

"مہمل ۔۔۔ لغو!" وہ یکایک چیخ اٹھی۔ پہلے بھی میں یہ الفاظ اس کی زبان سے سن چکا تھا۔

ساشا دہرانے لگا: "لگو!"

یہ بھی ایک ہی اچنبھے کا بچّہ تھا۔ بالکل گُدڑول تھا۔ اس کا سر بڑا تھا اور وہ اپنی خوبصورت نیلی کالی آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھتا اور چپ چپ یوں مسکراتا گویا کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ خلاف معمول وہ بہت جلدی باتیں کرنے لگا تھا اور ہمیشہ ایک خاموش اطمینان کی کیفیت میں رہتا تھا۔ وہ کمزور تھا اور بمشکل رینگ سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھتا اور میری گود میں آنے کے لیے مچلنے لگتا۔ اپنی نرم نرم انگلیوں میں میرے کانوں کو اینٹھ کر وہ خاص طور پر خوش ہوتا۔ معلوم نہیں کیوں اس کی انگلیوں سے نرگس کے پھولوں کی مہک آتی تھی۔ اس کی موت اچانک ہوئی کیونکہ وہ پہلے سے بیمار نہ تھا۔ صبح وہ حسب عادت خوش خوش اُٹھا اور شام کو قبر میں سلا دیا گیا۔ یہ واقعہ دوسرے بچّے نکولائی کی پیدایش کے بعد ہی پیش آیا۔ امّاں نے اپنے وعدے کے مطابق اسکول میں میری مشکلات کو آسان کر دیا تھا۔ لیکن اسی دوران میں میں ایک دوسری مصیبت میں جا پھنسا۔

شام کی چائے کے وقت میں آنگن سے ہو کر باورچی خانے میں داخل ہو رہا تھا کہ امّاں کی پُرحسرت آواز سنی:

"یوجین، میں تمھارے پانو پڑتی ہوں —"

سوتیلے باپ نے گھڑک کر کہا: "بک بک نہ کرو۔"

"لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اس عورت سے ملنے جا رہے ہو۔"

"ہاں، تو کیا ہُوا؟"

گھڑی بھر وہ دونوں چپ رہے۔ پھر امّاں نے کھانستے ہوئے کہا:

"تم کتنے مہمل اور کمینے ہو۔"

میں نے صاف سُنا کہ اس نے اماں پر وار کیا۔ کمرے میں دوڑ کر دیکھا کہ اماں گھٹنوں کے بل یوں گر پڑی ہے کہ اس کی پیٹھ کرسی سے لگی ہے، سینہ باہر نکلا ہے، گلا خرخر کر رہا ہے اور آنکھیں شیرنی کی طرح چمک رہی ہیں۔ اور یہ حیوان صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اسے پے درپے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ میں نے میز سے وہ چُھری اٹھائی جو میرے مرحوم باپ کی تنہا یادگار تھی اور جس سے روٹی کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا ـــــ اور پوری طاقت سے سوتیلے باپ کی پسلی میں گھسیٹر دی۔ خوبیٔ قسمت کہ اماں نے اسے گھسیٹ لیا اور چھری اس کی کھال سے اُچھل کر اور کوٹ کو پھاڑ کر رہ گئی۔ سوتیلا باپ پسلی پکڑے ہوئے باہر بھاگا اور اماں نے ہانپتے ہوئے مجھے اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ اتنے میں سوتیلا باپ اندر آیا اور مجھے اس کے پنجے سے نکال لے گیا۔

یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی مہم پر جانے سے نہ چوکا۔ اماں تندور کے پیچھے میرے قریب آئی اور مجھے گود میں لے کر چومتی ہوئی رونے لگی: "بیٹے معاف کرنا یہ میرا گناہ تھا! دلارے تجھے کیا سوجھی تھی؟ ... اور وہ چھری ...."

مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں سوتیلے باپ کا اور اپنا خون ایک کردوں گا۔ میں ضرور یہ کر گزرتا، کم از کم کوشش تو کرتا ہی۔ اب تک چست پائجامے میں پھنسی ہوئی وہ قابل نفرت ٹانگ میری آنکھوں کے آگے آجاتی ہے جو ہوا میں

اچھل کر ایک دکھیاری عورت کے سینے پر ٹھوکر مار رہی تھی۔ کئی سال بعد یہ بدنصیب انسان میری آنکھوں کے آگے ایک اسپتال میں مرگیا۔ اس زمانے میں میں اسے چاہنے لگا تھا۔ اور جب میں نے اس کی حسین آنکھوں کی جوت کو بجھتے ہوئے دیکھا تو اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا۔ تاہم گو میرا دل اُس آن غم سے پسیج رہا تھا، میں ہرگز یہ نہ بھول سکا کہ اس شخص نے میری ماں کو ٹھکرایا تھا۔

جب روس کی اس وحشیانہ زندگی کی ہیبتوں کا خیال آتا ہے تو میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اس کا ذکر کیوں کیا جائے۔ مگر مجھے یہ جواب ملتا ہے: "یہ ذکر جائز ہے کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی ہے اور یہ غمناک حقیقت آج بھی باقی ہے۔ یہ وہ بس کا پیڑ ہے جس کی جڑ تک ہمیں پہنچنا ہے، اسے لوگوں کی روحوں اور ذہنوں سے نکالنا اور اپنی مکروہ و تاریک زندگی سے مٹانا ہے۔"

ان ہیبتناک واقعات کی بازخوانی کی ایک اہم تر وجہ اور ہے۔ حالانکہ یہ حالات ہمیں کچلتے اور بہت سی نیک ہستیوں کو برباد کرتے ہیں۔ لیکن روس میں رہنے والوں کا دل اتنا شباب پرور اور صالح ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بلند ہے۔ ہماری اس عجیب و غریب زندگی میں صرف فطرت کے حیوانی پہلوؤں کو ہی فروغ نہیں ملا بلکہ اس بربریت کے باوجود ایک تخلیقی اور تعمیری شے پروان چڑھ رہی ہے۔ ایسی انسانیت جو ہمیں اپنی نو زندگی کا مژدہ سناتی ہے اور اس دورِ مستقبل کے گیت گاتی ہے جب ہم سب امن چین سے انسانوں کی زندگی بسر کرنے لگیں گے ؎

# باب ۔ ۱۳

ایک مرتبہ پھر میں نے اپنے کو نانا کے گھر میں پایا۔
"کیوں بے چور، یہاں کیا کرنے آیا ہے؟" ان الفاظ سے اس نے میرا استقبال کیا۔ میز پر انگلیاں چٹخاتے ہوئے وہ بولا۔ "میں تجھے گھر بٹھا کر روٹیاں دینے سے رہا۔ تیری نانی چاہے تو تجھے پالے۔"
"بیشک بیشک" نانی نے کہا۔ "ہائے ہمارے نصیب پھوٹ گئے۔"
نانا چلّا اٹھا: "اری، جب دوزخ بھرنا ہوگا تو پتا چلے گا۔" جب وہ کچھ ٹھنڈا پڑا تو مجھے سمجھانے لگا۔
"ہم دونوں اب الگ الگ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں۔" نانی بیٹھی ہوئی لیس بُن رہی تھی۔ تکلی میٹھے سروں میں گا رہی تھی اور کشیدہ کی صندوقچی دھوپ میں جگر مگر کر رہی تھی۔ نانی تانبے کی مورت معلوم ہو رہی تھی اور اس مدت میں ذرا بھی نہ بدلی تھی۔ البتہ نانا کی جھرّیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اور اس کے بھورے بال اب سفید ہو گئے تھے۔ سرد مہری اور اکڑفوں کی جگہ ایک قسم کی مستقل بے قراری نے لے لی تھی۔ اس کی ہری آنکھیں دھندلی پڑ گئی تھیں اور ان میں شک و شبہ بھرا ہوا تھا۔ نانی نے ہنستے ہنستے مجھے سنایا کہ نانا نے مال و متاع

کا بٹوارا کس طرح کیا تھا۔ نانی کو برتن بھانڈے اور ہانڈیاں دے کر ان حضرت نے فرمایا:

"یہ رہا تمھارا حصہ۔ اور اب مجھ سے تم ایک حبہ بھی نہیں مانگ سکتیں۔"

اس کے بدلے اس نے نانی کے تمام پرانے کپڑے ہتیا لیے اور انھیں سات سو روبل میں بیچ کر یہ رقم اپنے منہ بولے بیٹے یہودی پھلوں کے بیوپاری کو سود پر قرض دے دی۔ اب وہ ایسا لالچی ہوگیا تھا کہ اپنی آبرو کوڑیوں کے دام بیچتا پھرتا تھا۔ اپنے پرانے دوستوں اور ہم کاروں کے آگے —— جو سب امیر تاجر تھے —— وہ یہ دکھڑا رویا کرتا کہ میری اولاد نے مجھے تباہ کردیا۔ اور وہ ان سے امداد کا طالب ہوتا۔ وہ سب اسے مانتے تھے اور جی کھول کر اس کی جھولی بھرتے تھے۔ وہ یہ نوٹ بڑی شیخی سے نانی کو دکھاتا اور بچوں کی طرح اسے طعنہ دیتا۔

"اری الو، تجھے کوئی اس کا عشر عشیر بھی تو دے دے!"

یہ کمائی بھی وہ سود میں اپنے ایک نئے دوست کو جو تاڑ کی طرح اونچا اور گنجا تھا اور اس کی دکان دار بہن کو دے دیتا۔ یہ عورت موٹی تازی تھی۔ اس کے گال لال اور آنکھیں بھوری تھیں اور وہ خود شہد کی مانند میٹھی تھی۔

گھر کے خرچ کا پیسہ پیسہ آدھوں آدھ بٹا ہوا تھا۔ ایک روز نانی اپنے پیسوں سے سودا لا کر کھانا پکاتی اور دوسرے دن نانا کی باری آتی۔ ان کے لائے ہوئے سامان کا کھانا کبھی اچھا نہ ہوتا تھا۔

نانی بڑا اچھا گوشت خریدتی لیکن نانا چھیچھڑوں اور ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہ لاتا۔ دونوں اپنی چائے شکر الگ الگ رکھتے تھے مگر چائے دان ایک ہی تھا۔ نانا بڑے تردّد سے کہتا:

"ٹھہرنا۔۔۔ ٹھہرنا تو سہی!۔۔۔ کتنی چائے ڈالی ہے؟"

چائے کی پتی ہاتھ میں لے کر بڑی احتیاط سے اسے تول کر وہ بولتا: "تمھاری چائے نکمی ہے اور میری چائے کی پتّی بڑی ہے۔ لہٰذا میں کم چائے ڈالوں گا۔"

اُسے اس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ دونوں کی چائے یکساں تیز ہو اور نانی ایک آدھ گھونٹ زیادہ نہ پی لے۔

شہ نشین کے چراغ تک کے لیے تیل الگ الگ آتا تھا!——

اور یہ سب پچاس سال کی مشترکہ زندگی کے بعد!!!

نانا کی ان حرکتوں پر مجھے کبھی ہنسی اور کبھی چڑ آتی تھی۔ مگر نانی کے لیے وہ محض مضحکہ خیز تھیں۔

مجھے پُچکار کر وہ سمجھاتی: "تُو تماشا تو دیکھ! اس سے اپنا کیا بگڑتا ہے! یہ سٹھیا گئے ہیں اور اب ان کے حواس ٹھکانے نہیں۔ زیادہ نہیں تو اب ان کی عمر بیس کم سو کی تو ہوگی ہی۔ اگر یہ خبطی بن کر ہی خوش ہیں تو اپنی بلا سے۔ اپنے اور تیرے لیے میں تھوڑی بہت محنت کر سکتی ہوں۔"

میں بھی چند پیسے کمانے لگا۔ چُھٹّی کے دن صبح سویرے میں ٹوکرا لیے ہوئے نکل جاتا اور سڑکوں اور گلیوں میں کترن، ہڈیاں کیلیں وغیرہ چُنا کرتا۔ آدھ من لوہے، کاغذ یا کترن کے لیے کباڑیا مجھے

چونیّ اور آدھ من ہڈی کے لیے دونیّ دیتا۔ اسکول کے بعد شام کو بھی میں یہ کام کرتا اور سنیچر کو ایک آدھ روپیہ کا کباڑ بیچ آتا۔ نانی یہ پیسے جھٹ اپنی گرہ میں چھپا کر میری بلائیں لیتی۔

"خدا تیری عمر میں برکت دے میرے لاڈلے! اس سے آج گھر بھر کی روٹیاں نکل آئیں گی۔۔۔ تونے یہ بڑا کام کیا۔"

ایک روز میرے ہاتھ سے اکنّی لے کر وہ چپ چپ رونے لگی اور میں نے دیکھا کہ آنسو کا ایک میلا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپک کر ناک کے نیچے ٹھہر گیا ہے۔

کوڑا کرکٹ بٹورنے سے زیادہ مفید مشغلہ ندی کنارے کے ساگوان کے گوداموں سے تختوں اور شہتیروں کی چوری تھی۔ یہاں جب میلا لگتا تو لوہے کی بکری کے لیے عارضی دوکانیں کھڑی کی جاتیں۔ میلے کے بعد دوکانیں اُٹھا دی جاتیں اور تختے اور شہتیر گوداموں میں ڈال دیے جاتے۔ ایک مضبوط تختہ دونیّ میں بک جاتا تھا اور دن بھر میں آسانی سے دو تختے چرائے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن تھا جب موسم خراب ہو۔ کیونکہ برف کے طوفان یا موسلا دھار برکھا میں چوکیدار ادھر ادھر چلے جاتے تھے۔

اس مشغلے کے لیے مجھے کچھ ساتھی بھی مل گئے۔ ایک بھکاری کا دس سالہ بیٹا 'سنکا' جو بڑا نرم مزاج اور من موجی تھا، 'یتیم کوسترم' جو دُبلا اور لمبا تھا اور صرف ۱۳ سال کی عمر میں دو لطخوں کی چوری کے جرم میں جیل کی ہوا کھا آیا تھا، بارہ سالہ تاتار "خابی" جو سیدھا سادہ ہونے کے باوجود بلا کا زور آور تھا،

گورکن کا آٹھ سالہ بیٹا 'یاز' جو بہت ہی کم سخن تھا اور مرگی کے مرض میں مبتلا تھا اور ہم میں سب سے اونچا ایک رنڈوے درزی کا بیٹا 'گرشکا چرکا' جو سمجھدار ہونے کے ساتھ غضب کا لڑاکا تھا۔ ہم سب ایک ہی سڑک پر رہتے تھے۔

ہمارے گانو میں چوری کا شمار کسی جرم میں نہ ہوتا تھا۔ یہ ایک رسم عام تھی اور غریب دیہاتیوں کے لیے اس کے سوا روٹی کمانے کا کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ میلا صرف ڈیڑھ ماہ کے لیے بھرتا تھا اور اس میں سال بھر کی روزی نہیں نکل سکتی تھی۔ کئی شریف ندی میں شکار کھیلا کرتے — یعنی لہروں میں بہ کر کنارے آ لگے ہوئے شہتیروں کو ایک ایک دو دو کر کے اٹھا لے جاتے۔ لیکن اس کارگزاری کی اصل شکل یہ تھی کہ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا میں گشت لگاتے پھرتے اور موقع ملتے ہی دوسروں کا مال چرا لے جاتے تھے۔ معمر لوگ اتوار کو اپنی کامیابیوں کی داستان سناتے اور چھوٹے اسے سن کر تجربہ حاصل کرتے تھے۔

موسم بہار میں میلے سے چند روز پہلے گانو کی سڑکیں شرابی مزدوروں سے بھر جاتیں اور دیہاتی لڑکے ان کی جیب کترا کرتے۔ یہ شغل ناجائز نہ سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنے بڑوں کی آنکھوں دیکھتے یہ حرکت کیا کرتے تھے۔ بڑھئی کے اوزار، گاڑی کے چاک یا گھوڑے کی لگام تک چرانے سے وہ باز نہ آتے تھے۔ لیکن ہماری ٹولی اس قسم کی چوری نہ کیا کرتی تھی۔ ایک دن 'چرکا' نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا:

"اب میں کبھی چوری نہ کروں گا۔ امّاں کو یہ پسند نہیں ہے۔"
خابی نے بھی اس کی تائید کی: "اور مجھے ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا
ہے۔" 'کوسترم' کو کم عمر چوروں سے سخت نفرت تھی۔ 'چور' کے
لفظ پر وہ بڑا زور دیتا تھا۔ جب وہ بچّوں کو شرابیوں کی
گرہ کاٹتے دیکھتا تو انھیں بھگا دیتا تھا اور اگر کوئی پکڑ میں آجاتا
تو اس کی خوب ٹھکائی کرتا۔ یہ دراز چشم اور سدا اُداس لڑکا
اپنے کو کوئی بزرگ تصور کرنے لگا تھا۔ وہ ایک دربان کی
طرح اکڑ کر چلتا، جان بوجھ کر اپنی آواز کو کرخت بنانے کی
کوشش کرتا اور کسی بڈھے کی طرح سنجیدہ اور متین بنا رہتا۔
میاں "سنکا" ایک سرے سے ہر قسم کی چوری کے خلاف تھے۔
لیکن لاوارث تختوں اور شہتیروں کو اٹھا لے جانا
چوری نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کام سے ہم ذرا نہ جھجکتے تھے اور
ایسا جتن کرتے تھے کہ راہ میں کوئی دشواری نہ پیدا ہوتی تھی،
شام کو جب اندھیرا ہوتا، یا دن کو جب موسم خراب ہوتا،
دو لڑکے ندی کی کھاڑی پار کر جاتے تھے۔ وہ سامنے سے
ہو کر جاتے تھے تاکہ چوکیداروں کا دھیان ان پر لگا رہے۔
باقی یار الگ الگ چھپ کر اس پار جا لگتے تھے۔ چوکیدار ہمارے
دونوں ساتھیوں کے پیچھے لگے رہتے اور ادھر ہم گودام میں
جا کر مالِ غنیمت پر ہاتھ مارتے اور چمپت ہو جاتے۔ اس
اثنا میں ہمارے دونوں پُھرتیلے دوست چوکیداروں کو ادھر
اُدھر نچاتے رہتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک

رسّی اور مُڑی ہوئی کیل ہوتی جسے ہم تختے یا لٹھے میں باندھ دیتے اور اسے برف یا پانی میں کھینچتے ہوئے لے جاتے ۔ شاید ہی کبھی چوکیداروں کی نظر ہم پر پڑتی ، مگر پکڑنا ان کے امکان سے باہر تھا ۔

لوٹ کے مال کو بیچ کر ہم یہ رقم چھو مساوی حصوں میں تقسیم کرتے اور کبھی کبھی ایک ایک کے حصّے میں ڈیڑھ دو آنے تک پڑجاتے ۔ اتنے پیسوں میں مزے سے دن بھر گزارہ ہوجاتا تھا۔ اگر 'سنکا' ہرروز اپنی ماں کو ایک ادّھے کا دام نہ لے جاکر دیتا تو وہ اسے پیٹتی تھی ۔ 'کوسترم' اپنے پیسے اس ارادے سے جمع کررہا تھا کہ کبوتر خانہ بنائے گا ۔ 'چُرکا' کی ماں بیمار تھی اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتا تھا ۔ 'خابی' کا خواب یہ تھا کہ گھر واپس جانے کا کرایہ مل جائے ، جہاں سے بچپن میں اس کا چچا اسے لے آیا تھا اور خود کسی ندی میں ڈوب مرا تھا۔ خابی کو اپنے شہر کا نام تک یاد نہ تھا ۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ دریائے دولگا کے کنارے 'کاما' کے پاس بسا ہُوا ہے۔ ہم سب اس کانے تاتار کو چڑانے کے لیے یہ گا گا کر اس بے نام شہر کا مذاق اڑاتے تھے۔

'کاما' میں ہے ایک شہر     نام ہے اس کا یوں ہی سا<br>
آنکھ نہ اس کو دیکھ سکے     پانو نہ اس پر کوئی رکھے

پہلے تو 'خابی' بھنّا اُٹھتا تھا ۔ ایک روز 'سنکا' نے چمکار کر کہا:
"تم دیوانے تو نہیں ہو؟ کوئی اپنے دوستوں سے یوں خفا ہوتا ہے"۔
تاتار جھینپ گیا اور آئندہ اس گیت میں ہماری ہم نوائی

کرنے لگا۔

خیر جو کچھ بھی ہو، تختوں کی چوری پر ہم ہر حال میں کوڑے کرکٹ کی چنائی کو ترجیح دیتے تھے۔ برف پگھل جانے کے بعد بہار میں جب بارش سڑکوں کو غسل دے چکتی تو یہ کام خصوصاً دلچسپ ہو جاتا۔ جہاں میلا بھرا کرتا تھا وہاں کے ناب دانوں میں لوہے کی چیزوں کی بہتات تھی اور گاہے گاہے تانبے یا چاندی کے سکے بھی نکل آتے تھے۔ کہیں چوکیدار ہمیں بھگا نہ دے یا ہمارے تھیلے نہ چھین لے، اس ڈر سے ہمیں اسے چند پیسے دینے ہوتے تھے اور اس کی خوشامد میں لگا رہنا ہوتا تھا۔ پیسے کمانا آسان نہ تھا تاہم عارضی تکراروں کے باوجود ہم سب میں بڑا بھائی چارا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم ایک بار بھی سچ مچ لڑے ہوں۔

ہمارا صلح کار 'سنکا' تھا جو ہر موقع کے لیے چکنے چپڑے جملوں کے ساتھ تیار رہتا تھا، جنھیں سن کر ہم سب کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور ہم حیرت میں رہ جاتے۔ وہ خود بھی تعجب کے انداز میں بیچ بچاؤ کرتا اور 'باز' کی جھڑکی یا پھبتی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کی رائے میں ہر بُری بات غیر ضروری تھی اور وہ قطعی طور پر اس کی تردید کر دیتا تھا۔

اس کا سوال یہ ہوتا تھا: "آخر اس سے حاصل کیا ؟" اور ہم بھی مان جاتے تھے کہ دراصل یہ لا حاصل ہی ہے۔

وہ اپنی ماں کو 'قزاقن' کہا کرتا اور ہم اس پر کبھی نہ ہنستے تھے۔ اپنی سنہری آنکھوں سے مسکرا کر وہ سناتا: "شام کو میری

قزاقن نشہ میں چور گھر آئی - اور دروازہ کھول کر چوکھٹ پر بیٹھ کر مرغیوں کی طرح گانے لگی "

"وہ گیت کیا تھا؟" چُرکا نے پوچھا - اسے باضابطگی بہت پسند تھی - اپنی ران پر طبلہ بجاتے ہوئے سنکا وہ گیت دُہرانے لگا -

"گڈریے کھول دے اپنی کھڑکیا
پنچھی بھاگیں جنگل جنگل
بنسی بجا اور سب کو لے چل
اوٹ میں چھپ کر تان اڑا
سارے جگ کے من کو لبھا!"

اُسے صدہا گیت یاد تھے اور اس کی آواز میں بڑا رس تھا۔

"گاتے گاتے وہ چوکھٹ پر سوگئی - ادھر کمرا ٹھنڈا برف ہوگیا۔ اور خدا جانے ہئیں اکڑ کر مرنے سے کیسے بچا - صبح میں نے پوچھا: آخر تم اتنی شراب کیوں پیتی ہو؟ جواب ملا: اس سے نقصان کیا؟ تھوڑی مدت اور میرا بوجھ اٹھالے، میں زیادہ نہیں جینے کی "

چُرکا نے سنجیدگی سے رائے زنی کی: "وہ ٹھیک کہتی ہے - اُسے 'استسقا' کی بیماری لگ گئی ہے -"

"اس کی موت پر تم رنجیدہ ہوگے؟" میں نے پوچھا۔

سنکا نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا: "کیوں نہیں - وہ مجھے چاہتی ہے -" اور گو ہم جانتے تھے کہ 'قزاقن' اسے بیرحمی سے ٹھوکتی ہے مگر اس کے کہے پر یقین کرنے لگے - اگر کبھی ہماری کمائی بہت کم ہوتی تو چُرکا کہتا:

"ہم سب مل کر 'سنکا' کی ماں کے لیے شراب خرید دیں ورنہ وہ بے چارا پٹے گا۔"

اس منڈلی میں صرف میں اور 'چرکا' پڑھ لکھ سکتے تھے۔ 'سنکا' ہم سے رشک کرتا اور اپنے چوہوں کے سے کان ہلا کر کہا کرتا:

"امّاں کے مرتے ہی میں اسکول جانے لگوں گا۔ میں ماسٹر کے پیر پڑلوں گا کہ مجھے اپنی جماعت میں داخل کرلے۔ تعلیم ختم کرکے میں اسقف اعظم یا کیا عجب کہ بادشاہ کا مالی ہو جاؤں۔"

ایک دن 'قزاقن' گرجا گھر کے بوڑھے جمعدار کے ساتھ شراب پیتے پیتے لکڑی کے گھٹے کے نیچے کچل گئی۔ جب وہ اسپتال پہنچا دی گئی تو دانشمند 'چرکا' نے سنکا سے کہا:

"تم میرے گھر آرہو۔ میری ماں تمھیں پڑھنا لکھنا بھی سکھا دے گی۔"

تھوڑے ہی عرصے میں میاں 'سنکا' سر اٹھا کر دکانوں کے سائن بورڈ پڑھنے لگے۔ جب وہ مودی کی ددکان کو 'بالا کینا' پڑھتا تو 'چرکا' اسے سدھارتا:

"ارے بھائی یہ 'بقّالینا' ہے۔"

"ہاں ہاں۔ لیکن حروف میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگتے ہیں۔ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑتے ہیں کہ انھیں کوئی پڑھ رہا ہے۔"

پیڑ پودوں سے وہ ایسی محبّت کرتا تھا کہ ہم سب لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ گانو کی زمین ریتیلی تھی جس کی وجہ سے یہاں سبزہ کی کمی تھی۔ اِکّے دُکّے مکانوں میں ایک آدھ ٹھنٹھ ہو تو ہو اور کسی کونے کھدرے میں گھاس کے چند تنکے چھپے چھپائے مل جاتے تھے۔

اگر ہم میں سے کوئی ان پر بیٹھ جاتا تو سُنکا غصّے سے چیخ اٹھتا:
"کیا تم نے گھاس پر ہی بیٹھنے کی قسم کھائی ہے؟ زمین پر بیٹھنے میں تمھاری ہتک تو نہیں ہوتی:"

اس کی رائے میں کسی پیڑ کی ٹہنی توڑنا یا پھول نوچنا گناہ تھا خواہ یہ شاخ سڑ گئی ہو اور پھول مُرجھا گیا ہو۔ جب کبھی ہم کو وہ یہ کرتے دیکھتا تو محوِ حیرت ہو کر پکارنے لگتا:

"آخر تمھیں ہر شے کو توڑنے پھوڑنے میں کیا ملتا ہے؟ بدمعاشو تم نے یہ کیا ستم کیا؟" اور اس کے افسوس کا یہ عالم ہوتا کہ ہم سب کو خفّت ہوتی۔

سنیچر کے دِن کے لیے ہم نے ایک بڑا مزیدار کھیل ایجاد کیا تھا۔ ہفتہ بھر ہم پھٹی پُرانی جوتیاں جمع کرتے اور انھیں کونوں میں چھپا دیتے۔ سنیچر کی شام کو جب تاتار قلی سائبیریا کے بندرگاہوں سے گھر لوٹتے تو ہم دو راہوں پر مورچہ بنا کر جم جاتے اور تاتاروں پر جوتوں کی بوچھار کرنے لگتے۔

اوّل اوّل تو وہ سخت ناراض ہوئے اور گالیاں بکتے ہوئے ہمارا پیچھا کرنے لگے۔ لیکن کچھ روز بعد انھیں بھی اس کھیل میں مزا ملنے لگا۔ جب وہ میدان جنگ میں آتے تو پُرانے جوتوں کا گٹھر ساتھ لاتے۔ اور تو اور، وہ ہمارے اسلحہ خانہ کی ٹوہ لے کر سارے جوتے چرا لے جاتے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ یہ بھی کوئی کھیل میں کھیل ہے؟ اس کے بعد لڑنے سے پہلے ہم سارے جوتے آدھوں آدھ بانٹنے لگے۔ اکثر وہ چوک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو جاتے اور

ہم سب لونڈے چیختے ہوئے انھیں گھیر کر جوتے پھینکنا شروع کرتے تھے۔ وہ بھی نعرے لگاتے اور اگر ہم میں سے کوئی ٹانگ میں جوتا پھنس جانے کے سبب سے ریت میں منہ کے بل گر پڑتا تو پھر تو ان کا قہقہہ کان کے پردے پھاڑ دیتا تھا۔

بڑے جوش و خروش سے دیر تک اس کھیل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کبھی کبھی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ دیہات کی ساری آبادی تماشا دیکھنے آتی اور ہمیں بڑھاوا دیتی تھی کیونکہ اس کی نظر میں یہ بھی ایک کمال تھا!۔ جوتے کوّوں کی طرح بھیگی ہوائیں سنسنایا کرتے تھے۔ کبھی ایک آدھ کو زور کی چوٹ بھی آجاتی تھی۔ لیکن کھیل اتنا دلچسپ تھا کہ چھوٹی موٹی خراش پر کسی کی توجہ نہ جاتی تھی۔

تاتاروں کو ہم سے کم مزہ نہ آتا تھا۔ اکثر کھیل کے بعد وہ ہمیں ایک قہوہ خانے میں لے جاتے اور ایک قسم کے مربّے سے ہماری تواضع کرتے۔ کھانے کے بعد عمدہ چائے اور مٹھائی ہمیں دی جاتی۔ ہمیں یہ قد آور جاہلی تاتار بہت بھاتے تھے۔ وہ دل کے بڑے صاف اور بچّوں جیسے بھولے تھے۔ مجھ پر ان کی ملنساری، نیکی اور باہمی رواداری نے گہرا اثر کیا۔

وہ جی کھول کر اس قدر ہنستے تھے کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ اُن میں ایک نکٹا اپنی طاقت کے لیے سارے علاقے میں مشہور تھا۔ ایک مرتبہ وہ تیرہ من وزنی گھنٹا کنارے سے اُٹھا کر اسٹیمر کے اندر لے گیا اور برابر ہنستا رہا۔

ایک روز سنکا، کو ہتیلی پر بٹھا کر اس نے سر سے اوپر اٹھا لیا اور پوچھا: "میاں اب کس دنیا میں رہتے ہو؟"

اگر موسم بُرا ہوتا تو ہم 'یاز' کے مکان میں جمع ہوتے۔ یہ مکان قبرستان میں واقع تھا۔ اس کا باپ ڈیڑھ پسلی کا آدمی تھا۔ لمبے لمبے بازو اور چھوٹی سی کھوپڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی پتلے سے ڈنٹھل پر گول سا پھول رکھا ہے۔ اپنی پیلی آنکھوں کو کچھ بند کر کے وہ مضحکہ خیز انداز میں تیزی سے بڑبڑایا کرتا:

"بھیج مولا چھپن کروڑ کی چوتھائی — اوخ!"

ہم چائے شکر اور ڈبل روٹی خرید لاتے۔ 'یاز' کے باپ کے لیے شراب لانا بھی ہم نہ بھولتے تھے۔ چرکا اسے ڈپٹ کر حکم دیتا:

"ابے کاہل گنوار، اب تک چائے کا پانی نہیں رکھا؟"

کسان ہنس کر پانی رکھنے لگتا، اور جب چائے کے انتظار میں ہم اپنی تجارت پر بحث کرتے تو وہ پرانا گھاگھ ہمیں نئے نئے نکتے سمجھاتا:

"سنو لڑکو! پرسوں زمیندار 'تروسوف' کے گھر دعوت ہے۔۔۔ ہڈیاں بٹورنے کا اچھا موقع ہے۔"

لیکن ہمہ دان 'چرکا' نے سر ہلا کر کہا:

"اس کا خانساماں ایک ہڈی نہیں پھینکتا۔"

سنکا نے کھڑکی سے سر نکال کر قبرستان کو دیکھتے ہوئے کہا:

"بہت جلد ہم باہر جنگلوں میں جا سکیں گے۔"

'یاز' سدا خاموش رہتا اور اپنی پُر حسرت آنکھوں سے ہمیں

تاکا کرتا ۔ بغیر کچھ کہے وہ ہمیں اپنے کھلونے دکھانے لگا —— چوبی سپاہی جو اُسے کسی نان بائی کی دکان میں مل گئے تھے، یا شکستہ گھوڑے، تانبے کے ٹکڑے اور بٹن ۔

اس کے باپ نے میز لگائی اور بھانت بھانت کی کٹوریوں کے ساتھ کیتلی لاکر رکھ دی ۔ اپنی شراب ختم کر کے وہ خود تندور پر اُچک گیا اور اپنی لمبی گردن نکال کر کہنے لگا :

" او ہو ! تم لوگ تو بڑے بوڑھوں کی طرح آرام طلب ہوئے جا رہے ہو! کیوں! چور کہیں کے ۔ ۔ ۔ یہ بھی مولا جھبیّن کروڑ کی چوتھائی ! "

'سنکا' نے جواب دیا :" واہ ہم چور کیوں ہونے لگے ؟ "

" اچھا چور نہیں تو ٹھگ سہی ! "

اگر یازؔ کا باپ زیادہ کرکری کرتا تو چرکا اسے ڈانٹ پلاتا :

" چپ رہتا ہے یا نہیں بے، زبان دراز دیہاتی ! "

'سنکا'، 'چرکا'، اور مجھے اس شخص کی اس عادت سے انتہائی نفرت تھی کہ وہ گاؤں کے تمام بیماروں کا حساب لگایا کرتا اور اُن آدمیوں کے نام گنایا کرتا جو جلد مر جانے والے تھے ۔ وہ نہایت اطمینان اور سرد مہری سے اپنا حساب جاری رکھتا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہمیں یہ حرکت سخت ناپسند ہے وہ قصداً ہمیں سُنایا کرتا :

" جی ہاں، نواب صاحب، آپ کو ڈر لگتا ہے ؟ بہت خوب ! ۔ تاہم چند روز کے اندر ایک مردِ جوان موت سے نہیں بچ سکتا ۔ اور قبر میں اس کی ایک ایک ہڈی گل جائے گی ! "

ہم نے اس کا منہ بند کرنا چاہا لیکن وہ چپ نہ ہُوا :

"اور تم سب کو ایک دن مرنا ہی۔ اس سٹراند میں کون زندہ رہ سکتا ہی"

'سنکا' نے جواب دیا: "ہمیں اس کی پروا نہیں۔ ہم سب کو فرشتوں کا مرتبہ ملے گا۔"

یاز کے باپ نے چونک کر سانس روک لی: "کیا کہا؟۔ فرشتے؟۔ اور تم؟" قہقہہ لگا کر وہ پھر ہمیں چڑانے کے لیے مُردوں کے قصّے سُنانے لگا۔

کبھی کبھی یہ شخص پُر اسرار لہجے میں یوں سرگوشی کرنے لگتا۔

"بچّو، کان لگا کر سُنو! پرسوں انھوں نے ایک عورت کو دفن کیا ..... اور مجھے اس کی زندگی معلوم ہی۔۔۔ تم جانتے ہو وہ کون تھی؟"

وہ اکثر عورتوں کا ذکر کرتا تھا اور از حد فحش انداز میں۔ تاہم اس کی کہانیوں میں تھوڑا سا درد چھپا ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ہمیں اپنے خیالات سنانے کے لیے بیتاب ہی۔ اور ہم کان لگا کر اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اس کے بولنے کا انداز جاہلانہ ہوتا اور بیچ بیچ میں بے محل سوال کیا کرتا۔ لیکن یہ کہانیاں حافظے پر ایک ہیجانی نقش چھوڑ جاتی تھیں۔

"اس عورت سے پوچھا گیا: گھر میں آگ کس نے لگائی۔ اس نے فوراً اس جرم کا اقبال کر لیا! اری بدبخت تو تو اسپتال میں بیمار پڑی تھی، وہاں سے اپنے گھر کس طرح آئی؟ لیکن وہ ایک ہی رٹ لگائے گئی۔ کیوں۔ ؟ ۔۔۔ اوف! بھیج مولا چھپّن کروڑ کی چوتھائی!"

اس اجاڑ سنسان قبرستان میں اس نے جتنی عورتوں کو دفن کیا تھا اُن میں سے ایک ایک کی زندگی سے واقف تھا۔ یہ معلوم

ہوتا تھا کہ وہ پرائے گھروں کے کواڑ کھول کر ہمیں دکھا رہا تھا کہ ان کے مکین کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سے ہم ایک قسم کی متانت اور اہمیت محسوس کرنے لگے۔ وہ رات بھر ایسے واقعات سُنا سکتا تھا۔ لیکن جیسے ہی شفق پھولتی اور جھٹپٹے کا سماں ہوتا 'چُرکا' اُٹھ کھڑا ہوتا اور پوچھتا: "اب میں گھر جاؤں ورنہ اماں پریشان ہوں گی۔ میرے ساتھ کون آتا ہے۔"

ہم سب باہر آجاتے تھے۔ یاز ہمیں باڑی تک پہنچانے آتا۔ اور پھاٹک اندر سے بند کر کے اور منہ نکال کر بھرّائی ہوئی آواز میں "خدا حافظ" کہتا۔ ہم سب 'شب بخیر' پکار کر چل پڑتے تھے۔ اس اکیلی جان کو قبرستان میں چھوڑ آنا ہمیں بُرا لگتا تھا۔ 'کوسترم' نے ایک روز پیچھے لوٹ کر کہا: "کیا عجب کہ کل جب ہم لوٹیں تو یہ مرا ہُوا ملے۔"

'چُرکا' اکثر کہا کرتا کہ یاز کی زندگی ہم سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ مگر 'سنکا' اس کی تردید کرتا: "ہم سب اسی حال میں خوش ہیں"۔

اب جو میں اس زمانہ کا تجزیہ کرتا ہوں تو ماننا پڑتا ہے کہ ہم سب اسی حالت میں مگن تھے۔ یہ آزاد زندگی جو اضداد سے مرکّب تھی، اپنے میں دلچسپیوں کا ایک جہان رکھتی تھی۔ میرے یہ ہمدم میرے دل میں ہمیشہ بھلائی اور نیکی کے جذبات پیدا کرتے تھے۔

اسکول میں مجھے پھر گوناگوں دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ میرے ساتھی مجھے "بھنگی" اور "آوارہ" کہہ کر پکارنے لگے۔ اور ایک دن بڑی تو تو میں میں کے بعد انھوں نے ماسٹر سے شکایت کی کہ

اس کے جسم سے سڑی ہوئی نالی کی سی بدبو آتی ہے اور وہ میرے پاس نہیں بیٹھ سکتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس الزام نے مجھے کیسا صدمہ پہنچایا۔ اس کے بعد اسکول جانا میرے لیے ناممکن سا ہو گیا۔ یہ الزام قطعاً بے بنیاد تھا، کیونکہ ہر صبح میں اچھی طرح نہاتا دھوتا اور وہ کپڑے کبھی نہ پہنتا تھا جنھیں کوڑا کرکٹ جمع کرتے وقت استعمال کرنا ہوتا تھا۔

خدا خدا کرکے میں نے تیسرے درجے کا امتحان پاس کیا۔ انعام میں مجھے انجیل کے علاوہ قصوں کی دو کتابیں اور ایک سند بھی ملی۔ ان تحفوں کو دیکھ کر نانا بہت خوش ہوا اور فی الفور اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ یہ کتابیں اس کی صندوقچی میں بند رہیں گی۔ مگر نانی کئی دن سے بیمار تھی اور اس کے پاس ایک پیسہ نہ تھا۔ نانا برابر اسے دھمکایا کرتا: "اری تو مجھے پھر برباد کرکے رہے گی۔ ۔ ۔ ۔ ہشت! دھت!" اس لیے میں کتابیں بارہ آنے میں بیچ آیا اور یہ رقم نانی کو دے دی۔ اسناد پر کچھ اناپ شناپ لکھ کر میں نے نانا کو دیا اور اس نے بے دیکھے انھیں کہیں ڈال دیا۔ اس کا انجام مجھے بعد میں بھگتنا پڑا۔

اسکول بند ہو چکا تھا اور میں از سرِ نو کوچہ گردی کرنے لگا۔ اس مرتبہ اس زندگی میں نیا لطف ملا۔

یہ وسط بہار کا زمانہ تھا اور ہمارا روزگار آسان ہو گیا تھا۔ اتوار کو ہم سب کھیتوں یا جھاڑیوں میں سیر کرتے، جہاں پیڑ پودوں نے نئی پوشاک پہن لی تھی۔ ہم صبح جاتے اور شام کو

جب لوٹتے تو جسم میں ایک خوشگوار کسمساہٹ سی ہوتی اور ہمارا باہمی اخلاص زیادہ بڑھ جاتا۔

لیکن یہ دن جلد بیت گئے۔ میرا سوتیلا باپ قرض لینے کے جرم میں نوکری سے برطرف کر دیا گیا اور دوبارہ غائب ہوگیا۔ اماں اپنے چھوٹے بیٹے نکولائی کو لیے ہوئے نانا کے گھر آئی اور نانی کی غیر حاضری میں اس کی خدمت میرے ذِمّے پڑی۔ نانی اب شہر میں ایک امیر سوداگر کے گھر رہتی اور کفن سینے کا کام کیا کرتی تھی۔

اماں اس قدر کمزور پڑ گئی تھی کہ چلنا اس کے لیے دوبھر تھا اور اس کی نگاہیں بھٹکی بھٹکی پھرتی تھیں۔ میرے بھائی کو خنازیر کا روگ لگ گیا تھا اور اس کا بدن زخموں سے بھرا ہُوا تھا۔ نقاہت کے مارے وہ زور سے رو بھی نہ سکتا تھا اور صرف اس وقت کراہتا جب بھوکا ہوتا۔ دودھ پیتے ہی وہ سو جاتا اور اس کے گلے سے چھوٹی سی بلّی کی غرغراہٹ کی سی آواز نکلتی۔

اسے غور سے دیکھ کر نانا نے کہا۔

"اُسے عمدہ غذا کی ضرورت ہے۔ اور میرے پاس تم سب کو پالنے کے لیے سرمایہ نہیں"۔

بستر پر ٹکے ٹکے امّاں نے ایک گہری سانس لی اور جواب دیا۔

"اس ننھی سی جان کے لیے ایک مٹھی اناج بس ہے"۔

"ایک ایک مٹھی کر کے بڑی سی ڈھیری بن جاتی ہے"

پھر میری طرف مڑ کر اس نے حکم دیا۔

"نکولائی کو دھوپ میں ریت میں سونا چاہیے۔"
نانا کے فرمان کے مطابق میں نے ریت کی ایک بوری دھوپ میں پھیلا کر اپنے بھائی کو اس میں گلے گلے گاڑ دیا۔ اس چھوٹے سے بچّے کو ریت کا بچھونا بہت پسند تھا۔ بڑے مزے میں غوں غاں کرتے ہوئے وہ اپنی روشن آنکھوں سے مجھے تاکا کرتا۔ ان آنکھوں میں کیسی موہنی تھی اور سفیدی کا نام نہ تھا، نیلی پتلیوں کے ارد گرد جگمگاتے ہوئے ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی سے مجھے لگاؤ سا ہو گیا۔ جب میں ریت پر لیٹ کر اپنے نانا کی یہ بیدرد نصیحت سنا کرتا تو محسوس ہوتا کہ نکولائی میرے خیالات کی رو سے ہم آہنگ ہے:

"بیٹی اگر یہ بچّہ مر جائے —— اور اسے اس مرحلہ میں کوئی تکلیف نہ ہوگی —— تو تیری جان بچ جائے گی۔"

اس کے جواب میں امّاں دیر تک کھانستی رہتی تھی۔

اپنے ہاتھ باہر نکال کر یہ بچّہ میری طرف پھیلا دیتا اور اپنا ذرا سا سفید سر ہلانے لگتا۔ اس کے سر میں بہت کم بال تھے اور جو تھے وہ بالکل بھورے۔ اس کے چہرے پر بزرگی اور دانشمندی کی علامت تھی۔ اگر ہمارے قریب کوئی مرغی یا بلّی آتی تو اسے دیر تک دیکھ کر نکولائی میری طرف نظر پھیرتا اور ایک پُرمعنی انداز میں مسکراتا اس کی یہ مسکراہٹ مجھے بیچین کر دیتی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے ساتھ رہتے رہتے میں تنگ آگیا تھا اور باہر بھاگ کر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے

بیتاب ہو رہا تھا؟۔

آنگن تنگ تاریک اور گندہ تھا۔ پھاٹک سے لے کر دھوبی گھر تک مختلف کوٹھریوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ پرانی کشتیوں کے تختوں سے چھتیں بنائی گئی تھیں۔ جب ندی میں سیلاب آتا یا برف پگھلتی تو گاؤں کے باشندے لکڑی کے یہ کُندے چرا لاتے تھے۔ پورا آنگن بھانت بھانت کے لکڑوں سے پٹا پڑا تھا اور ایک بدنما ہیولا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پانی میں سیلے ہوئے یہ لکڑ جب دھوپ کھاتے تو ایک سڑی ہوئی بدبو پھیل جاتی تھی۔

پڑوس میں ایک مذبح تھا۔ صبح صبح وہاں سے بچھڑوں اور بھیڑوں کا شیون اٹھتا تھا۔ اور کبھی کبھی خون کی بُو اتنی تیز ہو جاتی کہ مجھے محسوس ہوتا کہ ایک شفّاف سرخ چادر کی شکل میں یہ خون ہوا میں تیر رہا ہے۔

کلھاڑی سر پر پڑتے ہی جانور ایک دردناک چیخ مارتے اور نکولائی چونک کر یوں مُنہ بناتا گویا ان کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ زیرِ لب اوف کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکتا . . . . .

دوپہر کو کھڑکی سے سر نکال کر نانا آواز لگاتا:

"کھانا تیّار ہے!"

بچّے کو گھُٹنے پر بٹھا کر وہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا۔ نکولائی کے منہ میں روٹی اور آلو بھرتے ہوئے وہ اس کے سارے منہ کو سان دیتا۔ چند نوالے کھلا کر نانا اس بچّے کے پھولے ہوئے پیٹ کو انگلی سے ٹٹولتا اور آپ اپنے سے پوچھنے لگتا:

"بس کروں ؟ یا چند نوالے اور کھلاؤں ؟"

اتنے میں امّاں اپنے اندھیرے کونے سے پکار کر کہتی :

"دیکھیے وہ روٹی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔"

"اُلّو کا پٹھّا ! اسے اپنے پیٹ کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے !"

پھر وہ نکولائی کے منہ میں کچھ اور بھر دیتا۔

یہ نظارہ کتنا شرمناک تھا ! میرا گلا رُندھ جاتا اور جی متلانے لگتا تھا۔

بالآخر نانا کا ارشاد ہوتا : "بہت ہو گیا۔ اسے اس کی ماں کے پاس لے جا۔"

میں بچّے کو گود میں اٹھا لیتا۔ وہ رو رو کر میز کی طرف ہاتھ پھیلانے لگتا۔ امّاں بمشکل اٹھ کر میرے قریب آتی اور اپنے بازو پھیلا دیتی —— وہ بازو جو کسی مرجھائے ہوئے پیڑ کی ٹہنی کی طرح سوکھے سا کھے تھے۔

وہ تقریباً بے زبان ہو گئی تھی۔ اس کی وہ گونج دار آواز اب کہاں چلی گئی تھی ! اپنے کونے میں دن بھر چپ چاپ بے حرکت پڑی ہوئی وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بجھتی جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ موت کے قریب ہے۔ اور نانا اکثر اپنے اُکتا دینے والے انداز میں موت کا ذکر کیا کرتا —— عموماً شام کے وقت جب آنگن میں اندھیرا پھیلنے لگتا اور بھیڑ کی اون کی سی گرم و نرم سڑاند کمرے کے اندر گھسنے لگتی تھی۔

نانا کی کھڑکی شہ نشین کے نیچے تھی اور وہ اس کے نیچے پڑے پڑے اندھیرے میں دیر تک گنگنایا کرتا :

"اب ہماری موت سر پر کھڑی ہوئی ہے۔ خدا کے آگے ہم کیا

لے کر جائیں گے ؟ اسے ہم کیا جواب دیں گے ؟۔ تمام عمر ہم نے کشمکش میں گزاری۔ لیکن اس کا کیا انجام ملا ؟ اور کس غرض سے ہم یہ جدوجہد کرتے رہے ہیں ؟"

میں زمین پر کھڑکی اور تندور کے بیچ میں سویا کرتا تھا۔ کافی جگہ نہ ہونے کے سبب سے مجھے اپنے پیر تندور کے اندر پھیلانے ہوتے اور لال چیونٹے ان پر رینگا کرتے۔ تھوڑا بہت لطف اس وقت آتا جب نانا جان کھانا پکانا شروع کرتے اور ہر مرتبہ تندور کی کریدنی سے کھڑکی کو توڑ بیٹھتے۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آتی اور حیرت بھی ہوتی کہ نانا جیسا مردِ دانا کریدنی کی موٹھ کیوں نہیں اُتار لیتا۔

ایک دن ہانڈی میں کوئی چیز اُبل رہی تھی۔ جلدی میں اس نے کریدنی اس زور سے کھینچی کہ کھڑکی چوکھٹ سے اُتر گئی۔ اس کے شیشے ٹوٹ گئے اور ہانڈی الٹ کر ٹوٹ گئی۔ بڈھا غصّے سے بلبلا اٹھا اور زمین پر گر کر بلک بلک کر رونے لگا:

"ہائے اللہ، اب میں کیا کروں"!

اس کے باہر جاتے ہی میں نے چھرے سے کریدنی کی موٹھ کاٹ دی۔ مگر جب نانا نے میری کارگزاری ملاحظہ فرمائی تو بگڑ کر کہا:

"ابے شیطان کے بچّے! اسے آری سے کاٹنا تھا۔ ارے ہم اس لکڑی کے بیلن بنا کر بیچ سکتے تھے!۔ نالائق، گدھے"!

پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ کمرے سے چلا گیا اور امّاں نے مجھے نصیحت کی: "تمھیں ان کے معاملوں میں دخل دینے کی ضرورت کیا"!

اگست کے مہینے میں کسی اتوار کی دوپہر کو اس کا دم نکلا۔ میرا سوتیلا باپ ایک نئی ملازمت حاصل کر کے حال ہی میں اپنے سفر سے لوٹا تھا۔ نانا، نکولائی کو اس کے فلیٹ میں لے گیا تھا جو اسٹیشن کے قریب واقع تھا۔ چند روز میں اماں بھی وہاں پہنچائی جانے والی تھی۔

اتوار کی صبح کو اس نے دھیمی مگر ایسی ہلکی اور صاف آواز میں جو کچھ عرصے سے میں نے نہیں سنی تھی، کہا:

"اپنے ابا کے ہاں دوڑے جاؤ اور انھیں یہاں بلا لاؤ۔"

دیوار کا ٹیکا لگا کر وہ بولی۔ "فوراً دوڑے جاؤ۔"

مجھے ایسا لگا کہ وہ مسکرا رہی ہے اور اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے جگمگا رہی ہیں۔

میرا سوتیلا باپ گرجا گھر میں تھا۔ ادھر نانی نے مجھے ناس لانے کے لیے بھیج دیا۔ ناس تیار نہ تھی۔ اس لیے دوکاندار نے مجھے ٹھہرنے کو کہا۔

اس کے بعد جب میں گھر لوٹا تو اماں سجی بنی کنگھی چوٹی کیے کرسی پر بیٹھی تھی اور پہلے کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھی۔

ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا: "اب آپ کی طبیعت کچھ بہتر ہے؟"

مجھے گھور کر اس نے کہا:

"یہاں تو آ نا! تو اب تک کہاں تھا؟ ایں؟"

جواب سننے سے پہلے اس نے میرے بال پکڑ لیے اور ایک لمبی سی لپلپاتی ہوئی چھری کئی بار ہوا میں گھما کر اس کے موٹھ سے مجھے مارا۔ چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

"اِسے اٹھا کر مجھے دینا تو سہی۔"

چھری اٹھا کر میں نے میز پر پھینک دی اور امّاں نے مجھے دھکیل دیا۔ تندور پر بیٹھ کر میں سہمی ہوئی چِتونوں سے اس کی حرکتوں کو دیکھنے لگا۔

کرسی سے اٹھ کر وہ اپنے پلنگ پر جا لیٹی اور رومال سے منہ کا پسینہ پونچھنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دو مرتبہ اس کے ہاتھ منہ کی بجائے تکیہ سے جا لگے۔

"ایک گھونٹ پانی۔"

جب میں کٹورے میں پانی لایا تو بمشکل سر اٹھا کر اس نے زرا سا پانی پیا۔ پھر اپنے سرد ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو دھکیل کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اس کونے کی طرف آنکھ پھیر کر جہاں شہ نشین تھا، اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ہونٹوں کو ایسی جنبش دی گویا مسکرا رہی ہو۔ پھر اس کی لمبی لمبی پلکوں نے آہستہ آہستہ آنکھوں کو ڈھنک لیا۔ اس کی کہنیاں پسلیوں سے بھڑی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ جن کی انگلیاں تڑپ رہی تھیں، سینے سے اُٹھ کر گلے کی طرف گئے۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا گزرا اور اس کی رنگت کو زردی دے کر اعضا میں ایک اُبھار سا پیدا کر گیا۔ اس کا منہ یوں کھلا ہُوا تھا گویا وہ محویت کے عالم میں ہو لیکن اس کی سانس نہ سنائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں میں کب تک بُت بنا ہاتھ میں گلاس لیے اپنی ماں کے پاس کھڑا رہا۔

جب نانا کمرے میں داخل ہوا تو میں نے کہا:

"امّاں مر گئیں"

پلنگ کی طرف دیکھ کر وہ بولا: "چپ رہ بے گپّی"!۔ تندور کے پاس جا کر وہ زور زور سے ہانڈی میں ڈوئی چلانے لگا۔

مجھے امّاں کی موت کا یقین تھا اور میں انتظار کرنے لگا کہ کب نانا کو اس سانحہ کا علم ہوتا ہے۔

میرا سوتیلا باپ جہازیوں کے لباس میں اندر آیا۔ آہستہ سے ایک کرسی اٹھا کر وہ امّاں کے پلنگ کے قریب لے گیا۔ یک بیک کرسی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ گلا پھاڑ کر چلّا اُٹھا:

"ارے وہ تو مر گئی —— دیکھو!"

نانا پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ کر ڈوئی لیے ہوئے تندور سے ہٹ گیا اور اندھوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلا گیا۔

---

امّاں کی تجہیز و تکفین کے چند روز بعد نانا نے کہا:

"میاں الکسی، اب میں تمھارا بار نہیں اٹھا سکتا۔ میرے گھر میں تمھارے لیے جگہ نہیں۔ دنیا میں جاؤ اور اپنی راہ تلاش کرو۔"

اسی دن میں دنیا میں اپنی راہ ڈھونڈنے نکل گیا ——

---

تمام شد